قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2026 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:8، اگست 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : نہاں

معاون مدیر : ڈاکٹر فیضان الحق

معاونین : ڈاکٹر وسیم اقبال، محمد اکرام، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس

B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ : اختر حسین

ڈیزائننگ : محمد زید

قیمت -/25 روپے، سالانہ -/240 روپے

صفحات: 100 Total Pages

- قلمکاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 011-35151992 | شعبہ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

ای-میل

editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746،

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات — مدیر — 4

خطوط

- آپ کی بات — قارئین — 5

زبان و تعلیم

- اردو زبان اور شاعری کے تہذیبی روابط — معاذ احمد — 7
- قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور زبان کی تعلیم — امتیاز احمد — 11

- اردو زبان ماضی حال اور مستقبل — پروانہ برہان پوری — 14

چراغ یوم آزادی

- اردو صحافت کا معمار اوّل مولوی محمد باقر دہلوی — عبدالعزیز عرفان — 17
- عظیم مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی — معصوم مرادآبادی — 19
- تحریک آزادی کا ایک علمی، ادبی اور صحافتی مرکز — محمد شاہد خان — 23
- تحریک آزادی میں مسلم خواتین کی فکری تشکیل اور مہاتما گاندھی — طوبیٰ ادریس — 28

شخصیات

- پنڈت دینا ناتھ مدن مغز دہلوی کی ادبی خدمات — محمد سلیم پلسارکٹ — 33
- ادھومہاجن بسمل کا شاعرانہ اختصاص — شیخ عمران — 37

- کلیم عاجز کی غزل گوئی روایت اور اسلوب — محمد ناصر حسین — 40

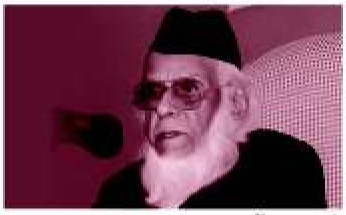

- ڈاکٹر موہن سنگھ اوبرائے دیوانہ کی شعری کائنات — خلیق الرحمن اعوان — 43
- قطب اللہ ندوی کی افسانہ نگاری — ایس ایم حسینی — 46

ادب: زاویے اور جہات

- اردو ناول تنقید کے ابتدائی نقوش — اعجاز حسین شاہ — 49
- امیر خسرو: قوالی اور قومی یکجہتی کے علمبردار — آمینہ بیگم — 53
- کلام غالب میں لفظ 'ناخن' کی انفرادیت — غزالہ فاطمہ — 57
- ادب میں سائنسی تصورات کی پیش کش — سیدہ نازیہ فاطمہ — 59
- مثنویات شوق کی تحقیق و تدوین اور رشید حسن خاں — فرحین شکیل — 62

اردو کی بستیاں

- سائنسی ادب کے فروغ میں اورنگ آباد کا کردار — رفیع الدین ناصر — 67
- فروغ اردو میں مشائخ الہ آباد کا کردار — طالب اکرام — 71

کتابوں کی دنیا

- تبصرہ و تعارف — ادارہ — 76

جہان آگہی

- خبرنامہ — ادارہ — 83

ہماری بات

معزز قارئین!

15 اگست 2026 کو ہندوستان کی آزادی کے 79 سال مکمل ہو رہے ہیں۔ آزادی کا یہ 79 سالہ سفر ہندوستان کی مسلسل جدو جہد، ترقی اور تمام تر شعبوں میں ارتقا کی لازوال کہانی پیش کرتا ہے۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں نے اپنی جان و مال کی پروا کیے بغیر اس ملک کی حفاظت کی اور دشمنوں کو یہاں سے باہر نکلنے پر مجبور کیا۔ 15 اگست 1947 اس ملک کی تاریخی، سیاسی و سماجی تبدیلی کا سنہرا باب ہے۔ یہ محض ایک تاریخ نہیں بلکہ صدیوں کی جدو جہد کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان کو ایک آزاد اور خود مختار ملک کا درجہ دلانے والے ہیروز کی لمبی فہرست ہے۔ اس کا آغاز 1857 سے ہی ہو جاتا ہے۔ جن میں بہادر شاہ ظفر، رانی لکشمی بائی، تاتیا ٹوپے، علامہ فضل حق خیر آبادی اور منگل پانڈے وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان ہیروز نے ہندوستانی عوام کو آزادی کے حصول کے لیے بیدار کیا اور ان میں ایسی آگ روشن کی جو آگے چل کر ملک دشمنوں کے نشیمن کو خاکستر کرنے کا ذریعہ بنی۔ ایسے جانبازوں میں مہاتما گاندھی، نیتاجی سبھاش چندر بوس، سردار بھگت سنگھ، پنڈت جواہر لعل نہرو، لالہ لاجپت رائے، سردار ولبھ بھائی پٹیل، چندر شیکھر آزاد، ویر ساورکر اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان جیالوں نے ہندوستان کی آزادی کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور وطن کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ ہندوستان کی آزادی میں جس طرح مختلف طبقات اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے حصہ لیا اسی طرح علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں بھی آزادی کے لیے فکری تشکیل کی لاجواب کوششیں کی گئیں۔ دیگر شعبوں کی طرح زبان و ادب میں بھی ایسی نگارشات سامنے آئیں جن سے عوام بیدار ہوئی۔

ہندوستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں متعدد زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اردو زبان جو خالص ہندوستان کی پیداوار اور ہندوستانی تہذیب کی نمائندہ ہے اس نے صحافت اور ادب کے ذریعے انگریزوں سے لوہا لیا اور ہندوستان کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو صحافت کے ذریعہ تمام اہم پیغامات عوام تک پہنچائے گئے۔ نتیجے میں اسے انگریز حکومت کی سنسر شپ اور سخت پابندیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹی اور مولوی محمد باقر کی شکل میں اردو صحافت نے پہلی قربانی پیش کی۔ یہ وہ عظیم واقعہ ہے جو اردو صحافت کی بے لوث خدمت کا نشان بن گیا ہے۔ دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار، جام جہاں نما، طلسم لکھنؤ، سحر سامری، عمدۃ الاخبار، سراج الاخبار، مدینہ، ہفت روزہ ریاست اور پیام آزادی جیسے اخبارات جنگ آزادی میں اردو صحافت کے کردار کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان اخبارات کی زبان عوام کی زبان تھی۔ ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تھا اور جو خبر ان میں شائع ہوتی تھی وہ پورے ملک میں پھیل جاتی تھی۔ اردو کے عظیم صحافیوں میں مولوی محمد باقر کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولوی مجید حسن، ساگر چند مہاجن گورکھا، پنڈت میلا رام وفا، لالہ دیش بندھو گپتا اور سردار دیوان سنگھ مفتوں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی تحریروں کے ذریعہ وطن دوستی، اتحاد، مشترکہ تہذیب اور جذبہ آزادی کو فروغ دیا۔ مالی منفعت کے بجائے وطن کو انگریزوں سے آزاد کرانے کا مقصد پیش نظر رکھا اور بالآخر کامیابی حاصل کی۔

اردو صحافت کی طرح اردو شعر و ادب کے ذریعہ بھی وطن دوستی اور انسانیت کے پیغام کو عام کیا گیا۔ اردو نے اپنے گیتوں، کہانیوں اور نظموں کے ذریعہ عوام کے دلوں کو چھو لیا اور عوام اس کی شیرینی سے متاثر ہو کر آزادی کے گیت گانے لگے۔ جیل میں چکی کی مشقت برداشت کرتے ہوئے انقلاب زندہ باد کا نعرہ دینے والے مولانا حسرت موہانی کی زبان سے نکلا یہ شعر کون بھول سکتا ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی — اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اردو زبان میں آزادی کے گیت گانے اور وطن دوستی کا پیغام عام کرنے والے شعرا و ادبا کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان میں مخدوم محی الدین، فراق گورکھپوری، برج نرائن چکبست، سرور جہان آبادی، ساحر لدھیانوی، ندا فاضلی، بسمل الٰہ آبادی، معین احسن جذبی، منشی پریم چند اور قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ یوم آزادی کے اس سنہری موقعے پر ماہنامہ اردو دنیا کے زیر نظر شمارے میں 'چراغ یوم آزادی' کے عنوان سے ایک خاص گوشہ شامل کیا جا رہا ہے، امید ہے قارئین اسے پسند فرمائیں گے اور وطن دوستی و قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کی لازوال خدمات کو یاد کریں گے۔

شمس اقبال

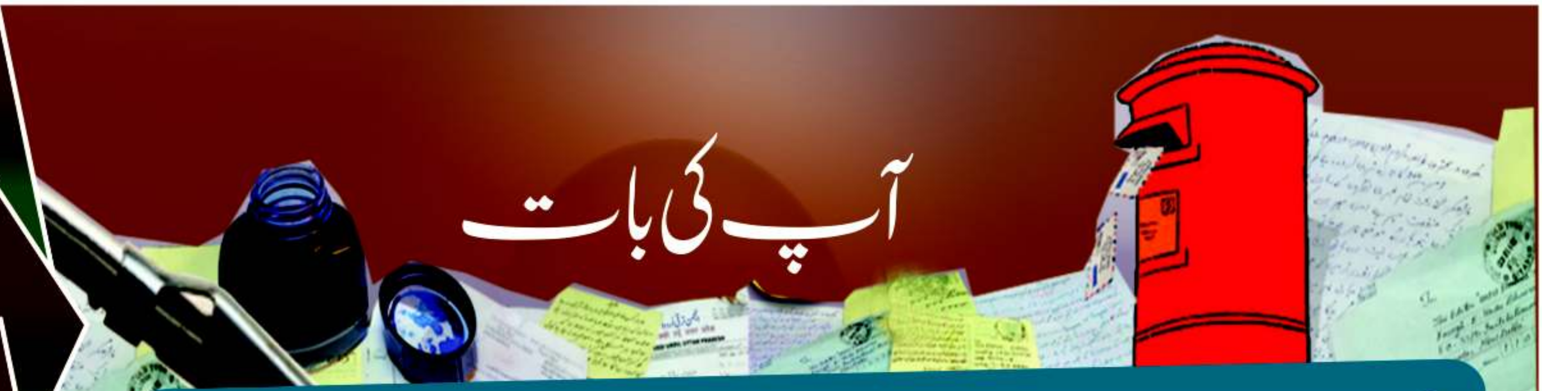

آپ کی بات

ماہنامہ'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلمکاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی و علمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ'اردو دنیا' جولائی 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ شمارہ پریم چند کے 146 ویں جنم دن کے لحاظ سے 'گوشۂ پریم چند' سے مزین ہے۔ اس گوشے میں شامل مضامین نے پریم چند کے تخلیقی افکار و جذبوں کی دنیا میں غواصی اور متنوع اور نئے معانی کی جستجو نے اسے اہم اور موثر بنا دیا ہے۔ ان کی قرأت سے تازگی کا احساس جاں گزیں ہے۔ اس تعلق سے 'ہماری بات' کے زیرعنوان شمس اقبال بجا طور پر رقمطراز ہیں:

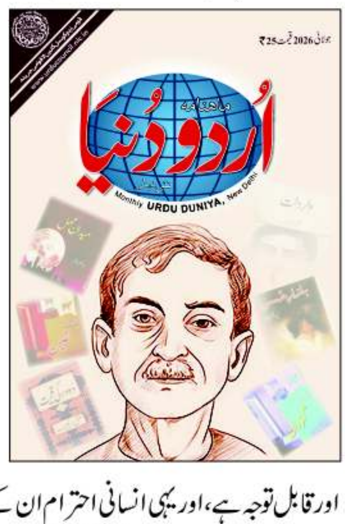

"...انھوں نے (پریم چند نے) ادب کو طلسم و حیرت کی دنیا سے نکال کر عام انسان کی زندگی سے ہم آہنگ کیا... ان کے یہاں انسان اپنی تمام تر محرومیوں کے باوجود قابل احترام اور قابل توجہ ہے، اور یہی انسانی احترام ان کے فکری نظام کی بنیاد ہے۔

مذکورہ اقتباس پریم چند کی تخلیقی فکر کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور اس گوشہ میں شامل مضامین بھی اس نکتہ کی گواہی دیتے ہیں۔

قدوس جاوید کا مضمون 'نامور سنگھ اور ہندوستانی ادب کا پرامیتھیوس: پریم چند' قاری کو پریم چند کی پوری تخلیقی کائنات کا تار و پود بن کر مختلف اکناف میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ پریم چند نے اردو فکشن میں حیات کی سخت جانی کی جو متحرک تصویر پیش کی ہے، ان کا اظہار موثر ڈھنگ سے ہوا ہے۔ یہ مضمون پریم چند کے فنی ابعاد دریافت کرنے کی مستحسن کوشش ہے۔

مضمون 'دور حاضر میں پریم چند کی معنویت و افادیت' میں صغیر افراہیم نے اپنے مطالعہ کے ثمرات کو بڑی خوبی کے ساتھ پریم چند کی تنقید میں استعمال کیا ہے، چنانچہ انھوں نے پریم چند کے جہانِ خلق کے طواف میں متعدد قلمکاروں کے حوالوں سے اپنے نقطۂ نظر کو استحکام بخشا ہے، ان کے خیال میں پریم چند کی حیثیت ایک ایسے نقیب کی ابھرتی ہے جو کشش جہت آزادی، خوشحالی، یکجہتی اور مساوات کا متلاشی رہا ہے۔

شہزاد انجم نے اپنے مضمون 'پریم چند قلم کا سپاہی: چند مباحث' کی بنیاد امرت رائے کی تصنیف 'پریم چند: قلم کا سپاہی' جسے اردو میں حکم چند نیر نے عکس ریز کیا ہے، پر رکھی ہے۔ شہزاد انجم کے مطابق اس کتاب میں پریم چند کی سوانح کی جھلکیاں بھی دکھتی ہیں، ان کی زندگی پر مشتمل ناول کا گمان بھی ہوتا ہے اور یہ ان کے عہد کی ادبی، سماجی، تہذیبی اور فکری دستاویز بھی ہے۔

شہزاد انجم نے اس کتاب کا اثر انگیز تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، جس نے ان کی فکر کے مختلف پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ شہزاد انجم کا یہ مضمون دلچسپ حقائق بھی واضح کرتا ہے اور اپنی انفرادی شان کا اظہار بھی کرتا ہے۔

ارشاد نیازی کا مضمون 'کفن کی ایک اور قرأت'، محمد انعام الحق کا مضمون 'پریم چند کی حقیقت نگاری 'کفن' اور 'پوس کی رات کے حوالے سے' اور عافیہ حمید کا مضمون 'پریم چند کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کی احتجاجی آوازیں'، پریم چند کے متعلقہ افسانوں کے مرکزی نکتہ اور اس کے اظہار کی وسعتوں کی توضیح کی کامیاب کوششیں ہیں جنھیں مضمون نگاروں کی بوقلمونی نے پرکشش بنا دیا ہے۔

پریم چند کی تحریروں کی شمولیت نے اس گوشہ کو جاذب توجہ بنا دیا ہے۔

گوشہ پریم چند کے علاوہ بقیہ تحریریں بھی معلوماتی ہیں، ان کے مطالعے سے علم و آگہی میں ضرور اضافہ ہوگا۔

عشرت ظہیر، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی

ماہنامہ'اردو دنیا' جولائی 2026 کا شمارہ نظر نواز ہوا، صفحات کی عمدگی کے ساتھ سرورق کی دیدہ زیبی نے پہلی ہی نظر میں متاثر کیا۔ اداریہ پریم چند سے متعلق ہے، جس میں ان کے فن کے امتیازات اور فکر کی جہات کو متنوع انداز میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے ساتھ ہی عصر حاضر میں پریم چند کی کیا معنویت ہے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں تک رسالے کے مشتملات کا تعلق ہے تمام مشتملات معنویت سے پر ہیں تاہم اس کے دو حصے بہت ہی اہم معلوم ہوئے، ایک گوشہ پریم چند دوسرا اخراج عقیدت۔ گوشہ پریم چند میں چھ مضامین پریم چند کے فکشن اور ان کے افکار و نظریات کے ابعاد سے متعلق ہیں، جن میں جزئیہ نگاری کے ساتھ بعض نئے

پہلوؤں کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً 'کفن کی ایک اور قرات' میں مضمون نگار ارشاد نیازی نے کفن کے دو کردار (گھیسو اور مادھو) کو نظریہ 'احساس بے گانگی' کے سیاق میں دیکھنے کی جستجو کی ہے اور پھر پورے پس منظر سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بعض دفعہ سماج کے شدید ترین حالات ہی غربت کی کیفیات کو احساس بے گانگی میں مبدل کرتے ہیں جس کے نتیجے میں گھیسو اور مادھو جیسے کردار سامنے آتے ہیں، مضمون نگار نے اس نظریہ کی روشنی میں 'کفن' کی بہترین تفہیم پیش کی ہے، جس میں لفظ 'جدت' کی کارفرمائی نظر آتی ہے، اسی طرح 'نامور سنگھ اور ہندوستانی ادب کا پرامیتھیوس: پریم چند' بھی عمدہ مضمون ہے، جس کی قرات بالکل نئے طریقے سے ہوتی محسوس ہوتی ہے، اس گوشے کے دیگر مضامین بالخصوص شہزاد انجم کا مضمون 'پریم چند قلم کا سپاہی: چند مباحث' بہترین مضمون ہے جس میں پریم چند کی زندگی کے بعض مخفی گوشے بھی نمودار ہوتے نظر آتے ہیں، گوشہ کی سب سے خاص بات پریم چند کی تحریریں ہیں، جن میں 'سورداس' اور 'بھوشن' جیسے مضامین شاعری کے تعلق سے پریم چند کے تنقیدی شعوری اور فن پر گرفت کا پتہ دیتے ہیں، یہ مضامین اس لیے بھی اہم ہیں کہ بالعموم پریم چند کی شناخت ایک فکشن نگار کی ہے، اس لیے قارئین بیشتر ان کو اسی دائرے میں محصور کر دیتے ہیں اور ذہن کا یکجہتی زاویہ سامنے آتا ہے ایسے میں یہ دونوں مضامین پریم چند کو اپنے خاص فریم سے نکال کر کسی اور فریم میں داخل کرتے ہیں اور ذہن کے زاویے کو مزید جہتوں کی طرف منتقل کرتے نظر آتے ہیں۔ خراج عقیدت میں بشیر بدر، شاہد حسین، فیروز دہلوی اور فاروق سید پر بالترتیب احمد نثار، شفیع ایوب، شعیب رضا فاطمی اور فیروز بخت احمد کے مضامین شامل ہیں جو مرحوم شخصیات کے شخصی، علمی، ادبی اور سماجی زاویوں کو دائرہ بحث میں لیتے ہیں۔

مجموعی طور پر رسالہ 'اردو دنیا' جولائی 2026 اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ حد درجہ قابل استفادہ ہے جس کے لیے مدیر مکرم اور ان کی ادارتی ٹیم کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد۔

دیان ذاکر، کولا، پورنیہ (بہار)

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ کور پیج پر یوگ سے متعلق تصویر سے اس کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یوگا ڈے صرف ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں 21 جون کو منایا جانے لگا ہے۔ اس کے ذریعے چھوٹی موٹی بیماریوں سے خود بخود بچا جاسکتا ہے۔ یوگا کی افادیت کے پیش نظر گوشے کے علاوہ اداریہ بھی یوگا کو فوکس کرتا ہے۔ مدیر ڈاکٹر شمس اقبال اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ ''اس دن کے انعقاد کا بنیادی مقصد پوری دنیا میں صحت مند اور متوازن زندگی کے شعور کو فروغ دینا ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 2014 میں 21 جون کو عالمی یوم یوگا کے طور پر تسلیم کیا، جس کے بعد یہ دن عالمی سطح پر ایک اہم ثقافتی اور صحت بخش تحریک بن کر ابھرا۔ 21 جون کا انتخاب بھی علامتی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ سال کا طویل ترین دن ہوتا ہے اور قدیم روایتوں میں اسے روحانی توانائی اور توازن سے جوڑا جاتا رہا ہے۔ آج دنیا کے تقریباً ہر خطے میں یوگا کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ پارکوں، میدانوں، تعلیمی اداروں اور عوامی مقامات پر اجتماعی یوگا کی مشقیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ روایت اب کسی خاص خطے یا قوم تک محدود نہیں رہی۔''

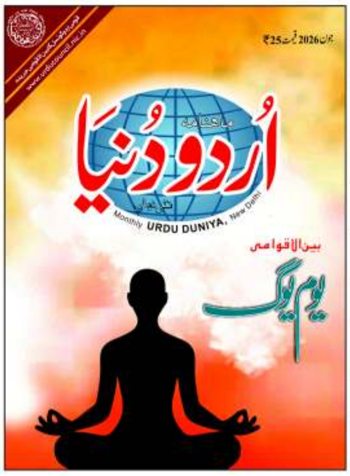

اداریے کے علاوہ 'بین الاقوامی یوم یوگ' کے نام سے ایک گوشہ بھی شامل ہے، جس میں یوگا: تاریخی، تہذیبی اور فکری منظر نامہ (محمد معین الدین)، شیخ محمد غوث گوالیاری کا تصور یوگ (محمد منہاج الدین)، ہندوستان اور مغرب کا تصور یوگ (راکیش کمار)، جسمانی صحت اور فلسفۂ یوگ (اسعداللہ)، یوگا: موجودہ عہد کی ایک ضرورت (محمد طلحہ) اور یوگا کی عصری معنویت (عبدالحفیظ فاروقی علیگ) کے مضامین شامل ہیں۔ محمد معین الدین نے اپنے مضمون میں یوگا کے تاریخی، تہذیبی اور فکری منظر نامے کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یوگا کی معنویت اور فکری جہات کو سمجھنے کے ساتھ اس کے لفظی پس منظر پر بھی گفتگو کی ہے۔ محمد منہاج الدین نے اپنے مضمون میں شیخ محمد غوث گوالیاری کے تصور یوگ (بحرالحیات کے تناظر میں) پر گفتگو کی ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے بہت اچھی گفتگو کی ہے۔ راکیش کمار نے اپنے مضمون ہندوستان اور مغرب کے تصور یوگ پر گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی دونوں کے فکریات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اسعداللہ نے اپنے مضمون جسمانی صحت اور فلسفۂ یوگ میں یوگ کے فلسفہ اور یوگ کے انسانی جسم پر پڑنے والے اثرات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ محمد طلحہ نے اپنے مضمون میں یوگ کو موجودہ عہد کی ایک ضرورت بتایا ہے۔ یوگ اب ہمارے لیے کیوں ضروری ہے، اس پر بالاستیعاب گفتگو کی ہے۔ عبدالحفیظ فاروقی علیگ نے 'یوگا کی عصری معنویت' کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں ابتدائی اور تدریجی مراحل کا بھی ذکر کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ گوشہ اس شمارے کا مغز ہے۔

گوشے کے علاوہ اس شمارے میں 'زبان و تعلیم' کے تحت اس سمندر میں بہت لعل و گہر (غضنفر)، این ای پی 2020: تعلیم اور خواتین کی بااختیاری (سید مبین زہرا)، ڈیجیٹل عہد میں اردو زبان و ادب کی تشکیل (ندیم احمد)، علم بلاغت کے تحت (استعارہ: طرفین اور وجہ جامع (حکیم نجم الغنی خاں نجمی)، ادب: زاویے اور جہات کے تحت معاصر شاعرات کی تخلیقات میں نسائی حسیت (شبنم حمید)، غالب بحیثیت رباعی گو (ساجد ذکی فہمی)، تہذیب و ثقافت کے تحت ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور اردو ادب (محمد علی جوہر)، 'ہوٗ قبیلے کا لسانی اور تہذیبی جائزہ (محمد طیب)، اقتصادیات کے تحت (اکنامکس: تعارف برائے عوام (سید اطہر رضا بلگرامی)، طبیات کے تحت ہمدردانہ حیوانی تحقیق (حکیم فخر عالم) کے مضامین شامل ہیں۔ سبھی مضامین بہت اچھے اور معلوماتی ہیں۔ آخر میں کتابوں کی دنیا اور 'جہانِ آگہی' کے تحت اردو دنیا کی خبریں شامل کی گئی ہیں۔ پورا شمارہ قارئین کے لیے ایک خوبصورت گلدستہ ہے، امید ہے قارئین ضرور مستفید ہوں گے۔

ثنا خان، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو زبان اور شاعری کے تہذیبی روابط

معاذ احمد

زبان سے نہ صرف انسان کے شعور کی تربیت ہوتی ہے بلکہ تہذیب کا بھی ارتقا ہوتا ہے۔ زبان، فرد اور سماج کے درمیان رابطے کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ ہر زبان کے استعمال کرنے والوں میں ایک مخصوص ذہنی فضا ہوتی ہے جو انھیں اپنے ملک وقوم کے مخصوص رنگ سے جوڑے رکھتی ہے۔ اس لیے زبان صرف شاعری ہی نہیں بلکہ دنیا میں جتنے بھی علوم وفنون ہیں سب کے اظہار کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ انسان اپنے ارتقا کے ابتدائی دور میں اشاروں کنایوں سے کام لیتا تھا لیکن جیسے جیسے اس کے اندر زندگی کا شعور بڑھتا گیا، اس کے ذہن میں وسعت بھی پیدا ہوتی گئی۔ ضروریات زندگی کی تلاش بھی بڑھی، کائنات کو مسخر کرنے کے لیے اس نے مختلف علوم وفنون بھی ایجاد کیے۔ علوم وفنون کی یہ مختلف شکلیں بنیادی طور پر انسانی زندگی کے تنوعات ہیں جن کے ذریعے زندگی کے بھی مختلف شعبۂ حیات قائم ہوتے گئے۔ پھر یہ کہ انسانی فکر نے یہ تقسیم اپنی آسانی کے لیے کی ہے کیونکہ انسانی زندگی بے کراں تصور ہے جس کی گرفت اس کے لیے کبھی آسان نہیں رہی۔ انسان نے اس کا حل یہ نکالا کہ فکر کے ذریعے ان علوم کی کثرت کا رشتہ زندگی کی وحدت کے تصور سے قائم کر دیا۔ اس طرح اس نے اپنی ضرورت کے لحاظ سے علوم کی تقسیم کی اور زندگی کے راز کو سمجھنے کی کوشش کی۔

زبان کے معرض وجود میں آنے سے انسان کی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوا۔ اجتماعی زندگی سے پہلے گمان یہی ہے کہ وہ وحشیانہ زندگی بسر کرتا رہا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم بغیر زبان کے زندگی گزارنے والے انسان کو وحشی کہہ سکتے ہیں؟ کیونکہ اگر اس کی زندگی وحشیانہ تھی تو آج وہ ترقی کی جس منزل پر پہنچا ہے وہ اسی راستے سے گذر کر آیا ہے۔ زبان کی ایجاد اور اس کی تخلیق خود اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ جسے کوئی وحشی انسان انجام نہیں دے سکتا۔ ہماری روزمرہ کی زندگی، طرز معاشرت، ہماری وضع قطع، ہمارا ثقافتی معیار، رسم ورواج جسے ہم تہذیب کہتے ہیں، اس تہذیب کی چمک دمک میں ہم نے اس ابتدائی انسان کو بھلا دیا جو صدیوں کے مصائب برداشت کرتا ہوا اور اظہار ذات کے شدید ترین کرب سے گزر کر اکیسویں صدی تک پہنچا ہے۔ جہاں پہنچ کر اس نے زبان کو اپنی فکر کا وسیلہ بنایا۔

زبان کے ارتقائی عمل میں اگر لسانیاتی مفروضوں پر نگاہ ڈالی جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زبان جن علامتوں سے معرض وجود میں آئی وہ محض (Gestalten) تھیں۔ یعنی ایک شکل یا نمونے کے طور پر جو انسان کے حواس میں پیدائشی طور پر موجود ہوتا ہے۔ گویا اس گروہ کا یہ خیال ہے کہ ابتدائی انسان میں خوشی اور غم کے مواقع کی ترسیل کے لیے فطری رجحان زبان کے اولین مظاہر تھے۔ اس طرح زبان کا ظہور ایک ایسے معاشرے کا پروردہ نظر آتا ہے جس میں علامتی تفکر کی معمولی صورتیں ترقی کر چکی تھیں۔ پھر آگے چل کر اس سماج اور معاشرے میں اظہار کی سرگرمیاں مثلاً راگ رنگ، ناچ، کھیل کود وغیرہ کا رواج بڑھا ہوگا۔ ان قیاسی باتوں سے قطع نظر زبان اپنے ارتقائی مدارج سے گزر کر آج ایک رسمی معنویت تک پہنچ چکی ہے۔ اپنے دائرۂ مضامین کے وسیع تناظر میں زبان ایک پوری تہذیب کا احاطہ کرتی ہے۔ جس طرح زندگی ایک بے کنار تصور ہے۔ اور ہر شے کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت سے متصف ہوتی ہے۔ اسی طرح زبان بھی فکر وعمل کے ہر سلسلے کو اپنے مخصوص مزاج میں ڈھالتی چلی جاتی ہے۔

جہاں تک شاعری کی زبان کا تعلق ہے تو وہ اپنی مخصوص لفظیات اور طریق استعمال میں عام بول چال کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح جب ہم قدیم شاعری اور اس کے کلاسیکی اجزا کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں بھی ہمیں قدیم شعری لوازمات اور جدید شعری لفظیات میں ایک تفریق کی صورت نظر آتی ہے۔ شاعری فی نفسہ انسان کے جذبات واحساسات کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ شاعری، مواد، ہیئت، موضوع اور صورت کے متوازن امتزاج کا نام ہے اور یہی اس کے بنیادی عناصر ہیں۔ لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کے تحت نہ جانے کتنے اور ذیلی عناصر ہوتے ہیں جن سے خود ان عناصر کی تشکیل ہوتی ہے اس میں احساسات، جذبات اور تخیل کی آمیزش ہوتی ہے۔ شاعری کو الہامی بھی کہا گیا۔ الہامی کہنے کے پس پشت جو عوامل کارفرما تھے وہ یہی کہ شاعری اظہار کی بلیغ ترین اور موثر ترین صورتوں میں سے ایک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نثر کے مقابلے میں شعر انسان کے ذہن پر جلد اثر انداز ہوتا ہے۔ شاعری کی اپنی زبان تو ہوتی ہے لیکن کیا شاعری صرف زبان، الفاظ اور موزونیت کا نام ہے۔ شاعری زبان کے تحفظ کا کام بھی کرتی ہے۔ اس میں ہماری تہذیب سانس لیتی ہے۔ نثر میں جن خیالات وجذبات کے اظہار کے لیے ایک پورا مضمون درکار ہوتا ہے شاعری کی زبان میں وہ بسا اوقات ایک شعر میں ہی ادا ہو جاتے ہیں۔ شاعری کی اس وسعت پذیری کے تعلق سے شمیم حنفی 'اقبال اور عصر حاضر کے خرابہ' میں لکھتے ہیں:

''شاعری کے مفاہیم صرف اپنی تعبیر میں صرف ہونے والے لفظوں کے یا زبان کے پابند نہیں ہوتے۔

بحر، وزن، آہنگ واصوات، متعلقہ زبان اور متعلقہ شاعر کے مخصوص ذخیرۂ الفاظ اس کے علامتی اور استعاراتی نظام میں بھی معنی کے بہت سے مضمرات چھپے ہوتے ہیں۔‘‘[1]

گویا شاعری کی زبان صرف شاعری کی ہی زبان نہیں ہوتی ہے۔ اس میں بحر، وزن، اصوات اور متعلقہ زبان شاعری کے مخصوص ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ اس کے علامتی اور استعاراتی نظام میں بھی معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ زبان کے نقطۂ نظر سے اگر اٹھارہویں صدی کی شاعری پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو نہ صرف شاعری کی زبان کا پتہ چلتا ہے بلکہ ہماری شاعری کی پوری تہذیبی روایت بھی سامنے آتی ہے۔ کیوں کہ یہ عہد زبان اور شاعری دونوں کا تشکیلی دور تھا۔ اس عہد کی اہمیت شاعری کی زبان کے حوالے سے اس لیے بھی ہے کیونکہ اس سے پہلے ہمارے یہاں شاعری کا کوئی مکمل ضابطہ یا پیمانہ نہیں تھا جس سے شاعری یا زبان کا کوئی معیار قائم کیا جائے۔ زبان تشکیلی مراحل کے دور سے گزر رہی تھی لیکن پھر بھی ہمارے اساتذہ شعرا اپنے احساسات کو انفرادی تجربات کی روشنی میں پیش کررہے تھے۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ شاعری اس عہد میں انفرادی ضرور تھی لیکن شاعری کی آواز اجتماعی حیثیت رکھتی تھی۔ شمالی ہند میں پہلی انفرادی آواز ولی دکنی کی تھی اور ولی کی آواز میں پہلی بار فرد شاعری سے علاحدہ بھی نظر آتا ہے۔ لیکن ولی کی آواز میں بھی اجتماعی آہنگ تھا۔ ولی نے معاشرے کی قبول کردہ اقدار کی روشنی میں پورے معاشرے کو روشنی دینے والی تشبیہوں اور استعاروں سے محبوب کا پیکر سجا کر ہمارے سامنے پیش کیا۔ ولی سے پہلے بھی ہمارے یہاں معاشرہ ہی شاعری کا محور تھا۔ آبرو، ناجی، مضمون، فغاں اور حاتم سب کی شاعری معاشرے کی ہی شاعری ہے۔ غرض اس عہد میں شاعری کے اصول وضوابط، لفظیات حتی کہ خیالات تک میں فارسیت غالب تھی۔ دوسری زبانوں سے الفاظ کے اکتسابات کا عمل ریختے کی شکل میں بتدریج جاری رہا لیکن باقاعدہ اس کی کوئی صورت ابھی تک طے نہیں ہوسکی تھی۔ اس لیے جب ہم اٹھارہویں صدی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ زبان اس وقت اپنے تشکیلی مراحل سے گزر رہی تھی۔ شاعری کی لفظیات، تراکیب، استعارے، تشبیہات غرض شاعری کی جملہ اصطلاحات شکست وریخت کے عالم میں تھیں۔ ایک طرف زبان کے Formation کا عمل تھا تو دوسری طرف زبان اور شاعری دونوں کی تعمیر کا کام بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر جاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری اپنے ابتدائی دور میں کسی بندھے ٹکے ضابطے کی پابند نہیں تھی۔ آج کی ترقی یافتہ زبان کے مقابلے میں زبان وقواعد کی غلطیاں بھی اس میں مل جاتی ہیں لیکن سادگی اور خلوص کی جو تاثیر اس میں ہے اس سے بہر صورت انکار ممکن نہیں، اٹھارہویں صدی کی شاعری اور زبان کے حوالے سے محمد حسین آزاد نے ’آب حیات‘ میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

’’ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں جو کچھ سامنے آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں جو خیالات گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اینچ پیچ کے خیال دور دور کی تشبیہیں، نازک استعارے نہیں بولتے۔ اسی واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہر ایک زبان اور اس کی شاعری جب تک عالم طفولیت میں ہوتی ہے تب تک بے تکلف، عام فہم اور اکثر حسب حال ہوتی ہے۔[2]

شاعری کی زبان صرف شاعری کی ہی زبان نہیں ہوتی ہے۔اس میں بحر، وزن، اصوات اور متعلقہ زبان شاعری کے مخصوص ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ اس کے علامتی اور استعاراتی نظام میں بھی معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔

یہ اقتباس ’آب حیات‘ کے پہلے دور کی تمہید سے ماخوذ ہے۔ اس میں ولی، آبرو، مضمون، ناجی، محمد احسن احسن، مصطفی خاں یک رنگ جیسے مشاہیر شعرا شامل ہیں۔ دوسرے دور کی تمہید میں لکھتے ہیں:

’’مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے جوں کا توں ادا کردیتے ہیں۔ خیالی رنگوں کا طوطا مینا نہیں بناتے۔ ہاں طوطی وبلبل کی طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نغموں میں گٹکری، اینچ، پلٹی تان کسی گوے رے سے لے کر نہیں ڈالی۔ تم دیکھنا بے تکلف بولی اور سیدھی سادی باتوں سے جو کچھ دل میں آئے گا بے ساختہ کہہ دیں گے کہ سامنے تصویر کھڑی کردیں گے اور جب تک سننے والے سنیں گے کلیجے پکڑ کر رہ جائیں گے۔ اس کا سبب کیا؟ وہی بے ساختہ پن جس کے سادہ پن پر ہزار بانکپن قربان ہوتے ہیں۔‘‘[3]

آب حیات کا تیسرا دور جو اردو شاعری میں عہد زریں کے طور پر مشہور ہے۔ اس میں وہ باکمال شعرا ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی نہ صرف نوک پلک درست کی بلکہ زبان اور شاعری کی ہر سطح پر اپنی جودت طبع سے گہرے نقوش قائم کیے۔ ان شعرا میں، مظہر جان جاناں، سودا، میر ضاحک، میر درد، میر سوز، میر محمد تقی میر کے نام شامل ہیں۔ اس عہد میں مضامین کی بلندی، بندش کی چستی پر خاص زور صرف کیا گیا۔ محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ انھوں نے’’ اپنے قدردانوں سے فقط داد نہ لی بلکہ پرستش کرائی۔‘‘ شاعری کی زبان کی شناخت قائم کرنے میں جن شعرا کی خاص اہمیت ہے ان میں مرزا مظہر جان جاناں، سودا، میر اور خواجہ میر درد کے نام شامل ہیں۔ چوتھے دور میں جرأت، میر حسن، انشا، مصحفی تھے۔ اس عہد کی شاعری کی زبان اپنے ماقبل عہد سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ یہ تبدیلی انشا اور جرأت کے فطری میلانات کے سبب تھی۔ عشق وعاشقی کے مضامین کے ساتھ شاعری میں استہزا کی کیفیت پیدا ہوئی۔ پھر اردو شاعری کا وہ دور آتا ہے جس نے شاعری کی زبان میں خیال بندی، نازک خیالی، بلند پروازی، تعقل پسندی، تشکک پسندی، تہہ داری، بلاغت وفصاحت، استعاراتی نظام، مرکب تراکیب، ہیئت واسلوب کی نئی راہیں تلاش کیں۔ شاعری میں فکری عنصر داخل کرنے کے ساتھ شاعری کی زبان کو اوج کمال پر پہنچا دیا۔ ان شعرا میں ناسخ، خلیق، آتش، شاہ نصیر، مومن، ذوق، غالب، دبیر اور انیس کے نام سرفہرست ہیں۔ اصلاح زبان کے تعلق سے ناسخ وآتش کی اپنی حیثیت مسلم ہے تاہم یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ناسخ نے شاعری کی جو طرز اپنائی اس میں قافیہ پیمائی، رعایت لفظی اور مشکل سے مشکل قافیہ باندھنا رواج عام ٹھہرا۔ شاعری میں خارجیت کا تعلق صرف لکھنؤ کی شاعری سے نہیں ہے

بلکہ دہلی کی شاعری میں بھی خارجیت موجود ہے۔ داخلیت اور خارجیت کے خانوں میں شاعری کی تقسیم، نمایاں رویے یا رجحان کی روشنی میں تو کی جاسکتی ہے لیکن مجموعی طور پر اگر دہلی کی شاعری میں خارجیت موجود ہے تو اسی طرح لکھنؤ کی شاعری میں داخلیت بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ غرض اردو شاعری اپنے تشکیلی دور میں سادہ ضرور تھی لیکن جذبات کی تاثیر اس میں بھی تھی۔ ولی کی شاعری کے زیر اثر دہلی کی شاعری میں دکنی لفظیات کا جو چلن عام ہوا اسے شاہ حاتم نے دہلی کی زبان میں اور بہتر صورت میں ڈھال کر شاعری کی زبان میں سلاست وروانی پیدا کی۔ انشا، رنگین اور جرأت نے ریختی کے طرز کو فروغ دیا۔ اس کے ذریعے شاعری میں محاورات، عورتوں کے مخصوص الفاظ اور روز مرہ کا وہ ذخیرہ بھی سامنے آیا جو محلات اور گھر کے آنگن تک محدود تھا۔ یہ زبان شاعر کے احساسات وجذبات، افکار وخیالات، واردات وکیفیات اور اس کے ادراک وشعور سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ یہ شاعر کی جذباتی اور روحانی واردات ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے اجتماعی تجربات، نظام اقدار، تصورات اور عام انسانی رواج پذیر معتقدات کی بھی عکاس ہے۔ یوں تو شاعری کی زبان دراصل تشبیہ، استعارہ، تمثیل، ابہام، کنایہ اور علامت کی ہوتی ہے لیکن اس کی مخصوص علامتیں جمالیاتی علامتیں ہوتی ہیں۔ جمالیاتی اصطلاحوں میں استعارہ کو مرکزیت حاصل ہے۔ گویا استعارہ ایک معنی میں شعری زبان کی اساس ہے۔ استعارہ ہی سے کام لے کر تخیل زبان اور شاعری کو وجود میں لاتا ہے۔ یوں تو استعارہ زبان کے ہر طریق استعمال میں ملتا ہے لیکن شاعری کی زبان میں اس کی ایک ناگزیر حیثیت ہے۔ شاعری کی زبان میں استعارہ کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ گویا استعارہ وہ علامت ہے جس کے بغیر اگر شاعر کچھ کہنا چاہے تو نہیں کہہ سکتا ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعری کی زبان میں استعارہ کا تصور ایک جدا معنویت کو تو ذہن میں لاتا ہی ہے ساتھ ہی جمالیاتی لذت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ جو دراصل شاعر کی زبان نہیں ہوتی بلکہ شاعری کی شعریات ہوتی ہے۔ وہی دوسرے لفظوں میں شاعری کی زبان کہلاتی ہے۔

زبان انسان کا دوسرا وجود بھی کہلاتی ہے کیونکہ اس میں انسان کے ہزاروں رشتے پنہاں ہوتے ہیں۔ اور پھر شاعر اسی معاشرے کا پروردہ ایک فرد ہوتا ہے جس میں زبان کی تخلیق ہوئی ہے وہ عام انسان کے مقابلے میں زیادہ حساس اور باشعور ہوتا ہے۔ بسا اوقات بڑے بڑے مفکر اور مدبر جس نتیجے تک بڑے ہی غور وفکر اور مشاہدے کے بعد پہنچتے ہیں شاعر اپنے تخیل سے ان دنیاؤں تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہ بھلا کیسے ان ثقافتی رویوں، رجحانوں اور علامتوں سے علاحدہ رہ سکتا ہے جو اس کے عہد میں انسانی ذہن وفکر میں ایک ارتعاش پیدا کررہی ہوتی ہیں۔ شاعری بنیادی طور پر اگر کسی چیز کی محتاج ہوتی ہے تو وہ طبع شاعرانہ ہے۔ اس لیے کہ شاعری اپنی ماہیت کے لحاظ سے صرف موزونیٔ طبع کی محتاج ہوتی ہے۔ گرچہ شاعری کا ملکہ بنیادی طور پر فطری اور وہبی ہوتا ہے مگر اس احساس اور جذبے کو بھی صیقل کرنا پڑتا ہے کیوں کہ قوت اظہار کی تکمیل کے لیے فطری صلاحیت کا پختہ ہونا ضروری ہے۔ شاعر کے اندر قوت اظہار کی تحریک بیش تر صورت میں جذبے یا احساس کی شدت کے ذریعے پیدا ہوتی ہے جب کہ اس کی تکمیل اور تشکیل کے لیے بعض خارجی ذرائع بھی کام میں لانے پڑتے ہیں۔ بقول سید احتشام حسین:

> **مشترکہ زبان کی حیثیت کسی زبان کی تہذیب میں صرف اتنی ہی نہیں کہ وہ اس کے افراد کے درمیان مبادلہ خیالات اوراشتراک عمل کا ذریعہ ہے بلکہ وہ اس تہذیبی روایت کے نشرونقل کے وسیلے کے طور پر بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔**

''ہر زبان کی طرح اردو کو بھی سماجی ضروریات نے جنم دیا جس میں آہستہ آہستہ تہذیبی خیالات اور تخیلات کے لیے جگہ بنتی گئی۔'' 4

شاعری کی زبان اور تہذیبی روابط کے سلسلے میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ اردو زبان کو سماجی ضروریات نے جنم دیا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز بھی اردو زبان کی تاریخ سے ہی مشروط ہے۔ شاعر کے وجود میں جو تحریک کام کرتی ہے وہ انفرادی ہوتی ہے لیکن درحقیقت یہ خارجی حالات واسباب کا اشاریہ ہے جس کو مجموعی طور پر ہم تمدن یا دوسرے لفظوں میں ہیئت اجتماعی کہہ سکتے ہیں۔

شاعری اور تہذیب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس میں نہ جانے کتنے ہندایرانی، اور ہند المانی تہذیب کے عناصر باہم آمیز ہوگئے ہیں۔ ہیئت اور مواد پر نظر ڈالتے ہیں تو ہیئت کبھی ایک تہذیب کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے مثلاً دکن میں مثنوی، دہلی میں غزل اور مرثیہ تو باضابطہ لکھنؤ کی میراث ہی نظر آنے لگتا ہے اور تواور کبھی موضوع اور مواد بھی ایک خاص تہذیب کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ترقی پسند تحریک کو دیکھیے تو اس میں غلامی سے نجات اور آزادی کی جدوجہد کا شور نظر آتا ہے۔ تصوف کی صورت میں انسان دوستی اور ایثار نفس کی ایک خاص روحانی اور اخلاقی فضا ہماری شاعری اور تہذیبی روایت کے بعض ادوار کی شناخت بن گئی تھی۔ ایسی صورت میں گویا شاعری کا ہی صرف تہذیبی تناظر نہیں ہوتا ہے بلکہ تہذیب کا بھی ایک سماجی تناظر ہوتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں:

''اگر تہذیب اپنا کوئی سماجی تناظر رکھتی ہے یا سماج کا کوئی تہذیبی تناظر ہوتا ہے اور ان تناظرات کی تشکیل میں تاریخ، اقتصادیات، اخلاق، مذہبی، تعلیمی اور سیاسی نظامات بھی کہیں انتہائی واضح اور کہیں غیر واضح اور بہ باطن کوئی کردار انجام دیتے ہیں تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ ... ہم اسے بھی ایک بین النظام ہائے عمل مطالعے کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں۔'' 5

تہذیبی مطالعہ ایک وسیع تر طریق نقد ہے۔ گویا اس کے تہذیبی روابط اور تشکیلی امور میں تاریخ، اقتصادیات، اخلاقیات، مذہبیات اور سیاسیات، جغرافیہ، نسل، طبقہ، نظریہ، عمل اور جنسیات جیسے مسائل وموضوعات سے اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ربط ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تنقید کے بعض نظریوں کی طرح اسے بھی بین النظام ہائے عمل مطالعے کا نام دیا گیا ہے۔ اور پھر اردو تہذیب تو اپنی بنیاد کے لحاظ سے ہی مخلوط، لوچ اور مشترک اقدار کی حامل رہی ہے۔ اس کے تہذیبی روابط کی داستان ہندوستانی تہذیب کی ہزار سالہ تاریخ پر محیط ہے۔ اس کے ابتدائی اور ارتقائی مدارج کا سفر ویدک تہذیب سے ہوتا ہوا آریائی تہذیب، ہندو تہذیب یا ہندوستانی تہذیب کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اور پھر آگے چل کر بدھ ازم کا آغاز ہوتا ہے۔ بعدازاں ایک اور تہذیبی دھارا جو

اسلامی تہذیب کا ہے وہ بھی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا حصہ بنتا ہے۔ یہ تینوں تہذیبی وثقافتی روایتیں اور دھارے اس قدر آپس میں مربوط ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے ہندوستان میں قومی یکجہتی اور رواداری کی ایک پوری فضا قائم ہوئی۔ سید عابد حسین نے اپنی کتاب' قومی تہذیب کا مسئلہ' میں تہذیبی اختلاط، بین ثقافتی رویے، تہذیبی ومعاشرتی ہم آہنگی، کثرت میں وحدت اور اتحاد واتفاق کے مسائل کا معروضی تجزیہ کرنے کے بعد زبان کی تعمیر وتشکیل کا جو خاکہ پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

''مشترکہ زبان کی حیثیت کسی زبان کی تہذیب میں صرف اتنی ہی نہیں کہ وہ اس کے افراد کے درمیان مبادلہ خیالات اور اشتراک عمل کا ذریعہ ہے بلکہ وہ اس تہذیبی روایت کے نشر ونقل کے وسیلے کے طور پر بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسی طلسمی شراب ہے جس کے اندر جماعت کے مشترک احساسات، جذبات، مزاج، روایات ودستور کی روح کھینچ کر آ گئی ہے اور جس کو پی کر جماعت کے افراد ایک ہی کیف میں ڈوب جاتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کسی ملک میں صحیح معنوں میں قومی تہذیب اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سارے ملک کی زبان ایک ہوگئی ہو یا کم سے کم مقامی زبانوں کے ساتھ ایک مشترک زبان بھی پیدا ہو چکی ہے۔''[6]

اردو زبان کو ہندوستان کی 22 آئینی زبانوں میں قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے معاشرتی اور لسانی پس منظر میں کھڑی بولی، برج، اودھی، بھوجپوری، پنجابی اور دکنی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور پھر اٹھارہویں صدی کی پوری ادبی وشعری روایت جس کے ذریعے اس مخلوط زبان کا مزاج اور اس کی فکری روایت کا خاکہ مرتب ہوا۔ مذکورہ بولیوں کا ادب ہو یا پھر ہند اسلامی تہذیب کا اختلاط اور ان سب سے علیحدہ بھکتی تحریک اور تصوف کی انسان دوستی اور روحانی بنیادیں سب اردو کے تہذیبی روابط کی داستانیں ہیں۔ اردو اور اس کے تہذیبی روابط سے جس کلچر اور تہذیب کا فروغ ہوا اسے یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس میں نظریاتی یا مسلکی اختلاف، لسانی عصبیت اور فرقہ وارانہ گروہ بندی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اردو کے تہذیبی روابط میں متعدد زبانیں اور مختلف لسانی وادبی روایات اور شعریاتی سلسلے ہیں جو باہم ایک دوسرے سے مربوط بھی ہیں اور کسی قدر مختلف بھی۔ تاہم ملک وقوم کے ذہن ومزاج اور ان کی تاریخ وتہذیب سے ہی کسی قوم وملک کے ادب کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔ اس میں آفاقی اصول بھی بروئے کار لائے جاتے ہیں مگر ادب کی اختصاصی نوعیت اور شناخت اس کی مقامیت سے ہی قائم ہوتی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب' میں لکھا ہے:

''تہذیبی رشتے براہ راست اور سادہ نہیں ہوتے۔ نوعیت کے اعتبار سے تہذیبی رشتے خاصے پیچیدہ اور جدلیاتی ہوتے ہیں اور ذہن ومزاج اور تاریخ عمرانیات میں گتھے ہوئے ہوتے ہیں... فردوسی ورومی وسعدی وحافظ ہر چند کہ اپنی تہذیب کے بطن سے پیدا ہوئے۔ لیکن یہ اسی تہذیب کے معمار اور اس کے نقش گر بھی ہیں۔ بعینہ والمیکی ہوں، ویاس یا کالیداس، یہ ہندوستانی ذہن ومزاج یا تہذیب وشعریات کے پروردہ یا تشکیل کردہ بھی ہیں اور اس کے تشکیل کنندہ بھی۔ یہی معاملہ جدید ہندوستانی ادبی روایتوں اور کلچر کا بھی ہے۔ اردو ملی جلی ادبی اور تہذیبی روایتوں کے بطن سے ابھری ہے اور اپنی نقش گری خود بھی کرتی ہے۔''[7]

کوئی بھی ادبی وتہذیبی روایت سادہ نہیں ہوتی۔ پیچیدگیاں ہونے کے باوجود اس میں مختلف ادبی وتہذیبی، تاریخی وثقافتی، قومی اور بین الاقوامی دھاروں کا انضمام ہوتا ہے۔ زبان تو معاشرتی زندگی کی بنیاد پر ہی بنتی ہے اس لیے اس کا کوئی مذہب بھی نہیں ہوتا۔ اردو کے تہذیبی روابط بھی اسی ہیئت اجتماعی کے پروردہ ہیں جس پر اس زبان کی تاریخ استوار ہوئی ہے۔ تہذیبی وثقافتی روایتیں چاہے جتنی بھی غیر متوقع اور انقلاب آفریں کیوں نہ ہوں ان کے اندر صدیوں کی تہذیبی تاریخ ایک خاموش آواز کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ اردو تہذیب میں نظم ونثر کی جتنی اصناف ہیں ان میں عمومیت کے باوجود ایک مشترکہ تصور، کثرت میں وحدت اور اختصاص کا ایک عنصر بہر حال موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں اپنی مقامیت کے باوجود آفاقیت بھی نظر آتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب اردو زبان اور اس کے ادب سے بنیادی طور پر باہم آمیز ہے اس کی نظم ونثر کے ابتدائی نمونے، کتابوں کے موضوعات، تصوف، اخلاقیات، وید مقدس اور وطن عزیز کی مختلف تہذیبی ومعاشرتی بساط اپنے تہذیبی روابط کی عکاس ہیں۔ امیر خسرو، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، دکنی تہذیب کی مقامیت، محمد قلی قطب شاہ کی شاعری، ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب 'نورس' ولی دکنی کی غزلوں میں محبت کے عناصر کے ساتھ ہندوستانی زندگی کی تصویریں گنگا جمنا، کرشن، رام، سرسوتی، اور لکشمی کے نام کا بار بار آنا تہذیبی وحدت کی جانب بڑھتے ہوئے اس زبان کے قدم انہی تصورات کا اشاریہ ہیں۔ ولی، سراج سے لے کر افضل جھنجھانوی، میر تقی میر، نظیر، غالب اقبال اور فراق گورکھپوری تک سب نے اپنی اسی مشترکہ تہذیبی وراثت کی پاسداری کی ہے اور اسی ذمہ داری کو سنبھالا ہے جس پر اردو تہذیب کی بنیاد استوار ہوئی تھی۔ بقول شمیم حنفی:

''جس تہذیب کی تعمیر میں حاکم اور رعایا، صوفی سنتوں، درویشوں اور دنیاداروں نے خانقاہوں، درباروں اور بازاروں نے برابر کا حصہ لیا ہو، اس کا مجموعی مزاج یہی کچھ ہونا بھی چاہیے تھا۔''[8]

اردو کی شاعری ہو یا اس کے تہذیبی روابط دونوں کی کوئی متعین صورت نہیں ہے۔ شاعری میں جہاں قومی اور بین الاقوامی تجربات کے اثرات نظر آتے ہیں، وہیں اس کے تہذیبی روابط بھی صرف مقامی حد تک محدود نہیں ہیں۔ اس میں بھی مختلف زبانوں، تہذیبوں اور ادبی روایات کا انضمام ہوتا رہا ہے۔ اس لیے اس کی تہذیب وثقافت اور تہذیبی روابط کی کوئی مخصوص اور متعین شکل نہیں ہے۔

حواشی

1 جاوید نامہ اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ، اقبال ریویو، اپریل 2008، ص 23
2 آب حیات: محمد حسین آزاد، کتابی دنیا، دہلی، ایڈیشن، 2014 ص 83
3 ایضاً، ص 10
4 اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2016، ص 7
5 تعصّبات: عتیق اللہ، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2005 ص 50
6 قومی تہذیب کا مسئلہ، ترقی اردو بیورو، 1980، ص 5-204
7 اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب: گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2002، ص 20-19
8 اردو کلچر اور تقسیم کی وراثت: شمیم حنفی، تخلیق کار، پبلی کیشنز، دہلی، 2011، ص 44

Maaz Ahmad
H.No. 38, Lane No. 7
1st Floor Noor Nagar,
Okhla New Delhi-110025
Mob: 9911464531
Email:maaz.ahmad691@gmail.com

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور زبان کی تعلیم

امتیاز احمد

قومی تعلیمی پالیسی 2020 زبان کی تعلیم و تدریس کے لیے ایک بنیادی نظریاتی خاکہ پیش کرتی ہے جو کثیر لسانیت، ثقافتی تحفظ اور قومی یکجہتی پر مبنی وژن کی جانب حکمت آمیز پیش قدمی کا اعلامیہ معلوم ہوتا ہے۔ پالیسی زبان کی تعلیم کو روایتی یادداشت اور استحضار کے طور طریقوں سے ہٹا کر ایک جامع، تجرباتی اور ثقافت حساس تعلیم پر زور دیتی ہے اور کثیر لسانیت کو عقدہ لاینحل کے بجائے ایک تدریسی وسیلہ کے طور پر استعمال کرنے کی وکالت کرتی ہے۔ یہ زبان کو اظہار و ابلاغ سے بڑھ کر اسے ثقافتی شناخت اور علمی ترقی کا ایک بنیادی ذریعہ تصور کرتی ہے اور اس کی تعلیم و تدریس کے مناسب نظم ونسق کے لیے اسکولی نظام میں ضروری اصلاحات کی سفارشیں پیش کرتی ہے۔

پالیسی ملک کی لسانی تکثیریت کے تحفظ اور فروغ کے لیے ذریعۂ تعلیم کو سب سے اہم قرار دیتی ہے اور اس پر سنجیدگی و پابندی سے کاربند ہونے کی وکالت کرتی ہے۔ پالیسی ابتدائی مراحل تا درمیانی/وسطانوی مراحل تک گھر کی زبان/مادری زبان/مقامی زبان/علاقائی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سفارش پیش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ان زبانوں میں تعلیمی وسائل اور مواد کی تخلیق وتشکیل پر بھی زور دیتی ہے۔ پالیسی کے نقطہ 4.11 میں مرقوم ہے:

''جہاں تک ممکن ہو کم سے کم درجہ پنجم تک لیکن بہتر یہ ہوگا کہ یہ درجہ ہشتم اور اس سے آگے تک بھی ہو، ذریعۂ تعلیم گھر کی زبان/مادری زبان/مقامی زبان/علاقائی زبان ہوگی۔ اس کے بعد گھر کی زبان/مقامی زبان کو جہاں بھی ممکن ہو زبان کے طور پر پڑھایا جائے گا، عوامی اور نجی دونوں طرح کے اسکولز اس کی پابندی کریں گے۔ سائنس سمیت تمام مضامین میں اعلیٰ ترین معیار والی نصابی کتابوں کو گھر کی زبان/مادری زبان میں دستیاب کرایا جائے گا۔''

(قومی تعلیمی پالیسی 2020، نقطہ 4.11، ص 18)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پالیسی زبان کی تعلیم و تدریس کے حوالے سے نہ صرف سنجیدہ ہے بلکہ اس سے منسلک تمام سفارشات اور اقدامات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متفکر بھی ہے۔ مزید برآں اس نے نہ صرف مرکزی و ریاستی اسکولوں کو گھر کی زبان /مادری زبان /مقامی زبان / علاقائی زبان کو ابتدائی تا وسطانوی مراحل تک ذریعۂ تعلیم بنانے کا مکلف بنایا ہے بلکہ نجی اور ذاتی نوعیت کے اسکولوں کو بھی اس کی پابندی کرنے کی ہدایت دی ہے۔ مقامی اور علاقائی زبانوں کی زبوں حالی کی ایک اہم وجہ تعلیمی مواد اور نصابی کتابوں کی عدم دستیابی ہے، پالیسی نے اس حوالے سے بھی رہنما سفارش پیش کی ہے اور تعلیم و تدریس سے منسلک تمام اداروں، ماہرین اور ذمہ داران کو ان زبانوں میں اعلیٰ معیار کے تعلیمی مواد، وسائل اور کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنانے کا پابند بنایا ہے۔ ان کے علاوہ پالیسی گھر کی زبان اور اسکولی زبان کے درمیاں حائل رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے کثیر لسانیت کا نظریہ پیش کرتی ہے اور اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کے پروگرامس میں اس کو شامل کرنی کی تجویز دیتی ہے تا کہ اساتذہ تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے تدریسی عمل کو موثر بنا سکیں اور ان طلبا کے ساتھ دولسانی طریقہ کار استعمال کر سکیں جن کی گھر کی زبان ذریعہ تعلیم سے مختلف ہے۔ اساتذہ کے اس عمل سے نہ صرف زبان کی تعلیمی صورتِ حال بہتر ہوگی بلکہ طلبہ بھی گھر کی زبان/مقامی زبان کی آموزش کی طرف مائل ہوں گے اور اپنی لسانی معذوریت کو دور کر سکیں گے۔

اسکولی نظامِ تعلیم میں زبانوں کی صورتِ حال اسی شکل میں بہتر ہوگی جب انھیں تعلیم و تدریس کا باضابطہ حصہ بنایا جائے۔ طلبہ ابتدائی مراحل میں ذریعۂ تعلیم کی وجہ سے گھر کی زبان/مقامی زبان کا اکتساب کر لیتے ہیں البتہ ان مراحل کے بعد تعلیمی مواد کی کمی، لسانی پالیسی اور ملازمت کے خوف سے ان زبانوں کو بطور مضمون پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتے یا اسکول میں ان زبانوں کے انتخاب کا کوئی نظم نہیں ہوتا۔ لسانی پالیسی کی خستہ حالی کے ازالہ، آئینی دفعات، عوام، علاقوں اور یونین کے امنگوں و توقعات کی تکمیل، قومی یکجہتی کی ترویج اور کثیر لسانیت کے فروغ کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے پالیسی ریاستوں کو سہ لسانی فارمولے کے نفاذ، اساتذہ کی بحالی اور تکنیکی وسائل کے استعمال کی سفارش پیش کرتی ہے۔ اپنے اس منشا کو حقیقی شکل دینے کے لیے سہ لسانی فارمولے کا نظرِ ثانی شدہ اور زیادہ لچکدار ورژن پیش کرتی ہے اور نقطہ 4.13 میں اس کو درج ذیل الفاظ میں بیان کرتی ہے:

''بچوں کے ذریعے سیکھی جانے والی تین زبانوں کا انتخاب ریاستوں، علاقوں اور یقینی طور پر طلبہ کے خود کے اختیار میں ہوگا۔ جن میں سے کم سے کم تین میں دو

زبانیں ہندوستانی زبانیں ہوں، خاص طور پر جو طلبہ تین میں سے ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کو بدلنا چاہتے ہیں، وہ ایسا درجہ ششم یا ہفتم میں کر سکتے ہیں، لیکن ایسا کرنے کے لیے انھیں تین زبانوں میں سے کم از کم ایک ہندوستانی زبان کو ادب کی سطح پر پڑھنا ہوگا اور ثانوی درجات کے آخر تک بنیادی مہارت حاصل کر کے دکھانا ہوگا۔''

(قومی تعلیمی پالیسی2020، نقطہ 4.13، ص:18-19)

پالیسی سہ لسانی فارمولہ میں شامل تینوں زبانوں کے انتخاب کا اختیار ریاستوں، علاقوں اور طلبہ کی صواب دید پر چھوڑتی ہے اور زبانوں کے انتخاب میں کسی قسم کے تعصب، امتیاز اور جبر کی ممانعت کرتی ہے۔ البتہ زبانوں کے انتخاب میں دو مقامی زبانوں کا خیال رکھنا بنیادی شرط ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ کو درجہ ششم اور ہفتم میں اپنی منتخب کردہ ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کو تبدیل کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ تاہم یہ گنجائش ایک واضح تعلیمی ہدف سے منسلک ہے جو طلبہ کے لیے ثانوی درجات کے اختتام تک تین زبانوں میں بنیادی مہارتوں کے مظاہرہ کرنے اور ملک کی ایک زبان کو ادبی سطح پر پڑھنے کو ضروری قرار دیتی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 زبان کی تعلیمی صورتِ حال کی بہتری، لسانی طبقات کے امنگوں کی تکمیل اور طلبہ میں زبان کے تئیں مثبت رجحانات اور میلانات کی ترویج کے لیے قابلِ عمل تدابیر کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ پالیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے لے کر اس کے نصاب، تدریسی طریقۂ کار، اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی اور درس و تدریس میں ٹیکنالوجی کے انضمام جیسے عوامل میں ضروری اصلاحات اور ترمیمات کرنے کی راہ ہموار کرتی ہے اور زبان کی تعلیمی اثر پذیری، طلبہ میں لسانی دلچسپی اور تنقیدی و تخلیقی مہارتوں کی ترویج کے لیے نصابی کتابوں کے مواد میں تخفیف کرنے اور انھیں عصرِ حاضر کے تقاضوں، سماجی امنگوں اور لسانی ضرورتوں کے عین مطابق بنانے پر زور دیتی ہے اور ان میں بامعنی اصلاحات کی تجویز پیش کرتی ہے۔ پالیسی نصابی کتابوں کے مواد میں تخفیف کرنے کے حوالے سے بتاتی ہے:

''نصاب کے مواد کو ہر موضوع میں کم کر کے اس کو بے حد بنیادی چیزوں پر مرکوز کیا جائے گا تا کہ تنقیدی فکر اور جستجو، مباحثہ اور تجزیہ پر مبنی جامع تعلیم پر ضروری توجہ دی جا سکے۔ یہ نصابی مواد اب بنیادی تصورات، افکار، تجربات اور مسائل کے حل پر مرکوز ہوں گے۔ تعلیم و تعلم کا کام اب زیادہ تعاملی طریقہ سے انجام دیا جائے گا، سوال پوچھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور درجات میں باقاعدہ طور پر زیادہ پُرکشش، تخلیقی، باہمی تعاون کے ساتھ اور تحقیقاتی سرگرمیاں ہوں گی تا کہ گہرا اور زیادہ تجرباتی علم یقینی بنایا جا سکے۔''

(قومی تعلیمی پالیسی2020، نقطہ 4.5، ص16-17)

نصابی کتابوں کے مواد میں تخفیف جہاں ایک طرف طلبہ کو ذہنی طور پر پرسکون بنائے گی، انھیں زبان کے اکتساب پر آمادہ کرے گی، وہیں دوسری طرف زبان کو عصرِ حاضر کے جدید تقاضوں، مطالبات اور سماجی امنگوں سے ہم آہنگ کرے گی اور زبان کی تعلیم کے امکانات کو مزید فروغ دے گی۔ پالیسی نصابی کتابوں کے مواد میں تخفیف کے علاوہ اسے قومی تعلیمی مقاصد، سماجی مطالبات، ثقافتی روایات و اقدار اور ملازمتی مہارتوں اور استعداد کے مطابق ڈھالنے کی تاکید کرتی ہے تا کہ زبان کا تدریسی عمل زیادہ پرلطف، سرگرم، موثر اور نتیجہ خیز بن سکے اور طلبہ زبان کی آموزش و اکتساب میں پورے انہماک، تندہی اور دل بستگی کا مظاہرہ کر سکیں۔

پالیسی زبان کی تعلیم کی ترقی کے لیے نصابی کتابوں کے مواد میں تخفیف اور قومی و مقامی مواد کی شمولیت کے علاوہ اسکول کے تمام مضامین کے لیے دو لسانی نصابی کتابوں کی تخلیق اور تشکیل کی سفارش پیش کرتی ہے۔ سائنس، ریاضی، سماجی علوم، مدنیت وغیرہ کے درسی مواد کی دو زبانوں میں تشکیل و ترتیب نہ صرف زبان کے اساتذہ کو آسانیاں فراہم کرے گی بلکہ طلبہ کے تعلیمی اضطراب اور آموزشی پسماندگی کو بھی دور کرے گی اور ان میں زبان کے تئیں ایسے رجحانات اور میلانات پیدا کرے گی جن سے آئندہ نسلیں بھی متاثر ہوں گی اور زبان کی تعلیم اور آموزش پر آمادہ ہوں گی۔ پالیسی اس ضمن میں لکھتی ہے:

''ریاضی اور سائنس کے لیے اعلیٰ ترین معیار والی دو لسانی نصابی کتابوں اور درسی مواد کو تیار کرنے کی سبھی کوششیں کی جائیں گی تا کہ طلبہ دونوں مضامین پر سوچنے اور بولنے کے لیے اپنے گھر کی زبان/مادری زبان اور انگریزی زبان میں اہل ہو سکیں۔''

(قومی تعلیمی پالیسی2020، نقطہ 4.14، ص19)

قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے زبانوں کی نصابی کتابوں اور درسی مواد کی تخفیف، تشکیل اور تنظیم پر سیرِ حاصل مباحث کے علاوہ تدریسی طریقوں اور تدابیر پر بھی مبسوط روشنی ڈالی ہے۔ نیز تدریس کے روایتی طریقوں، حکمت عملیوں اور استحضاری رویوں کی جگہ جدید اختراعی، تجرباتی، انہماکی، تعاونی طریقوں اور تنقیدی، تخلیقی اور تفہیمی مہارتوں کے انضمام اور اطلاق پر زور دیا ہے۔ مزید برآں پالیسی نے زبان کی تدریس کے روایتی طریقوں کو اس کے تعلیمی انحطاط اور طلبہ کی زبان بیزاری کا اہم سبب قرار دیا ہے۔ چنانچہ پالیسی زبان کی موثر تدریس کے حوالے سے لکھتی ہے:

''موثر طریقہ پر سیکھنے کے لیے ایک وسیع نظریہ کی ضرورت ہوتی ہے جس میں مناسب نصاب، پُرکشش تدریس، پائیدار تشکیلی جائزہ اور طلبہ کا مناسب تعاون شامل ہوتا ہے۔ نصاب دلچسپ اور مربوط ہونا چاہیے اور اس میں وقتاً فوقتاً تجدید ہونی چاہیے جس سے تعلیم کی جدید ضروریات اور اس کے مطلوبہ نتائج کو حاصل کیا جا سکے۔ اعلیٰ معیار کا تدریسی علم طلبہ تک درسی مواد کی کامیاب رسائی کے لیے لازم ہے۔ تدریس کے ان طریقوں سے طلبہ کے سیکھنے کے تجربات طے ہوتے ہیں جو سیدھے طور پر سیکھنے کے نتائج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''

(قومی تعلیمی پالیسی2020، نقطہ 12.1، ص:1)

پالیسی نے زبانوں کے تعلیمی انحطاط کے سدباب اور اس کی تعلیم کو ملک کے تعلیمی مقاصد، سماجی توقعات، طلبہ کی نفسیات اور ضروریات کے مطابق موزوں، مناسب اور موثر بنانے کے لیے کئی کلیدی سفارشات پیش کی ہے۔ ان بنیادی سفارشات میں مسرت آمیز تدریس، تجرباتی آموزش، کھیل مرکوز تدریس، سرگرمی اساس تدریس، ماحصل مرکوز تدریس، کثیر لسانیاتی تدریس اور استعداد مرکوز تعلیم وغیرہ جیسے تدریسی طریقے شامل ہیں۔ پالیسی زبان کی تدریس کے طریقۂ کار کے حوالے سے لکھتی ہے:

''سبھی زبانوں کی تدریس کو اختراعی اور تجرباتی طریقوں مثلاً گیمیفیکیشن اور ایپس کے انضمام سے بہتر بنایا جائے گا۔ زبانوں کے ثقافتی پہلوؤں جیسے فلموں، تھیٹر، کہانیوں، شاعری اور موسیقی کو مختلف متعلقہ موضوعات اور حقیقی زندگی کے تجربات سے منسلک کر کے سکھایا

جائے گا۔ اس طرح زبانوں کی تدریس تجرباتی آموزش پر مبنی ہوگی۔''

(قومی تعلیمی پالیسی 2020، نقطہ 4.21، ص 23)

زبان کی تعلیم و تدریس میں جدید اور اختراعی طریقوں جیسے تجربات، کھیل اور ایپس مرکوز طریقے تدریسی عمل کو دلچسپ بنانے کے علاوہ طلبہ میں زبان کے تئیں مثبت تبدیلی بھی پیدا کریں گے۔ ان کے علاوہ تعاون و اشتراک، منصوبہ اور حل مسائل پر مبنی تدریسی تدابیر طلبہ میں باہمی احترام، اجتماعی عمل، انفرادی تفاوت کی قدر، ثقافتی اتحاد اور لسانی بیداری جیسی مہارتوں کو فروغ دیں گی۔

عصرِ حاضر کو ٹیکنالوجی کے دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں معلومات و اطلاعات کا جہانِ ناپید کنار انسان کی انگشت کی ایک جنبش سے سامنے حاضر ہوجاتا ہے۔ اب معلومات تک رسائی کے لیے لائبریری کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ بیٹھے بٹھائے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت کی برق رفتار ترقی اور زود افزا شہرت نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو اپنا اسیر بنایا ہے۔ تعلیم وتربیت کا شعبہ بھی اس کے اثرات سے متاثر ہوا ہے اور اس کے محیر العقول آلات و وسائل کے انضمام اور استعمال سے خود کو نکھارا ہے۔ پالیسی نے ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور اس کے وسیع استعمال کے پیش نظر زبان کی تعلیم و تدریس کو ٹیکنالوجی مرکوز بنانے پر زور دیا ہے۔ پالیسی ٹیکنالوجی کے انضمام اور استعمال کو طلبہ کے آموزشی طرز، تعلیمی حصولیابی اور تعلیم کے جملہ شعبوں کی بہتری کا سب سے اہم ذریعہ سمجھتی ہے اور اسے تعلیم کے تمام مراحل میں نافذ کرنے کی وکالت کرتی ہے۔ پالیسی کے نقطہ 23.3 میں ذکر ہے:

''تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو بہتر بنانے کے لیے ٹیکنالوجی کے سبھی طرح کے استعمال اور انضمام کی حمایت کی جائے گی اور انھیں اپنایا جائے گا بشرطیکہ بڑے پیمانے پر اس کو نافذ کرنے سے پہلے ان کا متعلقہ سیاق و سباق میں ٹھوس اور شفاف طریقہ سے جائزہ لیا گیا ہو۔ اسکولی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم دونوں شعبوں میں تدریس، تشخیص/جائزہ، منصوبہ بندی، انتظام و انصرام وغیرہ میں اصلاح کے لیے ٹیکنالوجی کے استعمال پر مختلف افکار ونظریات کے آزادانہ اظہار کو ایک اسٹیج فراہم کرنے کے لیے ایک خودمختار باڈی کی شکل میں قومی تعلیمی ٹیکنالوجی فورم کا قیام ہوگا۔''

(قومی تعلیمی پالیسی 2020، نقطہ 23.3، ص 78)

ٹیکنالوجی مرکوز آلات اور وسائل زبان کی تعلیم کو نئی بلندیوں پر لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دکشا (DIKSHA) جیسے پلیٹ فارم زبان کے اعلیٰ معیار کے وسائل کے لیے ایک قومی ذخیرے کے طور پر کام کرتا ہے جس سے معیاری مواد تک رسائی ممکن ہو پاتی ہے۔ ٹیکنالوجی محض ایک ترسیلی آلہ نہیں ہے بلکہ یہ ثقافتی روایات کے تحفظ، مذہبی متون/ادب کی بقا اور قومی یکجہتی کے فروغ کا ایک بنیادی محرک ہے۔ یہ زبان کے تعلیمی عمل کو پر لطف، موثر اور طلبہ کو منہمک، مستعد اور قابلِ عمل بنانے نیز ان میں لسانی ذوق اور ادبی رجحان پیدا کرنے کے علاوہ ہندوستان کی مخدوش زبانوں کے ثقافتی و ادبی سرمایوں کے تحفظ اور ہندوستانی ادارہ برائے ترجمہ نگاری و ترجمانی (IITI) کے لسانی خدمات کی تشہیر اور توسیع میں بھی اہم رول ادا کرے گا۔

زبان کی تعلیم و تدریس میں جدید اور اختراعی طریقوں جیسے تجربات، کھیل اور ایپس مرکوز طریقے تدریسی عمل کو دلچسپ بنانے کے علاوہ طلبہ میں زبان کے تئیں مثبت تبدیلی بھی پیدا کریں گے۔ ان کے علاوہ تعاون و اشتراک ، منصوبہ اور حل مسائل پر مبنی تدریسی تدابیر طلبہ میں باہمی احترام، اجتماعی عمل، انفرادی تفاوت کی قدر، ثقافتی اتحاد اور لسانی بیداری جیسی مہارتوں کو فروغ دیں گی۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی زبان کی تعلیم کے متعلق سفارشات محض تعلیمی اصلاحات کی کلید نہیں ہیں بلکہ لسانی تکثیریت، قومی یکجہتی اور ثقافتی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ پالیسی زبان کی تدریس اور آموزش کو ثقافتی سیاق سے جوڑتے ہوئے طلبہ کو لسانی، تعلیمی اور معاشی طور پر خودمختار بنانے اور انھیں اپنے مذہب، ثقافت، ملک اور سماج کی فلاح و بہبود اور خدمات کے لیے تیار کرنے پر زور دیتی ہے۔ پالیسی سفارشات کی کامیابی کا انحصار پالیسی سازوں اور منتظمین کے مشترکہ عزم، پائیدار سرمایہ کاری اور شناخت شدہ مسائل کے سدباب پر ہے۔ مقامی/علاقائی اور مادری زبان کو تعلیمی نظام کا حصہ بنانا صرف لسانی طبقات اور برادریوں کا لسانی حق نہیں ہے بلکہ طلبہ کا تعلیمی حق بھی ہے۔ زبان نسلوں کو ان کی جڑوں سے جوڑتی ہے، تعلیم و تعلم کو فطری بناتی ہے اور شناخت کو مضبوطی عطا کرتی ہے۔ پالیسی اگرچہ ایک روشن مستقبل کا راستہ دکھاتی ہے لیکن اس راستے پر کامیابی کے ساتھ چلنے کے لیے ہمیں ذہنی تیاری، سماجی تبدیلی، تعلیمی جدت اور ادارہ جاتی و تدریسی افرادی قوت وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایسے موزوں اور مؤثر تدریسی طریقے متعارف کرانا ہوں گے جو مکمل طور پر ایک زبان پر انحصار کے بجائے کثیر لسانیت کو فروغ دیتے ہوں۔ استاد ان طریقوں کے ذریعے ایک سے زائد زبانوں کو بیک وقت استعمال کر سکتا ہو، تصورات اور اصطلاحات کو مقامی زبان میں سمجھا سکتا ہو اور مختلف زبانوں میں مشق کرا سکتا ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ریاستی جامعات، تربیتی کالجز اور ادارے علاقائی زبانوں میں تدریسی مہارتوں پر مبنی خصوصی تربیت کا اہتمام کریں۔ آن لائن کورسز، تدریسی ماڈیولز اور مقامی لسانی برادریوں کی شرکت کے ذریعے نہ صرف بہتر تعلیمی مواد بنایا جا سکتا ہے بلکہ زبان کے ساتھ وابستگی کو بھی مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ والدین کی ترجیحات کو بدلنے کے لیے کہانیوں، میڈیا مہمات، کامیاب شخصیات کی مثالیں، اسکول پروگرام، ریڈیو اور کمیونٹی اجلاس وغیرہ کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ مواد کی تخلیق اور تشکیل کے لیے مصنوعی ذہانت، مشینی ترجمہ اور اوپن سورس پلیٹ فارمز وغیرہ کی مدد لی جا سکتی ہے۔ اگر ان سفارشات پر عمل کیا جائے تو ہندوستان کا لسانی تنوع ایک انتظامی مسئلہ کے بجائے اکیسویں صدی میں علم کی تخلیق کا سب سے بڑا اثاثہ بن سکتا ہے۔

ماخذ ومصادر

1 فریدی، س م ع (2020)، قومی تعلیمی پالیسی 2020، پٹنہ: شعبۂ نشر واشاعت، امارت شرعیہ، پھلواری شریف۔

2 وزارتِ تعلیم (2020)، قومی پالیسی برائے تعلیم 2020، نئی دہلی، وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند۔

■

Imtiyaz Ahmad
Department of Educational Studies
Faculty of Education, Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob.:9911752717
Email: imtiyaz7262@gmail.com

اردو زبان

ماضی حال اور مستقبل

پروانہ برہان پوری

اردو زبان کا زریں عہد محض ایک زمانی ٹکڑا نہیں بلکہ یہ اس تہذیبی نمو اور لسانی ارتقا کا نام ہے جس نے برصغیر کی ہزار ہا سالہ مشترکہ تاریخ کو ایک نیا صوتی اور معنوی آہنگ عطا کیا۔ کسی بھی زبان کے 'زریں عہد' کا تعین کرتے وقت محققین عموماً اس دور کے تخلیقی وفور، لسانی پختگی اور سماجی قبولیت کو بنیاد بناتے ہیں۔ اردو کے تناظر میں یہ بحث اس لیے بھی پیچیدہ اور دلچسپ ہے کہ یہ زبان کسی ایک جغرافیائی خطے تک محدود رہنے کے بجائے پورے برصغیر کی فکری اور جذباتی ترجمان بن کر ابھری۔ اس کے ارتقائی سفر میں دکن سے دہلی اور دہلی سے لکھنؤ تک کے جو مراحل طے ہوئے، وہ دراصل اس لسانی وحدت کی تشکیل کے مراحل تھے جسے ہم آج اردو کے نام سے جانتے ہیں۔ اردو کا ماضی اس لحاظ سے غیر معمولی ہے کہ اس نے فارسی کی علمی وجاہت، عربی کی اصطلاحاتی صلابت اور ہندوی کی لوک مٹھاس کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالا جس کی مثال لسانیات کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اردو کے زریں عہد کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب یہ زبان محض ایک 'لشکر' یا 'بازار' کی ضرورت سے نکل کر درباروں کی زینت اور علمی مباحث کا ذریعہ بنی۔ ولی دکنی کی دہلی آمد اور ان کے دیوان کی مقبولیت نے شمالی ہند کے شعرا کو یہ احساس دلایا کہ جس ریختہ کو وہ اب تک حقیر یا صرف تفنن طبع کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس میں غزل جیسی صنفِ نازک کو نبھانے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا کا عہد وہ نکتہ ہے جہاں اردو اپنے تشکیلی مراحل سے گزر کر کمالِ فن کی شاہراہ پر قدم رکھتی ہے۔ میر کی 'سہلِ ممتنع' اور سودا کے قصائد کی شکوہ نے اردو کو وہ وقار بخشا جو اب تک فارسی کا خاصہ سمجھا جاتا تھا۔ میر تقی میر نے جب یہ کہا تھا کہ 'کہوں کیا جو کچھ ہے ریختہ، کہ ہے رشکِ فارسی بستہ پا' تو یہ محض ایک شاعرانہ دعویٰ نہیں تھا بلکہ اس نئی لسانی حقیقت کا اعتراف تھا جو فارسی کے متبادل کے طور پر ابھر رہی تھی۔ اس دور کو زریں کہنے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں لسانی تعصبات کے بجائے تخلیقی تنوع کو اہمیت دی گئی، جس کے نتیجے میں اردو نے اپنی ایک ایسی لغت تیار کی جو آفاقی بھی تھی اور مقامی بھی۔

اردو ادب کا کلاسیکی دور، جس کی نمائندگی میر، سودا، درد اور بعد ازاں غالب و ذوق کرتے ہیں، دراصل اس فکری رواداری اور جمالیاتی ہم آہنگی کا عکاس ہے جو اس دور کے معاشرے کا جوہر تھی۔ غالب کا عہد اردو زبان کی تاریخ میں وہ موڑ ہے جہاں یہ زبان قرونِ وسطیٰ کے روایتی تصورات سے نکل کر جدید معروضیت اور فلسفیانہ گہرائی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ غالب نے اردو کو جو وسعتِ فکر اور ندرتِ خیال عطا کی، اس نے زبان کے دامن کو اتنا وسیع کر دیا کہ اس میں کائنات کے پیچیدہ ترین مسائل کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ غالب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اردو کے قدیم ڈھانچے کو منہدم کیے بغیر اس میں جدید معانی کی شمولیت کو ممکن بنایا۔ اسی عہد میں لکھنؤ کا دبستان اپنی تمام تر مرصع سازی اور لسانی نزاکتوں کے ساتھ سامنے آتا ہے، جہاں ناسخ اور آتش جیسے اساتذہ نے زبان کی صفائی اور تراش خراش پر توجہ دے کر اسے ایک مجلّیٰ صورت عطا کی۔ انیس و دبیر کے مراثی نے اردو کو وہ رزمیہ شکوہ اور الفاظ کا وہ ذخیرہ دیا جس نے اسے دنیا کی بڑی زبانوں کے صف میں لا کھڑا کیا۔

اردو کے اس سنہری ماضی کا ایک اہم پہلو فورٹ ولیم کالج کا قیام اور اردو نثر کی باقاعدہ تشکیل بھی ہے۔ اگرچہ دکن میں 'سب رس' جیسی کتابیں موجود تھیں، لیکن جدید اردو نثر کا وہ روپ جو ہم آج دیکھتے ہیں، اس کی آبیاری میں میر امن کی 'باغ و بہار' کا حصہ بنیادی ہے۔ میر امن نے سلیس اور بامحاورہ نثر کی جو بنیاد رکھی، اسی پر آگے چل کر سر سید احمد خان نے جدید اردو نثر کی عظیم عمارت کھڑی کی۔ سر سید اور ان کے رفقا کا عہد اردو زبان کے لیے ایک نئے 'زریں عہد' کا پیش خیمہ ثابت ہوا، جہاں زبان کو محض حسن و عشق کے افسانوں تک محدود رکھنے کے بجائے اسے قومی اصلاح، سائنسی فکر اور تاریخی شعور کا ذریعہ بنایا گیا۔ حالی، شبلی، نذیر احمد اور آزاد نے اردو ادب کو وہ تنقیدی اور تحقیقی شعور دیا جس کے بغیر کوئی بھی زبان عالمی سطح پر اپنا مقام نہیں بنا سکتی۔ مولانا الطاف حسین حالی کی 'مسدس' اور 'مقدمہ شعر و شاعری' نے اردو کی شعری اور تنقیدی روایت کو وہ نیا رخ دیا جس نے اسے مقصدیت اور حقیقت پسندی سے روشناس کرایا۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اقبال کی صورت میں اردو کو ایک ایسا مفکر شاعر میسر آیا جس نے زبان کے صوتی آہنگ کو جلال اور جمال کے نئے مرقعوں سے آراستہ کیا۔ اقبال نے اردو کو جس ہمہ گیری سے نوازا، اس نے زبان کے فکری افق کو وسعتِ لامتناہی عطا کی۔ ان کے ہاں اردو زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک عظیم تہذیبی بیداری کا استعارہ بن کر ابھری۔ اسی زمانے میں انجمنِ ترقی اردو کے زیرِ سایہ مولوی عبدالحق

نے اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے جو خدمات انجام دیں، انھوں نے اس زبان کو ایک مستحکم علمی ادارے کی شکل دے دی۔ بابائے اردو کی جدوجہد اس بات کا ثبوت تھی کہ اردو اب محض ایک عوامی بولی نہیں بلکہ ایک ایسی قومی ضرورت بن چکی ہے جس کے تحفظ پر تہذیبی بقا کا انحصار ہے۔

ترقی پسند تحریک کا ظہور اردو ادب کی تاریخ کا ایک اور اہم باب ہے جس نے اردو کو عوامی مسائل، سماجی کشمکش اور طبقاتی شعور کا ترجمان بنایا۔ پریم چند کے افسانوں سے شروع ہونے والا یہ سفر منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی طاقت بن گیا جس نے اردو کے روایتی ڈکشن کو بدل کر رکھ دیا۔ اس دور میں اردو زبان نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو جس بے باکی اور فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا، اس نے اردو ادب کو عالمی ادب کے ہم پلہ بنا دیا۔ ترقی پسندوں نے اردو کو اس کی کلاسیکی جڑوں سے کاٹے بغیر اسے معاصر زندگی کا نبض شناس بنایا۔ یہ اردو کا وہ دور تھا جب نظم میں فیض احمد فیض اور ن م راشد جیسے ناموں نے زبان کو نئی تشبیہات، استعارات اور علامات سے مالا مال کیا۔ فیض کے ہاں کلاسیکی رچاؤ اور انقلابی آہنگ کا جو امتزاج ملتا ہے، وہ اردو زبان کی لچک اور اس کی قبولیت کی صلاحیت کا بین ثبوت ہے۔

ماضی کے اس مختصر مگر جامع جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو کا زریں عہد کسی ایک واقعے یا شخصیت کا مرہونِ منت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے جس میں مختلف افکار، تہذیبوں اور اسالیب نے اپنا حصہ ڈالا۔ اردو کی سب سے بڑی خوبی اس کی وہ 'تہذیبی اشتقاقیت' ہے جس کی بنیاد پر اس نے ہر عہد کے تقاضوں کو اپنے اندر سمویا۔ فارسی کی نزاکت ہو یا انگریزی کی اصطلاحاتی ضرورت، اردو نے کبھی اپنی اصل کو نہیں کھویا بلکہ ہر نئے عنصر کو اس طرح اپنایا کہ وہ اس کے وجود کا حصہ بن گیا۔ تاریخ کے اس آئینے میں جب ہم اردو کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی زبان نظر آتی ہے جو وقت کے ہر جبر کا مقابلہ کرنے کے بعد مزید نکھر کر سامنے آئی۔ میر و غالب کا عہد ہو یا سرسید و اقبال کا دور، ہر زمانے نے اردو کو ایک نیا حسن اور ایک نئی توانائی عطا کی۔ یہ ماضی کی یہی توانائی ہے جو آج کے عہد میں اردو کے استحکام کی ضامن ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ماضی کے اس ورثے کو حال کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب رہے ہیں؟

حال کے تناظر میں جب ہم اردو کو دیکھتے ہیں تو ایک طرف اس کی وسعت اور مقبولیت کا عالمگیر منظر نامہ نظر آتا ہے اور دوسری طرف ان چیلنجز کا سامنا ہے جو عالمگیریت اور ڈیجیٹل انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ اردو آج صرف ہندوستان یا پاکستان کی زبان نہیں رہی، بلکہ یہ ایک عالمی زبان بن چکی ہے جس کے بولنے اور سمجھنے والے دنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں۔ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور جدید ابلاغی ذرائع نے اردو کی رسائی کو ان جگہوں تک پہنچا دیا ہے جہاں کبھی رسائل و جرائد کا پہنچنا دشوار تھا۔ لیکن اس پھیلاؤ کے ساتھ ہی زبان کی ساخت اور اس کے علمی معیار پر بھی سوالات اٹھنے لگے ہیں۔ موجودہ عہد میں اردو زبان ایک عجیب سی کشمکش کا شکار ہے؛ ایک طرف اسے سرکاری اور تعلیمی سطح پر اپنی بقا کی جنگ لڑنی پڑ رہی ہے اور دوسری طرف یہ عوامی سطح پر پہلے سے زیادہ متحرک اور فعال نظر آتی ہے۔ معاشی عالمگیریت نے اردو کو جس طرح متاثر کیا ہے، اس نے اردو دان طبقے کے سامنے نئے فکری اور معاشی سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔

اردو کے زریں عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ زبان کی بقا کا انحصار صرف اس کے تخلیقی ادب پر نہیں بلکہ اس کے علمی اور سائنسی سرمائے پر بھی ہوتا ہے۔ ماضی میں جامعہ عثمانیہ جیسے اداروں نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر یہ ثابت کیا تھا کہ یہ زبان جدید علوم کے بوجھ کو سنبھالنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ دارالترجمہ حیدرآباد کے کارنامے اردو کی علمی تاریخ کا وہ روشن باب ہیں جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ لیکن معاصر عہد میں اردو کے علمی اور تحقیقی کام کی رفتار وہ نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھی۔ جدید علوم کی اردو میں منتقلی اور اصطلاحات سازی کا عمل سست روی کا شکار ہے، جس کی وجہ سے اردو ایک علمی زبان کے بجائے محض ایک ادبی اور ابلاغی زبان بنتی جا رہی ہے۔ اگر ہمیں حال کو زریں بنانا ہے تو ہمیں اردو کو دوبارہ علم کی زبان بنانا ہوگا، جس کے لیے سنجیدہ علمی کاوشوں اور ادارہ جاتی تعاون کی ضرورت ہے۔

اردو کے موجودہ منظر نامے پر نگاہ ڈالتے ہی پہلا احساس اس کی ہمہ گیری کا ہوتا ہے، مگر یہ ہمہ گیری اپنے ساتھ کئی لسانی اور تہذیبی خدشات بھی لائی ہے۔ ماضی میں اردو جس 'زریں عہد' سے گزری، اس کی بنیاد روایت کا احترام اور زبان کے فطری ارتقا پر تھی۔ آج جب ہم 'حال' کی بات کرتے ہیں تو اردو ہمیں ایک ایسی دوراہے پر کھڑی نظر آتی ہے جہاں ایک طرف عالمی سطح پر اس کی مقبولیت کا گراف بلند ہو رہا ہے اور دوسری طرف اس کی علمی و ادبی اصالت (Originality) کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ عالمگیریت کے اس عہد میں زبانیں اب صرف اظہار کا ذریعہ نہیں رہیں بلکہ وہ ایک بڑی عالمی منڈی کا حصہ بن چکی ہیں۔ اردو نے اس منڈی میں اپنی جگہ تو بنالی ہے، لیکن اس کے بدلے اسے اپنے کلاسیکی ڈکشن اور قواعدی ساخت کی قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ جسے ہم آج 'ہنگلش' یا اردو اور انگریزی کے غیر فطری ملاپ کا نام دیتے ہیں، وہ دراصل اس لسانی بحران کا پیش خیمہ ہے جو مستقبل میں اردو کے چہرے کو مسخ کر سکتا ہے۔ تاہم، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو نے ہمیشہ دوسری زبانوں کے اثرات کو قبول کر کے خود کو توانا بنایا ہے، اس لیے موجودہ صورتحال کو محض مایوسی کی نظر سے دیکھنا بھی علمی دیانت کے خلاف ہوگا۔

موجودہ عہد میں اردو زبان کی بقا اور اس کے نئے 'زریں عہد' کی نوید ڈیجیٹل انقلاب میں پوشیدہ ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر تک یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی دنیا میں اردو شاید پیچھے رہ جائے گی، لیکن اردو دان طبقے اور ماہرینِ لسانیات نے اس چیلنج کو ایک موقع میں بدل دیا۔ آج اردو یونیکوڈ (Unicode) کی صورت میں انٹرنیٹ پر ایک مستحکم زبان کے طور پر موجود ہے۔ برقی کتب (E-books)، ادبی پورٹلز اور سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارمز نے اردو ادب کو لائبریریوں کی گرد آلود الماریوں سے نکال کر عام قاری کے موبائل اسکرین تک پہنچا دیا ہے۔ ریختہ (Rekhta) جیسے عالمی سطح کے پورٹلز نے نہ صرف کلاسیکی ذخیرے کو محفوظ کیا ہے بلکہ نئی نسل میں اردو شاعری اور نثر کا ذوق بھی بیدار کیا ہے۔ یہ ڈیجیٹل رسائی اردو کے لیے ایک نئی زندگی ثابت ہوئی ہے، جس نے جغرافیائی حدود کو مٹا کر دہلی، لکھنؤ، لاہور اور کراچی کے ادبی مراکز کو لندن، نیویارک اور دبئی کے اردو حلقوں سے جوڑ دیا ہے۔

لیکن اس ڈیجیٹل وسعت کے بطن سے کچھ نئے

مسائل نے بھی جنم لیا ہے۔ انٹرنیٹ پر موجود اردو مواد کی کثرت تو ہے، مگر اس کا علمی اور تحقیقی معیار وہ نہیں جو ماضی کے رسائل و جرائد کا طرہ امتیاز تھا۔ سطحی جذباتیت، غلط انتسابات اور لسانی اغلاط کی بھرمار نے اردو کے سنجیدہ ادبی وقار کو مجروح کیا ہے۔ ایک محقق کے لیے یہ لمحہ فکر یہ ہے کہ کیا ہم ٹیکنالوجی کے اس سیلاب میں اردو کے 'علمی جوہر' کو بچا پائیں گے؟ اردو کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ ہم ٹیکنالوجی کو محض تفریح کا ذریعہ بناتے ہیں یا اسے سنجیدہ علمی و سائنسی مباحث کی منتقلی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت (AI) کے اس دور میں اردو کے لیے سب سے بڑا چیلنج 'مشینی ترجمہ' اور 'ڈیٹا بیس' کی فراہمی ہے تاکہ عالمی علوم تک اردو دان طبقے کی رسائی براہِ راست ہو سکے۔ اگر ہم اردو کو آرٹیفیشل انٹیلی جنس کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو یقیناً مستقبل کا عہد اردو کا ایک نیا اور جدید زریں عہد ہوگا۔

اردو کی معاشی جہت بھی اس بحث کا ایک لازمی جزو ہے۔ ماضی میں اردو زبان کے ساتھ ایک خاص قسم کی معاشی پسماندگی منسوب کر دی گئی تھی، لیکن آج کے دور میں یہ تصور تیزی سے بدل رہا ہے۔ مواد نگاری (Writing Content)، ترجمہ نگاری، اشتہارات کی دنیا اور میڈیا انڈسٹری نے اردو دانوں کے لیے روزگار کے نئے اور وسیع دروازے کھولے ہیں۔ خاص طور پر ڈیجیٹل مارکیٹنگ میں اردو کا تخلیقی استعمال ایک بڑی ضرورت بن کر ابھرا ہے کیونکہ کمپنیاں جانتی ہیں کہ برصغیر کی کروڑوں کی آبادی تک پہنچنے کے لیے اردو سے بہتر کوئی اور پل موجود نہیں ہے۔ تاہم، اس معاشی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے نصاب کو جدید معاشی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ اگر طلبہ کو صرف ادبی تاریخ پڑھائی جائے گی اور انھیں جدید لسانی مہارتوں سے لیس نہیں کیا جائے گا، تو وہ معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اردو کی بقا اب اس کے 'صنعتی اور تجارتی' استعمال میں بھی پوشیدہ ہے۔

اردو زبان میں بین الثقافتی احترام اور رواداری کی جو روایت رہی ہے، وہ اس کے مستقبل کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اردو کبھی بھی کسی ایک مذہب یا مخصوص فرقے کی زبان نہیں رہی، بلکہ یہ برصغیر کی اس مشترکہ تہذیب کی علامت ہے جسے 'گنگا جمنی تہذیب' کہا جاتا ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند، فراق گورکھپوری اور آنند نرائن ملا جیسے نام اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ اردو نے ہمیشہ انسان دوستی اور آفاقیت کو مقدم رکھا ہے۔ آج کے منقسم سماج میں اردو کا یہ کردار مزید اہم ہو جاتا ہے کہ وہ نفرتوں کے بجائے محبتوں کی زبان بنے۔ اردو ادب میں جو صوفیانہ اور انسانیت پسندانہ رنگ موجود ہے، وہ اسے دنیا کی دیگر زبانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ مستقبل میں اردو کا عالمی کردار اس کے اسی 'تہذیبی مشن' سے جڑا ہوا ہے جو امن اور بقائے باہمی کا داعی ہے۔

اردو زبان کا سفر ایک لامتناہی سفر ہے جس میں ماضی کی عظمت، حال کی کشمکش اور مستقبل کے خواب سب یکجا ہیں۔ ہم جس زریں عہد کی تلاش میں ہیں، وہ شاید کسی گزرے ہوئے وقت کا نام نہیں بلکہ اس تخلیقی جستجو کا نام ہے جو ہمیں ہر روز ایک نئے فکری افق سے روشناس کراتی ہے۔

مستقبل کے امکانات پر غور کرتے ہوئے ہمیں اردو کے تعلیمی ڈھانچے پر بھی ازسرِ نو توجہ دینی ہوگی۔ ہندوستان میں اردو کی تدریس کے طریقے ابھی تک روایتی ہیں، جن میں جدید لسانیات کے تجربات کو شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کو محض ایک 'مقدس ورثہ' سمجھ کر میوزیم کی زینت بنانے کے بجائے اسے ایک 'زندہ اور متحرک' زبان کے طور پر برتنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو میں سائنسی، سماجی اور قانونی علوم کا ذخیرہ اس قدر وسیع ہو کہ ایک عام طالب علم کو معلومات کے لیے دوسری زبانوں کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے ایک بار کہا تھا کہ ''زبان وہی زندہ رہتی ہے جو زمانے کے بدلتے ہوئے قدموں کی چاپ کو پہچان لے''۔ اردو نے ماضی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں زمانے کے ساتھ چلنے کی بھرپور سکت ہے، اب یہ موجودہ نسل کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صلاحیت کو کس طرح بروئے کار لاتی ہے۔

اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے، بلکہ یہ امکانات کی ایک ایسی کہکشاں ہے جس کی چمک ہماری کوششوں پر منحصر ہے۔ اردو آج بھی دنیا کی چوتھی یا پانچویں بڑی زبانوں میں سے ایک ہے جسے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبہ جات کا قیام اور وہاں اردو تحقیق میں دلچسپی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ زبان عالمی سطح پر اپنی جڑیں مضبوط کر رہی ہے۔ لیکن اس بیرونی وسعت کے ساتھ اندرونی استحکام بھی ضروری ہے۔ ہمیں اردو کے 'خالص پن' کے خبط سے نکل کر اس کی 'ثمر آوری' پر توجہ دینی ہوگی۔ زبان کی خوبصورتی اس کے الفاظ کی تعداد میں نہیں بلکہ ان الفاظ کے ذریعے پیدا ہونے والے اثر اور فکر میں ہوتی ہے۔ اردو کے نئے زریں عہد کے لیے ہمیں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جہاں تخلیق کار، محقق، مترجم اور ٹیکنو کریٹ مل کر زبان کی خدمت کریں۔

نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کا سفر ایک لامتناہی سفر ہے جس میں ماضی کی عظمت، حال کی کشمکش اور مستقبل کے خواب سب یکجا ہیں۔ ہم جس زریں عہد کی تلاش میں ہیں، وہ شاید کسی گزرے ہوئے وقت کا نام نہیں بلکہ اس تخلیقی جست کا نام ہے جو ہمیں ہر روز ایک نئے فکری افق سے روشناس کراتی ہے۔ میر و غالب کی عظمت سے اقبال کی بصیرت تک اور پریم چند کے سماجی شعور سے فیض کی رومانیت تک، اردو نے ہر قدم پر ہمیں جینا سکھایا ہے۔ آج جب ہم ایک نئی صدی کے تیسرے عشرے میں قدم رکھ چکے ہیں، تو اردو ہمارے سامنے ایک چیلنج بن کر نہیں بلکہ ایک امید بن کر کھڑی ہے۔ یہ امید کہ جب تک انسان کے دل میں جذبہ باقی ہے اور جب تک فکر میں گہرائی موجود ہے، اردو کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہے گا۔ علم ہمیشہ تکمیل سے پہلے ایک سفر رہتا ہے، اور اردو کا یہ سفر بھی جاری و ساری ہے؛ اس یقین کے ساتھ کہ اس زبان کا اصل کمال ابھی سامنے آنا باقی ہے اور اس کا حقیقی زریں عہد وہ ہوگا جہاں یہ زبان انسانیت کے دکھوں کا مرہم اور روشن خیالی کا استعارہ بن کر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

■

Parwana Burhanpuri
Gazi salaar maidan, Mominpura, Burhanpur
Madhya pardesh - 450331
Mob. 8871702698
Email: navaidraza26@gmail.com

عبدالعزیز عرفان

اردو صحافت کا معمارِ اوّل

مولوی محمد باقر دہلوی

(1780-1857)

ہندوستان کی اردو صحافت نے دنیائے صحافت میں وہی کردار ادا کیا ہے۔ جو کردار انقلاب فرانس میں وہاں کے دانشور طبقے کا رہا ہے۔ اسی پر فرانس کے عظیم مفکر والٹیر کو اپنی مہر ثبت کرنی پڑی اور اقرار کرنا پڑا۔

"The writing and propoganda of the philosophers made excellent gun powder for destroying the monarchy of france." Voltair.

یہی قول ہمارے مجاہدین آزادی ہند پر صادق اترتا ہے۔ واقعی اردو کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اردو کے کئی عظیم ممتاز صحافی جنگ آزادی کے سپہ سالار بھی تھے جو بیک وقت ایک ادیب، ایک صحافی، ایک دانشور، ایک عالم، ایک شاعر، ایک مفکر اور ایک عظیم مجاہد آزادی بھی تھے۔ میں چند عظیم اور معروف صحافیوں کا نام لوں گا جو خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت اور مختلف اوصاف کی حامل تھیں۔ ان میں مولانا محمد باقر 1857 مکندلال آگرہ، سردار امر سنگھ منصور، شیر پنجاب، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور ادب وصحافت سے سیاست میں داخل ہوئے۔

میں اپنے اس مقالہ میں اردو صحافت کے معمارِ اوّل مولوی محمد باقر دہلوی کے متعلق سرسری جائزہ پیش کروں گا، جو دہلی کے معروف عالم دین اور معلم قرآن اور مولانا محمد حسین آزاد کے والد محترم تھے۔ موصوف نے مستقبل کی اردو صحافت کو وطنی کردار سے سرفراز کیا۔

مولوی محمد باقر حضرت سلمان فارسی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ موصوف کے جد امجد مولانا شکوہ عالم کے عہد میں ایران سے دہلی آئے تھے۔ ان کے فرزند ارجمند محمد اشرف تھے اور ان کے صاحبزادے محمد اکبر تھے۔ مولانا محمد باقر انہی کے فرزند تھے۔ ان کی پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عموماً 1780 تاریخ پیدائش خیال کیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم مولوی عبدالرزاق کے یہاں حاصل کی۔ دہلی کالج میں داخل ہونے کے بعد ممتاز طالب علم رہے۔ 1831 میں لارڈ ولیم بنٹنگ نے کالج کا معائنہ کیا۔ ولیم نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں بطور انعام خلعت سے نوازا۔ بعدازاں مولانا دہلی کالج میں بحیثیت مدرس بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد سررشتہ دار، منصرم اور تحصیلدار وغیرہ کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ ملازمت کے زمانے میں دہلی اردو اخبار شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔

بقول ڈاکٹر انیس صدیقی ''مولوی محمد باقر کی ادارت میں دہلی سے 1836 میں منظر عام پر آنے والے 'دہلی اردو اخبار' کا نام سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔''

(جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار گھومتا آئینہ، گلبرگہ، کرناٹک، 2025)

جی ڈی چندن اپنے مقالہ میں یوں رقمطراز ہیں:

''1834 میں مولوی محمد باقر نے دلّی کالج سے اس کا ایک فاضل لیتھو پریس خریدا اور پہلے مطبع جعفریہ اور پھر مطبع اثناعشری کے نام سے اس سے طباعت کا کام کیا۔ پھر جب نئے اخبار کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو اردو کا اولین مطبوعہ اخبار ہونے کی حیثیت سے اپنے وقت کا عجوبہ عظیم تھا۔''

ڈاکٹر محمد سعد اللہ اپنی تصنیف میں رقمطراز ہیں:

''مولوی محمد حسین آزاد کے والد محترم مولوی محمد باقر تھے۔ جنھوں نے دہلی کا پہلا اردو اخبار 1836 میں دہلی اردو اخبار کے نام سے جاری کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے فاضل اور اہل قلم تھے۔ ان کے دوستانہ مراسم اپنے زمانے کے فضلا سے تھے۔ استاد ذوق سے خصوصی تعلقات کی بنا پر انھوں نے آزاد کو ذوق کی تربیت میں دے دیا تھا۔ 1857 کا ہنگامہ شروع ہوا تو ابتدا میں انگریزوں کو بری طرح شکستیں ہوئیں۔ ان سے متاثر ہو کر مولوی محمد حسین آزاد نے فتح افواج شرق، کے عنوان سے ایک نظم کہی جو دہلی اردو اخبار، مورخہ 24 مئی 1857 میں شائع ہوئی تھی۔''

(نیشنل آرکیوز دہلی اور شہر آشوب آغاز، ارتقا و اہمیت، ڈاکٹر محمد سعد اللہ، صدر شعبہ اردو فارسی، ایس کے کے کالج، جلگاؤں جامود، بلڈانہ، ص389)

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شایان اولی العزم سلاطین جہاں دار	کو ملک سلیمان وکجا حکم سکندر
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو وہیں مار	کام آئے نہ علم و ہنر وحکمت وفطرت
ہے گردش گردوں بھی عجب گردش دوار	یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
دل نے کہا قل فاعتبرو یا اولی الابصار'	اس واقعے کی چاہی جو آزاد نے تاریخ

(شہر آشوب390) ڈاکٹر سعد اللہ جلگاؤں جامود(1273ھ)

1857 کا یہ واحد اخبار، دہلی اردو اخبار، نے اپنی اردو صحافت کو وطنی کردار سے سرفراز کیا تھا اور مستقبل کی اردو صحافت کی بھی راہ ہموار کر دی تھی۔

بقول ڈاکٹر انیس صدیقی:

'صحافت اطراف واکناف کے حالات وواقعات سے راست آگاہی کا نام ہے۔ یعنی صحافت اطلاع کا نام بھی ہے، یہ ابلاغ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صحافت نہ صرف انسانی فکر وشعور میں بالیدگی پیدا کرنے بلکہ ان عوامل سے واقفیت حاصل کرنے میں بھی معاونت کرتی ہے۔ اسی لیے اخبار اور صحافی کو سماج کا آئینہ دار اور آئینہ ساز کہا جاتا ہے۔ صحافی انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے۔ ہر صحافی اپنے اخبارات ورسائل کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے صحافت کا سفر طے کرتا

ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ’الہلال‘ کے مقاصد میں ’مسلمانوں میں مذہبی وسیاسی شعور وعرفان پیدا کرنا‘ ہندو مسلم اتحاد اور استخلاص وطن‘ کو شامل کیا تھا۔ 1857 کا سال انقلابیت سے بھر پور تھا۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر ظلم وستم اور سماجی، اخلاقی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی قدروں کو متاثر کیا۔ ان کا تسلط اور جبر وظلم ہندوستانیوں کے لیے واقعی باعث عار تھا۔ اس لیے ہندوستانیوں نے ملک کی آزادی کے لیے تحریک کا آغاز کیا۔ انقلاب 1857 میں اردو صحافت نے اہم رول ادا کیا۔ چونکہ مولوی باقر اس دور کے مجاہدین کے حامی اور ہم نوا تھے۔ مولوی صاحب صحافی اور عالم دین کے ساتھ فوجی کارنامے بھی انجام دیتے تھے۔ جیون لال نے اپنے 16 مئی کے روزنامچے میں لکھا ہے کہ ’’آج کے دن بادشاہ نے مولوی محمد باقر اور مولوی عبدالقادر کو باریاب ہونے کی عزت بخشی کیونکہ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو نہایت ذہانت اور بہادری سے انجام دیا تھا۔ بادشاہ نے مولوی محمد باقر کو خلعت عطا کیا۔ 17 مئی کو مولوی باقر نے پیدل فوج کی دو پلٹنوں اور سواری کے ایک دستہ کو حکم دیا کہ خزانہ کی حفاظت کریں۔‘‘

(صاحب سیف وقلم مجاہد وطن۔ مولانا محمد باقر، ڈاکٹر محمد صہیب، الہ آباد، انقلاب 1857 نمبر 165)

گویا مولوی صاحب جذبہ حب الوطنی اور حق گوئی سے سرشار تھے۔ سیف وقلم کا ذہنی جذبہ سرفروشی کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ مولوی صاحب صحافتی بصیرت کا جذبہ رکھتے تھے۔ جذبہ حب الوطنی پیدا کرنا، جہادِ آزادی کی حمایت، سرکار برطانیہ کے ظلم وستم اور حکام پر تنقید کرنا اور بڑی بیباکی سے حق گوئی کا اعتراف کرنا ان کی صحافت میں شامل تھا۔

مولوی صاحب کے اردو اخبار میں ذوق، بہادر شاہ ظفر، غالب، غلام رسول، مرزا جیون بخت، مرزا انور الدین کے علاوہ ادبی گروہوں کی نوک جھونک کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں لیکن سیاسی پہلو بھی جاندار تھا یعنی انگریز دشمنی، وہ انگریز کی غلامی کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور ملک کی آزادی کے بڑے شدت سے آرزو مند تھے۔ مولوی صاحب نے اسباب بغاوت ہند، کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی کا لگانا، ہندوستانی سپاہیوں پر روزانہ گولی چلانا، بہادر شاہ ظفر سے مہمانوں کی آمد ورفت، راہ ورسم کے بنیادی حقوق چھیننا، روضہ لال باغ کی قبریں اکھاڑنا، ہزار ہا لوگوں کی جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں۔

(امداد صابری: تاریخ صحافت اردو جلد اوّل، ص 87-184، انقلاب 1857 نمبر، نیا دور لکھنو اپریل مئی 2007، جی ڈی چندق، نئی دہلی ص 156)

انقلاب 1857 کا سال جنگ آزادی کا اہم سال تھا۔ مولانا نے اپنے سیف وقلم سے وطنی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ جی ڈی ٹنڈن اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:

’’جب یہ بغاوت 10 مئی کو کھلم کھلا شروع ہوگئی تو مولوی محمد باقر نے اپنی ذات اور اپنے اخبار دونوں کو اس کے لیے وقف کر دیا اپنے اخبار کو ایک مجاہد وطن بنا دیا تھا۔ اس کے آغاز کی رپورٹنگ کا اخبار کا 16 مئی 1857 کا شمارہ اس کے مہتمم مولوی محمد باقر کی آنکھوں دیکھی روداد تھی جو ایک کیمرہ کی آنکھوں دیکھی روداد تھی۔ تاریخ آزادی کے مورخین کے لیے یہ ایک نہایت نادر دستاویز ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولوی صاحب نے اپنے اثر ورسوخ سے اپنے ذرائع سے رابطہ قائم کیا اور اپنے اخبار میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہروں کی خبریں شائع کیں۔ اخبار 17 مئی 1857 کا مکمل شمارہ انھوں نے بغاوت نمبر کی شکل میں شائع کیا۔ اس میں دہلی شہر، میرٹھ، سہارن پور اور روڑکی کے حالات احتجاج بیان کیے گئے۔

مولوی محمد باقر نے حسب معمول رپورٹر کا کام پردے میں کیا اور راقم آثم کے نام سے ایک طویل روداد شائع کی جو اس عظیم جنگ آزادی کی چشم دید رپورٹ کی تاریخی یادگار ہے۔ موصوف محبان وطن کی ہمت بڑھانے کے لیے قومی اپیلیں، نصیحتیں، دلیلیں اور بزرگوں کے اقوال بھی شائع کرتے تھے۔ 6 مئی 1857 کے شمارے میں ان کے صاحب علم وادب فرزند مولوی محمد حسین آزاد کی نظم ’تاریخ انقلاب‘ بھی شائع ہوئی ان کی عمر 27 سال تھی۔‘‘ (انقلاب 1857 نمبر۔ نیا دور لکھنو۔ اپریل مئی 2007، ص 162)

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی محمد باقر، وطنی صحافت کا معمار اول اردو صحافی تھا اور ’دہلی اردو اخبار‘ کو تمام اخبارات میں اردو کا پہلا سیاسی اور وطنی اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس نے 1857 کی جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اگرچہ کہ ’جام جہاں نما‘ کلکتہ کو اردو کا پہلا اردو اخبار قرار دیا جاتا ہے۔ (مارچ 1822) لیکن ان میں سے بیشتر اخبارات کو کمپنی کی پشت پناہی حاصل تھی جس سے صحافت میں انگریز سرکار پر تنقید نظر نہیں آتی تھی۔ ان اخباروں نے کمپنی کے نقطہ نظر کو ہی اپنی پالیسی بنایا تھا۔ ’دہلی اردو اخبار‘ نے آزادی ہند کو ہی اپنا نصب العین بنا لیا تھا اور جنگ آزادی کو پروان چڑھانے میں ہی حصہ لیا تھا اور آزادی کے متوالوں اور جیالوں میں جذبہ حب الوطنی اور جوش وولولہ پیدا کرنا ہی اہم مقصد تھا۔ مولوی محمد باقر کو اسی جہادِ آزادی کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت کی پاداش میں شہید کیا گیا۔ ان کی شہادت کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ باغیوں کو دلّی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر کے قتل کی ترغیب دینے کے شبہ میں فرنگی حکام نے انھیں گولی ماردی۔ گوپی چند نارنگ اپنی تصنیف میں ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری میں اس کی تائید کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ انھیں انگریزوں نے غدر کے بعد اس الزام کی بنا پر گولی سے اڑا دیا کہ دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کو ہلاک کرانے میں انھوں نے باغیوں کی مدد کی۔

ایک روایت جو محمد حسین آزاد کے نبیرہ آغا محمد باقر نے بیان کی یہ ہے کہ:

’’وسیع وعریض گرفتاریوں کے ایام میں انگریز حاکموں نے 16 ستمبر 1857 کو مولوی محمد باقر کو گرفتار کر لیا تھا اور 17 ستمبر کو انھیں کیپٹن ہڈسن کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان کے حکم سے انھیں اسی دن دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے سامنے میدان میں گولی سے شہید کر دیا گیا۔ ان کے فرزند محمد حسین آزاد اپنے والد کے ایک دوست کرنل سردار سکندر سنگھ کی مدد سے بھیس بدل کر اور ان کا سائیس بن کر دہلی دروازے کے باہر کے میدان کے کنارے سے ان کے آخری دیدار کے لیے گئے۔ والد محترم کا دیدار کیا اور ان کا اشارہ ملنے پر کرنل سکندر سنگھ نے اپنا گھوڑا موڑ لیا۔ فرنگی کپتان نے توپ کا گھوڑا دبایا اور 77 سالہ مولوی محمد باقر حق تعالیٰ سے جاملے۔‘‘

(ایضاً، ص 219)

اس عہد کی صحافت نے اپنے ہم وطنوں کو ملک کے معاشی، سماجی، ادبی اور سیاسی حالات سے آگاہ کیا اور ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے۔ مولوی محمد باقر نے جہادِ آزادی کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت کی پاداش میں خوشی خوشی اپنی جان نچھاور کر دی اسی لیے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مولوی محمد باقر ہندوستان کی کسی بھی زبان کے اولین صحافی تھے جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان نچھاور کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان سب کی بنا پر انھیں اولین شہید صحافی اور وطنی صحافت کا معمار اول کہنا غلط نہ ہوگا۔

■

Dr. Abdul Aziz Irfan
Opp. Maulana Azad College, National Colony
Plot no. 34, Sambhaji Nagar
(Aurangabad) 431001 Maharashtra
Mob.9890204715
Email: shaikhaziz1948@gmail.com

معصوم مرادآبادی

عظیم مجاہد آزادی

مولانا حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی کا نام آتے ہی ان کی کئی حیثیتیں ایک ساتھ ذہن میں ابھرتی ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک مضبوط سپاہی تھے تو وہیں دوسری طرف بے باک صحافی، صاحب طرز ادیب، نقاد اور ممتاز شاعر بھی تھے۔ ان کی ذاتی زندگی پر نظر ڈالیے تو ان کے فقیرانہ طرز حیات اور بوریا نشینی کے قصے سر اٹھاتے ہیں۔ وہ ہمہ جہت اور ہمہ صفات شخصیت کے حامل ایسے انسان تھے جن کی زندگی سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کو انگریز سامراج کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے لازوال قربانیاں پیش کیں اور ہمہ وقت اس جدوجہد میں سرگرم رہے۔ انھوں نے آزادی کے متوالوں کے دلوں میں ایک صور پھونکا اور 'انقلاب: زندہ باد' کا نعرہ ایجاد کیا جو آج بھی دنیا بھر میں حریت پسندوں کا سب سے محبوب نعرہ ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ ان کا انتقال 1951 میں ہوا اور اس اعتبار سے ان کے یوم وفات کو 75 برس پورے ہو رہے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی جذبہ حریت سے سرشار ایک بے مثال رہنما تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں جو لازوال قربانیاں پیش کیں، ان کا اعتراف جہاں ایک طرف گاندھی جی، سبھاش چندر بوس اور مولانا محمد علی جوہر نے کیا تو وہیں دوسری طرف پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی ان کے معترف تھے۔ مولانا حسرت موہانی جدوجہد آزادی کے ہراول دستے کے کام آنے والی تحریکوں کے بانی ہی نہیں تھے بلکہ وہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے علمبرداروں میں سرفہرست بھی تھے۔ سول نافرمانی اور عدم تعاون جیسی تحریکوں کا خیال بھی سب سے پہلے حسرت موہانی کے ذہن میں آیا تھا۔ پروفیسر مظفر حنفی کے الفاظ میں:

''انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے دس پندرہ برسوں کے اندر ہی ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو چند افراد اپنے جوش عمل اور حریت پسندی کی وجہ سے صف اوّل کے قومی رہنماؤں میں ممتاز سمجھے گئے ان میں بال گنگا دھر تلک، شری اربندو گھوش اور مولانا حسرت موہانی جیسے انقلابی اور گرم دل سے تعلق رکھنے والے مجاہدین آزادی سرفہرست تھے۔ یہ لوگ ابتدا ہی سے ہندوستان کی مکمل آزادی کے علمبردار تھے۔ حسرت نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا اور آخر وقت تک یہی نعرہ بلند کرتے رہے۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ سول نافرمانی اور عدم تعاون جیسی تحریکوں کا خیال سب سے پہلے حسرت موہانی کے ذہن میں آیا تھا، جس کا اعتراف گاندھی جی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں بھی کیا ہے۔ سودیشی اشیا کے استعمال اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تجویزیں بھی سب سے پہلے حسرت موہانی نے ہی پیش کی تھیں اور ان تحریکوں کے عام ہونے سے بہت پہلے انھوں نے 1913 میں سودیشی اسٹور قائم کیا تھا۔''

('حسرت موہانی: مظفر حنفی، این بی ٹی 1989، ص 11)

مولانا حسرت موہانی کا اصل نام سید فضل الحسن تھا۔ شاعری سے گہرے شغف کی بنا پر انھوں نے حسرت تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کی پیدائش اترپردیش کے ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں ہوئی تھی اور اسی مناسبت سے وہ اپنے تخلص کے ساتھ موہان کا لاحقہ استعمال کرتے تھے۔ آپ کے والد کا نام سید اظہر حسن اور والدہ کا سیدہ شہر بانو تھا۔ حسرت موہانی کی پیدائش 1881 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے پرانے طرز کی ابتدائی تعلیم فتح پور ہسوہ میں پائی۔ آپ نے قرآن شریف نیز اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں میاں جی غلام علی اور میاں جی بلاقی موہانی سے پڑھیں۔ بعد میں موہان کے مڈل اسکول میں داخل ہوئے جس کے ہیڈ ماسٹر پنڈت لچھمن نرائن حسرت پر بہت مہربان تھے۔ حسرت نے 1894 میں وہیں سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور پورے صوبے میں اوّل آئے۔ 1898 میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور سے میٹرک کے امتحان میں بھی فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی اور وظیفہ یاب ہوئے۔ اس کے بعد آپ علی گڑھ تشریف لے گئے، جہاں سے آپ نے 1903 میں گریجویشن کیا، اس میں ریاضی اور عربی آپ کے خاص مضامین تھے۔ آپ کے قابل اساتذہ میں مولانا سید ظہورالاسلام، مولانا نور محمد، مولانا حبیب الدین،

علامہ نیاز فتح پوری کے والد محمد امیر خاں، پروفیسر جے سی چکرورتی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین اور خلیل احمد اسرائیلی کے نام قابل ذکر ہیں۔

آپ کی شادی 1901 میں محترمہ نشاط النساء سے ہوئی جن کا برصغیر کی سیاسی زندگی میں نمایاں مقام تھا۔ شاعری کی طرف رجحان ہوا تو سب سے پہلے سید فخر الحسن فطرت موہانی سے اصلاح لی۔ بعدازاں آپ امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ آپ کا سلسلہ سخن شاہ حاتم دہلوی سے ملتا ہے۔ پہلی غزل 1893 میں کہی جو کلیات حسرت میں شامل ہے۔ حسرت کا قد چھوٹا، رنگ گندمی اور آنکھیں بڑی تھیں اور چہرے پر چیچک کے داغ نمایاں تھے۔ جو وضع انھوں نے اوّل دن اختیار کی اس پر آخر تک قائم رہے۔ عموماً شیروانی، ترکی ٹوپی اور پاجامہ پہنتے تھے۔ آواز باریک تھی اور جوانی میں کافی مترنم تھی۔ جوانی میں داڑھی مونڈوایا کرتے تھے مگر ایک بار ان کے مخلص دوست عبدالباری خاں وفا نے ان سے وعدہ لیا کہ داڑھی کبھی نہیں منڈوائیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے جو داڑھی رکھی اسے کبھی نہیں منڈوایا۔ رات کو سوتے وقت کوئی کپڑا سر پر باندھ کر سوتے تھے۔ صبح سویرے بیدار ہوتے، جلد ناشتہ کرتے۔ کھانا اوّل وقت ہی کھا لیتے تھے۔ کھانے پینے کی کسی چیز کے پابند نہیں تھے جو مل گیا اسے بخوشی کھا لیتے البتہ کھٹی چیزیں یہاں تک کہ دہی تک استعمال نہیں کرتے تھے۔ پان تو کھا لیتے تھے لیکن تمباکو سگریٹ وغیرہ سے انھوں نے ہمیشہ پرہیز ہی کیا اور سرمہ لگانا کبھی نہیں چھوڑا۔ اخبار پابندی سے اور شروع سے آخر تک پڑھتے تھے۔ زیادہ باتیں کرنے کے عادی نہیں تھے۔ سیاسی امور پر جب مباحثہ ہوتا اور ان کو جوش آجاتا تو بات دیگر تھی۔

حسرت کی سیاسی زندگی کا آغاز علی گڑھ میں طالب علمی کے دور میں ہی ہو گیا تھا۔ ان کی حق گوئی اور بے باکی اور حریت پسندی کے جوہر بھی اسی دور میں کھل کر سامنے آئے۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر اگر وہ چاہتے تو کوئی اچھی ملازمت انھیں مل سکتی تھی۔ گریجویشن کرتے ہی گوالیار کے وکٹوریہ کالج میں انھیں ریاضی اور عربی کے پروفیسر کی ملازمت کا آفر بھی ملا، لیکن ان کی حریت پسندی اور قومی حمیت نے اس قسم کی ملازمت کو اپنے لیے مناسب نہیں سمجھا اور ملک وقوم کی خدمت کو انھوں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ بی اے سے فراغت کے بعد ہی انھوں نے علی گڑھ سے 'اردوئے معلیٰ' کے نام سے ایک ماہنامے کا ڈکلیریشن داخل کر دیا، جس کا پہلا شمارہ جولائی 1903 میں منظر عام پر آیا۔ علی گڑھ کالج کی انجمن 'اردوئے معلیٰ' کے سکریٹری کی حیثیت سے انھیں قومی وادبی موضوعات پر اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل ہو چکی تھی۔ حسرت نے اپنی صحافت کے ذریعہ اس دور کے مسلمانوں کا مذاق درست کرنے اور ان میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی اور 'اردوئے معلیٰ' کے ذریعہ عام ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ یہ وہ دور تھا جب قدامت پسند مسلمانوں کے ساتھ علی گڑھ تحریک سے متاثر روشن خیال اور تعلیم یافتہ مسلم طبقہ کانگریس سے بدظن تھا۔ حسرت نے مسلمانوں کے دلوں سے کانگریس سے بدظنی کے جذبات دور کیے۔ کالج سے نکلتے ہی حسرت موہانی کانگریس میں شریک ہو گئے اور 1904 سے 1907 تک اس کے ہر اجلاس میں شریک ہوئے۔ وہ 'اردوئے معلیٰ' کے ذریعہ مسلسل آزادی کی تحریک کو تقویت پہنچاتے رہے۔ انھوں نے دسمبر 1904 کو منعقدہ کانگریس کے بیسویں اجلاس میں بطور مندوب شرکت کی اور 1905 میں آل انڈیا انڈسٹریل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں حصہ لینے کے بعد سودیشی کے مبلغ بن گئے۔ اس مسئلہ پر دیگر کانگریسی لیڈروں کے برعکس ان کا رویہ زیادہ حقیقت پسندانہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صرف چرخے کی مدد سے پورے ہندوستان کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی، اس لیے ہندوستانی ملوں میں بنائے جانے والے کپڑوں کو بھی سودیشی سمجھنا چاہیے۔ بدیشی مال کے بائیکاٹ سے متعلق ان کا معرکۃ الآرا مضمون 'سودیشی اور بائیکاٹ' جنوری 1907 کے 'اردوئے معلیٰ' کے شمارے میں شامل ہے۔ اگست، ستمبر 1907 کے مشترکہ شمارے میں اپنے مضمون میں حسرت نے پہلی بار دفاعی مزاحمت کا لائحہ عمل پیش کیا۔ اس معاملے میں حسرت کی دور اندیشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً بارہ برس بعد گاندھی جی نے ان ہی اصولوں پر کاربند رہ کر سول نافرمانی اور ترک موالات کی تحریک چلائی اور اپنی خودنوشت میں یہ اعتراف بھی کیا، یہ راہ انھیں حسرت موہانی نے دکھائی تھی۔

حسرت موہانی کی انقلابی ذہنیت، بلند ہمتی اور پرجوش طبیعت چاہتی تھی کہ ہندوستان کو جلد از جلد برطانوی سامراج کی غلامی سے آزاد کرایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نرم دَل کی بجائے گرم دَل کے لیڈروں بال گنگادھر تلک، اربندو گھوش اور سبھاش چندر بوس جیسے لیڈروں کا ساتھ دیا۔ 'اردوئے معلیٰ' میں حسرت کی جوشیلی تحریریں ہندوستانی مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرتی تھیں جو حکومت کو سخت ناپسند تھا۔ حسرت کی سیاسی سرگرمیاں اور انقلابیوں کے ساتھ ان کے تعلقات

حسرت نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا اور آخر وقت تک یہی نعرہ بلند کرتے رہے۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ سول نافرمانی اور عدم تعاون جیسی تحریکوں کا خیال سب سے پہلے حسرت موہانی کے ذہن میں آیا تھا، جس کا اعتراف گاندھی جی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں بھی کیا ہے۔ سودیشی اشیا کے استعمال اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تجویزیں بھی سب سے پہلے حسرت موہانی نے ہی پیش کی تھیں اور ان تحریکوں کے عام ہونے سے بہت پہلے انھوں نے 1913 میں سودیشی اسٹور قائم کیا تھا۔

برطانوی اقتدار کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ آخر کار حسرت کو 'اردوئے معلیٰ' کے شمارے اپریل 1908 میں شائع شدہ ایک مضمون کی اشاعت کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا اور 22 جون 1908 کو حسرت پر بغاوت کے الزام میں مجسٹریٹ علی گڑھ کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا جہاں 4 اگست 1908 کو انھیں دو برس کی قید بامشقت کی سزا اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ ابھی حسرت قید بامشقت کی سزا بھگت ہی رہے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ 'اردوئے معلیٰ' حسرت کی عدم موجودگی میں بند ہوگیا تھا۔ رہائی کے بعد انھوں نے اسے دوبارہ جاری کیا اور قید وبند کے دوران پیش آنے والے واقعات کی تفصیل اس رسالے میں 'مشاہدات زنداں' کے عنوان سے قسط وار شائع کی جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بعد کو یہ اسی عنوان سے 1958 میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

حسرت موہانی کو جیل میں استعمال کے لیے وہی لباس پہننے کو ملا جو چور اور ڈاکوؤں کو دیا جاتا ہے۔ یعنی ایک لنگوٹ، ایک جانگھیا، ایک کرتا اور ایک ٹوپی۔ لیٹنے کے لیے انھیں جوٹ کا بوریا اور پھٹا پرانا کمبل دیا گیا۔ پہننے کے کپڑے چونکہ سال میں ایک بار ملتے تھے۔ اس لیے حسرت انھیں احتیاط کے ساتھ صرف صبح اور شام کے وقت پہنتے تھے اور دن بھر جیل کا سخت کام لنگوٹ پہن کر انجام دیتے تھے۔ جیل میں پہنچتے ہی انھیں ہاتھ سے چکی پیسنے کے کام پر لگادیا گیا اور ایک جیل سے دوسری جیل میں تبدیل ہونے کے باوجود حسرت کو اس کام سے اسیری کی پوری مدت میں نجات نہیں مل سکی۔ انھیں ایک من غلہ روزانہ پیسنا پڑتا تھا۔ ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقلی کے وقت حسرت کو بھوکا رکھا جاتا تھا۔ نینی جیل کا جیلر انھیں دھمکیاں دیتا رہتا کہ ٹھیک برتاؤ نہ کرنے میں انھیں بیماری کے حیلے سے اسپتال بھیج کر زندہ جلا دیا جائے گا۔ برطانوی راج کے ظلم کی انتہا یہ تھی کہ حسرت کو رمضان کے زمانے میں روزہ رکھنے کے دوران بھی چکی کی مشقت سے چھٹکارا نہیں مل سکا۔ اس مشقت کا تذکرہ انھوں نے اپنے ایک مشہور زمانہ مطلع میں یوں کیا ہے۔

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد حسرت موہانی پہلے مسلمان اور بال گنگا دھر تلک کے بعد دوسرے ہندوستانی رہنما تھے جنھیں سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے انگریزوں کی قید میں رہنا پڑا۔ حالانکہ ہندوستان کی مکمل آزادی کو کانگریس نے 1929 میں اپنے مطالبات میں شامل کیا۔ لیکن حسرت موہانی یہ قرارداد آٹھ برس پہلے 1921 کے کانگریس سیشن میں پیش کر چکے تھے۔ ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کا بیان ہے:

''احمد آباد میں کانگریس کا اجلاس بڑی شان کے ساتھ ہوا۔ دیش بندھوداس گپتا صدر منتخب ہوئے، لیکن چونکہ وہ جیل میں تھے اس لیے حکیم اجمل خاں نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔۔ احمد آباد میں سب سے پہلے کانگریس کا اجلاس ہوا۔ ایک بڑے معرکے کی تجویز جس میں بڑی سرگرمی کے ساتھ بحث ہوئی، مولانا

حسرت موہانی کی تھی، جس میں انھوں نے برٹش سامراج سے الگ ہوکر ہندوستان کے آزاد ہونے کو کانگریس کا مقصد بنائے جانے پر زور دیا تھا۔ مہاتما جی نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی تھی۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے وہ تجویز نامنظور ہوگئی تھی۔''

('باپو کے قدموں میں: ڈاکٹر رجندر پرشاد، ص 252)

حسرت موہانی اودھی تہذیب ومعاشرت میں پلے بڑھے انتہائی نستعلیق انسان تھے۔ ان کے والد اظہر حسین اگرچہ ایک جاگیردار تھے لیکن حسرت کی طبیعت 'طرفہ تماشا' سے کم نہیں تھی۔ ان کا بچپن ننہیال میں گزرا۔ کہا جاتا ہے کہ اودھی تہذیب کے پروردہ حسرت جب علی گڑھ میں وارد ہوئے تو کچھ اس طرح کہ ایک ہاتھ میں پاندان تھا، بدن پر نفیس انگرکھا اور پیروں میں قدیم طرز کے جوتے۔ پہنچتے ہی انھیں علی گڑھ کے لڑکوں نے 'خالہ اماں' کے خطاب سے نوازا۔ یہاں تک کہ سجاد حیدر یلدرم نے ان پر 'مرزا پھویا' کے عنوان سے ایک نظم لکھ ڈالی، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے وہ جلد ہی علی گڑھ کے ادبی حلقوں میں مقبول ہوگئے۔ اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے علی گڑھ سے نکالے بھی گئے، لیکن اپنے موقف پر اٹل رہے۔

حسرت موہانی ایک انتہائی سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ ٹرین کے تھرڈ کلاس ڈبہ میں سفر کیا اور بحیثیت ممبر پارلیمنٹ ملنے والی سہولتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ اکثر رکشہ پر بیٹھ کر پارلیمنٹ پہنچتے تھے۔ وہ دہلی میں اخبار 'وحدت' کے دفتر یا ایک مسجد کے حجرے میں قیام کرتے۔ انھوں نے دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے 75 روپے یومیہ لینے سے انکار کردیا تھا اور اس پر احتجاج کیا تھا کہ ممبروں کے لیے اتنی بڑی رقم یومیہ بھتہ لینا ہندوستان کے غریب اور فاقہ کش عوام کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔ راولپنڈی کے ایک مشاعرے میں ایک بار انھیں پانچ سو روپے کا جو نذرانہ ملا تھا، وہ انھوں نے ایک مقامی یتیم خانے کو عطیہ کردیا تھا۔ اسی طرح لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے ایک پروگرام میں شرکت کے عوض انھیں جو نذرانہ پیش کیا گیا تھا، اسے انھوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ اتنی رقم لے کر وہ کیا کریں گے۔ ریڈیو والوں کے بے حد اصرار پر انھوں نے اس میں سے صرف تین آنے لینا منظور کیا۔ اس واقعہ کی تفصیل شوکت تھانوی نے کچھ اس انداز میں بیان کی ہے۔

''میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھا اور لکھنو اسٹیشن پر تعینات تھا۔ اس زمانہ میں آل انڈیا ریڈیو لکھنو کے اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر سوم ناتھ چپ تھے۔ معلوم نہیں یہ شوق خود چپ صاحب کو ہوا یا آل انڈیا ریڈیو کے ہیڈ کوارٹر کی ہدایت تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو مولانا حسرت موہانی کو ریڈیو میں لاکر خود ان ہی سے ان کی ایک آدھ غزل پڑھوا کر ریکارڈ کرلی جائے۔ چپ صاحب نے یہ خدمت میرے سپرد کی کہ میں کانپور جاکر مولانا حسرت کو جس طرح بھی ہو لکھنؤ لے آؤں۔

کانپور پہنچ کر میں سیدھا اس سڑک پر پہنچا جو حسرت روڈ کہلاتی تھی۔ خیال تھا کہ اپنے نام کی اسی سڑک پر کہیں نہ کہیں مولانا رہتے ہوں گے۔ مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سڑک تو بے شک ان کے نام کی ہے مگر اس سڑک پر اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔ پتہ چلا کہ ایک اور محلے میں ایک مسجد کے پاس مولانا حسرت کا مکان ہے۔ پوچھتا ہوا اسی پتے پر پہنچا اور اسی مسجد سے ایک شخص کو پانی کا بھرا ہوا گھڑا لے کر نکلتے ہوئے دیکھا اور غور سے دیکھ کر پہچان لیا کہ مسجد کے نل سے پانی بھرنے والا یہی وہ شخص ہے جس کو سیاسی دنیا رئیس الاحرار کہتی ہے اور دنیائے شعر میں یہی شخص رئیس المتغزلین کہلاتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے گھڑا گھر میں پہنچانے کے بعد ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر مجھے بھی بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ مگر جب میں نے حاضری کا مقصد بیان کیا تو ریڈیو کا نام سن کر چونکے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ انکار کرنے کے بعد اپنے انکار پر اڑ جائیں، میں نے ریڈیو پر جا کر اپنی آواز محفوظ کرا دینے کو ان کی اتنی بڑی ادبی خدمت ثابت کیا کہ میری خوش گفتاری نہ سہی مگر خوش نصیبی تھی کہ وہ آمادہ ہو گئے اور آمادہ بھی ایسے ہوئے کہ مجھ سے فرمایا کہ بہتر ہے ابھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ' رات کی ٹرین سے واپس بھیج دیجیے گا مجھے۔ کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہر شیریں لے جارہا ہوں باغ خسرو میں۔ کانپور کے اسٹیشن پر پہنچ کر میں تو تانگہ والے کو کرایہ دیتا رہ گیا۔ مولانا نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈھا تو آپ تھرڈ کلاس کی بکنگ کی کھڑکی سے واپس آتے نظر آئے۔ میں نے لپک کر کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ ٹکٹ تو میں لینے جارہا تھا۔ آپ نے نہایت بے پروائی سے فرمایا ''جی ہاں اپنا ٹکٹ آپ لے لیجیے میں تو اپنا ٹکٹ لے آیا ہوں'' مجبوراً مجھے بھی تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لینا پڑا۔ میں مولانا کو لکھنو ریلوے اسٹیشن سے لے کر سیدھا سوم ناتھ چپ صاحب کے بنگلے پر پہنچا اور چپ صاحب سے باقاعدہ تعارف کرایا یعنی مولانا کو بتا دیا کہ ان کا نام سوم ناتھ چپ ہے ظاہر ہے کہ یہ نام کسی مسلمان کا نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ نام سننے کے باوجود مولانا نے چپ صاحب سے کہا کہ مغرب کی نماز پڑھ لوں، ذرا جانماز منگائیے۔ میں ہنسی کو ضبط کر کے رہ گیا کہ چپ صاحب کے ہاں بھلا جانماز کا کیا کام؟ اور دوڑ کر میں ایک دھلی ہوئی تولیہ اٹھا لایا جس پر مولانا نے نماز پڑھ لی۔ اس کے بعد مولانا چپ صاحب سے بولے'' شوکت صاحب کہتے ہیں کہ میرا اپنے کلام کو ریکارڈ کرانا اردو کی خدمت ہے۔ آپ کے خیال میں میرے لیے ریڈیو پر جانا مناسب ہے یا نہیں۔ چپ صاحب نے بھی اسی قسم کی باتیں کیں کہ ریڈیو سے آپ کی آواز یہ اعلان کرتی رہے گی کہ جس ملک کا یہ ریڈیو ہے، اس ملک کی زبان وہی ہے جس میں آپ شعر کہتے ہیں۔ مولانا یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے تو پھر کہاں ہے وہ ریڈیو؟''

اس عرصہ میں ریڈیو اسٹیشن پر یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ مولانا حسرت تشریف لارہے ہیں۔ عشرت رحمانی ان کی غزلیں جمع کرتے پھر رہے تھے کہ نہ جانے مولانا کون سی غزل ریکارڈ کرنا چاہیں۔ کوئی صاحب کنٹریکٹ فارم تیار کرتے پھر رہے تھے۔ کوئی اسٹوڈیو ٹھیک کر رہا تھا کہ چپ صاحب میرے ہمراہ مولانا کو لے کر اسٹیشن پہنچ گئے۔ کنٹریکٹ ان کے سامنے پیش کیا گیا تو بولے '' یہ کیا ہے' خیر کچھ ہوگا'' اور دستخط کر دیئے۔ عشرت صاحب نے ان کی غزلیں ان کے سامنے پیش کیں تو کہنے لگے'' جی نہیں۔ یہ واہیات ہیں اور یہ غزل تو شاید میری ہے ہی نہیں۔ میں ایک اور غزل پڑھتا ہوں'' اور یہ کہہ کر شروع ہو گئے۔ بمشکل ان کو روکا اور کہا ابھی نہیں جس وقت اسٹوڈیو کی لال بتی آئے آپ شروع کر دیجیے گا اور جب لال بتی آئی تو مولانا نے جو غزل طے کی تھی اس کے علاوہ کوئی اور ہی غزل شروع کر دی۔

غزل ریکارڈ ہوگئی۔ اپنی آواز خود سن کر پہلے تو حیران رہے، پھر خود ہی خوش ہو گئے کہ ٹھیک تو ہے مگر اب سب سے سخت مرحلہ یہ درپیش تھا کہ مولانا کو چیک کیسے دیا جائے؟ آخر اسٹیشن ڈائرکٹر نے ہمت کی اور سو روپے کا چیک پیش کیا تو مولانا سو کا ہندسہ پڑھ کر بھڑک اٹھے''سو روپے'' یہ کس بات کے ہیں؟ میں اسی لئے تو آتا نہیں تھا کہ مجھ کو اسی قسم کے خدشے تھے'' لاکھ کہا گیا کہ یہ خصوصیت صرف آپ کے ساتھ نہیں ہے ریڈیو پر جو بھی آتا ہے اس کو معاوضہ ملتا ہے اور آپ کے لیے تو یہ معاوضہ بھی نہیں بلکہ نذرانہ ہے۔ مگر وہ کسی طرح اس چیک کو چھونے کو تیار نہ تھے۔ بمشکل تمام اس بات پر راضی ہوئے کہ کانپور سے لکھنو تک تیرہ آنے لکھنو سے کانپور تک تیرہ آنے ایک روپیہ دس آنے تو یہ ہوئے۔ باقی رہا یکہ کا کرایہ لہٰذا دو روپے دے دیجیے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر کوشش جب ناکام ہوگئی تو مجبوراً کنٹریکٹ کو آنریری کرنا پڑا۔ چیک کینسل کیا گیا اور دو روپے کسی نے اپنی جیب سے دے دیے۔ میں ٹرین میں بٹھانے لکھنو اسٹیشن تک گیا، اور جب تک گاڑی روانہ نہیں ہوئی، مولانا یہی کہتے رہے کہ'' خدا نے مجھ کو بچایا، ورنہ آپ نے تو مجھ کو فروخت ہی کر دیا تھا۔''

ایسی قلندرانہ زندگی گزارنے والے اس عظیم انسان نے 13 مئی 1951 لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔

جہاں میں سوگ ہے، ماتم بپا ہے مرگ حسرت کا
وہ وضع پارسا اس کی، وہ شوق پاکباز اس کا

حسرت موہانی ایک انتہائی سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ ٹرین کے تھرڈ کلاس ڈبہ میں سفر کیا اور بحیثیت ممبر پارلیمنٹ ملنے والی سہولتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ اکثر رکشہ پر بیٹھ کر پارلیمنٹ پہنچتے تھے۔ وہ دہلی میں اخبار 'وحدت' کے دفتر یا ایک مسجد کے حجرے میں قیام کرتے۔ انھوں نے دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے 75 روپے یومیہ لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس پر احتجاج کیا تھا کہ ممبروں کے لیے اتنی بڑی رقم یومیہ بھتہ لینا ہندوستان کے غریب اور فاقہ کش عوام کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔

Masoom Moradabadi
Z-103, Taj Enclave
Geeta Colony
Delhi-110031
Mob.:9810780563
Email:masoom.moradabadi@gmail.com

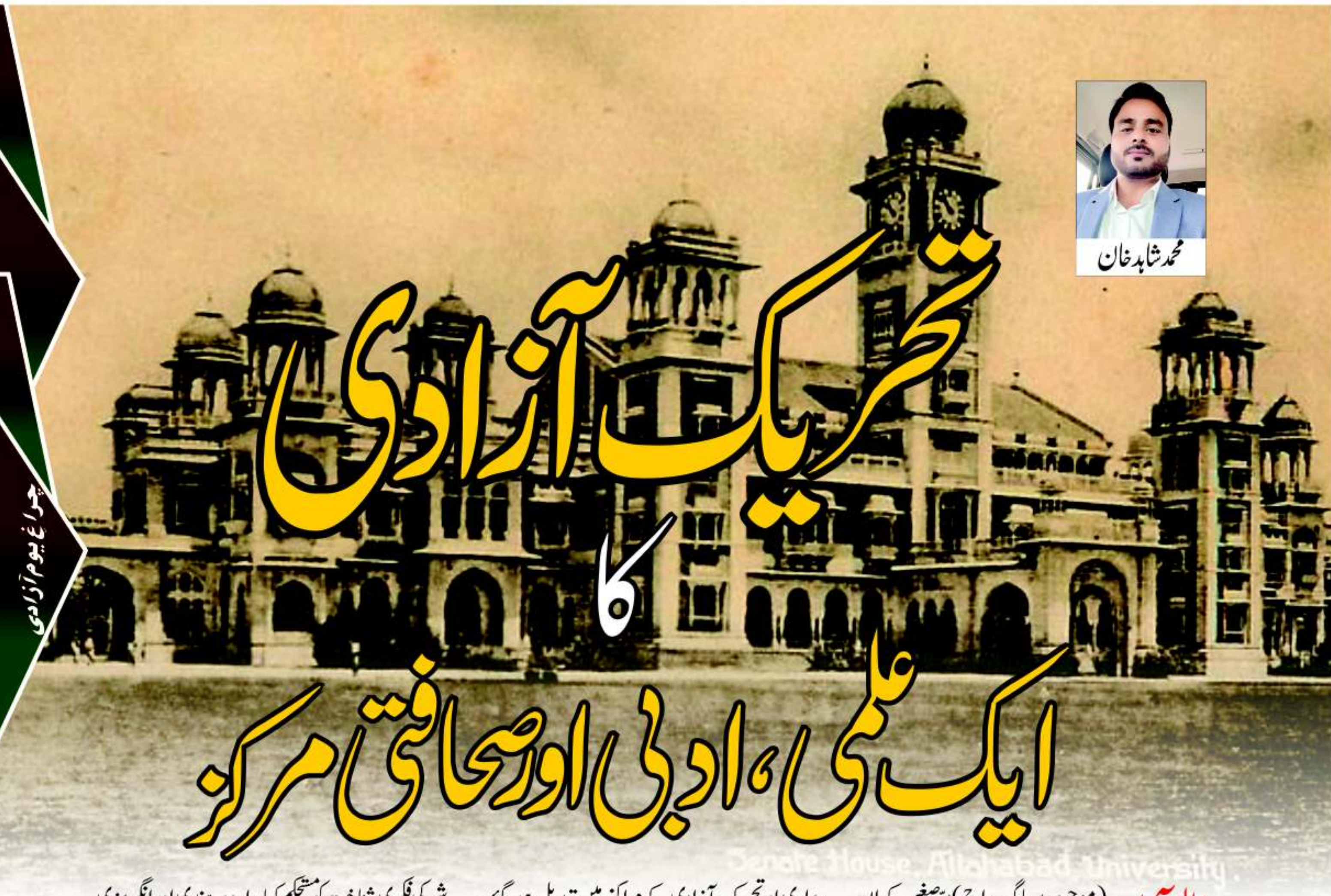

محمد شاہد خان

تحریکِ آزادی کا ایک علمی، ادبی اور صحافتی مرکز

الہٰ آباد (موجودہ پریاگ راج) برِّصغیر کے ان معدودے چند شہروں میں شمار ہوتا ہے جنھیں قدرت نے جغرافیائی اہمیت، تاریخی عظمت، مذہبی تقدس، علمی روایت اور سیاسی مرکزیت جیسی متعدد خصوصیات سے نوازا ہے۔ گنگا، جمنا اور اساطیری روایت کے مطابق سرسوتی کے سنگم پر واقع ہونے کے باعث یہ شہر صدیوں سے ہندوستانی تہذیب وثقافت کا مرکز رہا ہے۔ قدیم ہندو مذہبی متون میں اسے 'پریاگ' یعنی 'یگیہ کا سب سے مقدس مقام' قرار دیا گیا ہے، جب کہ مغل عہد میں شہنشاہ اکبر نے 1583 میں یہاں عظیم الشان قلعہ تعمیر کروا کر اس شہر کا نام 'الہٰ آباد' رکھا، جو بعد ازاں علمی، انتظامی اور سیاسی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

برطانوی اقتدار کے قیام کے بعد الہٰ آباد کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ انگریز حکومت نے اسے شمال مغربی صوبہ جات (North- Western Provinces) کا انتظامی مرکز بنایا، جہاں ہائی کورٹ، سرکاری دفاتر، ریلوے، ڈاک اور تعلیمی اداروں کا جال بچھایا گیا۔ اگر چہ ان اقدامات کا بنیادی مقصد استعماری اقتدار کو مستحکم کرنا تھا، لیکن یہی ادارے آگے چل کر قومی بیداری اور تحریکِ آزادی کے مراکز میں تبدیل ہوگئے۔ خصوصاً عدالتوں، تعلیمی اداروں اور صحافتی مراکز نے ایک ایسے تعلیم یافتہ متوسط طبقے کو جنم دیا جس نے غلامی کے خلاف فکری مزاحمت کو منظّم شکل دی۔

علمی اعتبار سے الہٰ آباد کو غیر معمولی امتیاز حاصل رہا۔ 1887 میں قائم ہونے والی الہٰ آباد یونیورسٹی نے بہت جلد برِّصغیر کے ممتاز علمی مراکز میں اپنی جگہ بنالی۔ اعلیٰ معیارِ تعلیم، نامور اساتذہ اور آزاد فکری ماحول کے باعث اسے 'مشرق کا آکسفورڈ' (Oxford of the East) کہا جانے لگا۔ اس جامعہ نے ایسے دانشور، ادیب، سیاست داں، قانون داں اور صحافی پیدا کیے جنھوں نے نہ صرف ہندوستان کی فکری زندگی کو متاثر کیا بلکہ تحریکِ آزادی کی نظریاتی تشکیل میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ یہاں علمی مباحث، ادبی نشستیں، طلبہ تنظیمیں اور سیاسی سرگرمیاں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط تھیں کہ جامعہ محض ایک تدریسی ادارہ نہیں بلکہ قومی شعور کی آبیاری کا مرکز بن گئی۔ آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

''الہ آباد یونیورسٹی صرف درس گاہ نہیں بلکہ ہندوستان کی فکری تربیت گاہ تھی۔'' (ادبی مضامین آلہ آباد)

اسی طرح الہ آباد کی صحافتی روایت نے بھی اس شہر کی فکری شناخت کو مستحکم کیا۔ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات ورسائل نے قومی افکار کی اشاعت، عوامی رائے عامہ کی تشکیل اور سامراجی مظالم کو بے نقاب کرنے میں تاریخی کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی حکومت نے اس شہر کے اخبارات اور مطابع کو مسلسل نگرانی، سنسرشپ اور قانونی کارروائیوں کا نشانہ بنایا، لیکن اس کے باوجود صحافیوں اور اہلِ قلم نے اظہارِ حق سے دست بردار ہونا قبول نہ کیا۔

الہ آباد کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا کثیر الثقافتی اور ہمہ گیر ادبی ماحول تھا۔ یہاں اردو اور ہندی دونوں زبانیں نہ صرف فروغ پاتی رہیں بلکہ قومی تحریک کے دوران ایک مشترکہ فکری دھارے کی صورت اختیار کر گئیں۔ مشاعرے، کوی سمیلن، ادبی انجمنیں، مطالعاتی حلقے اور علمی مباحث اس شہر کی تہذیبی زندگی کا لازمی حصہ تھے۔ اس ماحول میں اکبر الہ آبادی، فراق گورکھپوری، نوح ناروی، اصغر گونڈوی، سوریا کانت ترپاٹھی نرالا، مہادیوی ورما، سمترا نندن پنت اور متعدد دیگر اہلِ قلم نے ادب کو قومی بیداری کا موثر ذریعہ بنایا۔

سیاسی اعتبار سے بھی الہ آباد کی حیثیت غیر معمولی تھی۔ یہی وہ شہر تھا جہاں بعد کے ادوار میں سوراج بھون

پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مدن موہن مالویہ، پرشوتم داس ٹنڈن، تیج بہادر سپرو، کیلاش ناتھ کاٹجو اور دیگر ممتاز قومی رہنما اسی شہر سے وابستہ رہے، جس کے باعث الٰہ آباد عملی طور پر ہندوستان کی قومی سیاست کا مرکز بنتا چلا گیا۔

اور آنند بھون جیسے تاریخی مراکز قائم ہوئے، جنھوں نے ہندوستان کی قومی سیاست کا رخ متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان عمارتوں میں نہ صرف کانگریس کی اعلیٰ سطحی نشستیں منعقد ہوئیں بلکہ آزادی کی جدوجہد سے متعلق اہم فیصلے بھی یہیں کیے گئے۔ پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مدن موہن مالویہ، پرشوتم داس ٹنڈن، تیج بہادر سپرو، کیلاش ناتھ کاٹجو اور دیگر ممتاز قومی رہنما اسی شہر سے وابستہ رہے، جس کے باعث الٰہ آباد عملی طور پر ہندوستان کی قومی سیاست کا مرکز بنتا چلا گیا۔

ڈاکٹر راجندر کماری باجپئی اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں الٰہ آباد صرف ایک انتظامی یا تعلیمی شہر نہیں رہا، بلکہ وہ قومی سیاست، صحافت اور فکری بیداری کا ایسا مرکز بن چکا تھا جہاں سے تحریکِ آزادی کی متعدد اہم سرگرمیوں کو سمت ملتی تھی۔

(باجپئی، ڈاکٹر راجندر کماری، 1985 مضمون 1857 سے 1942 تک کے یوگ دان، ص1)

درحقیقت الٰہ آباد کی اصل قوت اس کے مختلف اداروں اور طبقات کے درمیان موجود فکری ہم آہنگی تھی۔ یہاں سیاست دانوں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، اساتذہ، وکلا اور طلبہ نے آزادی کو ایک مشترکہ قومی مقصد کے طور پر قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر میں سیاسی تحریک، ادبی بیداری، صحافتی مزاحمت اور تعلیمی سرگرمیاں ایک دوسرے کی معاون ثابت ہوئیں اور ایک ایسا قومی ماحول تشکیل پایا جس نے آنے والے عشروں میں تحریکِ آزادی کو نئی قوت اور نئی سمت عطا کی۔

اسی تاریخی، علمی اور فکری پس منظر نے 1857 کی جنگِ آزادی کے دوران الٰہ آباد کو برطانوی اقتدار کے خلاف مزاحمت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ مولوی لیاقت علی کی قیادت میں یہاں جو عوامی بغاوت برپا ہوئی، اس نے نہ صرف اس شہر بلکہ پورے شمالی ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو ایک نئی جہت عطا کی۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک الٰہ آباد قومی سیاست، صحافت، تعلیم اور زبان و ادب کا ایسا ہمہ جہت مرکز بن چکا تھا جہاں آزادی کی تحریک کے سیاسی، فکری اور ثقافتی پہلو باہم مربوط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ یہی فضا آگے چل کر ہوم رول تحریک، تحریکِ خلافت، عدم تعاون تحریک اور انقلابی سرگرمیوں کے لیے ایک مضبوط بنیاد ثابت ہوئی، جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو عوامی تحریک میں تبدیل کر دیا۔

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہندوستان کی قومی تحریک ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ اگر ابتدائی دور میں آزادی کی جدوجہد زیادہ تر آئینی مطالبات اور سیاسی اصلاحات تک محدود تھی، تو اب اس کا دائرہ وسیع ہو کر عوامی مزاحمت، قومی بیداری اور ہمہ گیر عوامی شرکت تک پہنچ چکا تھا۔ اس تبدیلی میں جہاں قومی رہنماؤں کی بصیرت اور عوامی تحریکوں نے بنیادی کردار ادا کیا، وہیں صحافت نے بھی آزادی کے نظریات کو عام کرنے، برطانوی مظالم کو بے نقاب کرنے اور عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ اس پورے منظرنامے میں الٰہ آباد ایک بار پھر قومی تحریک کی فکری، سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں کا مرکز بن کر سامنے آیا۔

1916 میں ڈاکٹر اینی بسنٹ اور لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک کی قیادت میں شروع ہونے والی ہوم رول تحریک نے ہندوستان کی قومی سیاست میں نئی روح پھونک دی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد ہندوستان کو برطانوی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے خود اختیاری (Home Rule) دلانا تھا، لیکن اس نے عوام میں سیاسی بیداری پیدا کر کے مکمل آزادی کی تحریک کے لیے بھی راہ ہموار کی۔ الٰہ آباد میں اس تحریک کو غیر معمولی عوامی پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہاں طلبہ، وکلا، صحافیوں اور اہلِ قلم نے ہوم رول لیگ کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب برطانوی حکومت نے اینی بسنٹ کو نظر بند کیا تو الٰہ آباد سمیت پورے ملک میں شدید احتجاج ہوا، اور رہائی کے بعد الٰہ آباد میں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا، جو اس شہر کے سیاسی شعور اور قومی وابستگی کا واضح ثبوت تھا۔

ہوم رول تحریک کے بعد جب مہاتما گاندھی ہندوستانی سیاست کے افق پر ایک موثر قومی رہنما کے طور پر ابھرے تو الٰہ آباد ان کی سیاسی سرگرمیوں کا بھی ایک اہم مرکز بن گیا۔ رولٹ ایکٹ، جلیاں والا باغ کے المناک سانحے اور ترکِ موالات و خلافت کی تحریکوں نے پورے ملک میں انگریز حکومت کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا کیا۔ الٰہ آباد کے سیاسی کارکنوں، طلبہ، ادیبوں اور صحافیوں نے ان تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا اور شہر کی فضا مکمل طور پر قومی رنگ میں رنگ گئی۔

1920 میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کے الٰہ آباد اجلاس نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت اختیار کی۔ اس اجلاس میں عدم تعاون تحریک کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا گیا، جس کے بعد یہ تحریک پورے ملک میں عوامی مزاحمت کی علامت بن گئی۔ اس فیصلے نے ہندو مسلم اتحاد کو بھی تقویت بخشی

اور پہلی مرتبہ آزادی کی جدوجہد وسیع پیمانے پر عوامی تحریک کی صورت اختیار کرگئی۔

اسی دور میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی پہلی قید کاٹی، جب کہ پنڈت موتی لال نہرو نے اپنی ذاتی رہائش آنند بھون قوم کے نام وقف کرکے اسے تحریکِ آزادی کا مستقل مرکز بنادیا۔ اس ایثار اور قومی جذبے نے ہندوستانی عوام کو یہ پیغام دیا کہ آزادی کی جدوجہد صرف تقاریر یا قراردادوں سے نہیں بلکہ عملی قربانیوں سے کامیاب ہوگی۔

اگر سیاسی تحریکوں نے عوام کو متحرک کیا تو صحافت نے ان تحریکوں کو فکری بنیاد فراہم کی۔ الٰہ آباد کی صحافت نے برطانوی اقتدار کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے، قومی شعور بیدار کرنے اور آزادی کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے میں بے مثال کردار ادا کیا۔ اس شہر سے شائع ہونے والے اخبارات محض اطلاعات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ وہ قومی مزاحمت کی آواز اور آزادی کے علمبر دار تھے۔

نومبر 1907 میں شانتی نارائن بھٹنا گر کی ادارت میں روزنامہ سوراج کا اجرا ہوا۔ اس اخبار کے قیام کا بنیادی مقصد لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ کی نظر بندی کے خلاف عوامی آواز بلند کرنا تھا، لیکن ابتدا ہی سے اس کا لہجہ برطانوی حکومت کے خلاف نہایت بیباک اور جارحانہ تھا۔ اس کے اداریوں اور مضامین نے ہندوستانیوں میں قومی غیرت اور آزادی کے جذبے کو مہمیز دی، جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے اسے مسلسل مقدمات، جرمانوں اور سنسر شپ کا نشانہ بنایا۔

جب اس اخبار میں انقلابی نوجوان خدی رام بوس کے حق میں ایک مضمون شائع ہوا تو حکومت نے مدیر کو طویل مدت کی قید کی سزا سنائی۔

(سنہا، ہرندر پرتاپ، 1953 کتاب 'بھارت کو پریاگ کی دین'، ص324)

لیکن حیرت انگیز امر یہ تھا کہ ایک مدیر کے گرفتار ہونے کے بعد دوسرا مدیر ذمہ داری سنبھال لیتا اور اخبار کی اشاعت جاری رہتی۔ یوں یکے بعد دیگرے آٹھ مدیر مقرر ہوئے اور ہر ایک نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، مگر آزادی کی آواز کو خاموش نہ ہونے دیا۔

اس سلسلے میں شائع ہونے والا وہ تاریخی اشتہار ہندوستانی صحافت کی قربانی، جرأت اور بے مثال عزم کی ایک زندہ علامت بن گیا۔

''ضرورت ہے ایسے مدیر کی جو دو خشک روٹیاں، ایک گلاس پانی اور ہر اداریے کے عوض دس سال قید قبول کرنے پر آمادہ ہو۔''

یہ اشتہار درحقیقت برطانوی استبداد کے خلاف ہندوستانی صحافت کے غیر متزلزل عزم کا اعلان تھا۔ بالآخر 1910 کے پریس ایکٹ کے تحت حکومت نے روزنامہ سوراج کو بند کردیا، لیکن اس کی صحافتی روایت آنے والی نسلوں کے لیے آزادیِ صحافت، حق گوئی اور قومی مزاحمت کی ایک روشن مثال بن گئی۔

اگر سیاسی تحریکوں نے عوام کو متحرک کیا تو صحافت نے ان تحریکوں کو فکری بنیاد فراہم کی۔ الٰہ آباد کی صحافت نے برطانوی اقتدار کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے، قومی شعور بیدار کرنے اور آزادی کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے میں بے مثال کردار ادا کیا۔ اس شہر سے شائع ہونے والے اخبارات محض اطلاعات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ وہ قومی مزاحمت کی آواز اور آزادی کے علمبر دار تھے۔

اسی صحافتی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے 1909 میں پنڈت سندر لال کی ادارت میں کرم یوگی جاری ہوا، جب کہ ابھیودے اور بھوشیہ جیسے اخبارات نے بھی قومی فکر، انقلابی شعور اور آزادی کے نظریات کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان تمام جرائد نے ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے، سامراجی مظالم کو بے نقاب کرنے اور قومی تحریک کو نظریاتی استحکام فراہم کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

(باجپئی، ڈاکٹر راجندر کماری، 1985)، مضمون 1857 سے 1942 تک کے یوگ دان، ص4)

الٰہ آباد کی صحافت کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے ادب، سیاست اور عوامی شعور کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیا۔ ادیب، شاعر، صحافی اور سیاسی کارکن ایک ہی قومی مقصد کے لیے سرگرم تھے۔ اخبارات میں شائع ہونے والی نظمیں، مضامین، طنزیہ تحریریں، اداریے اور تبصرے عوام کے دلوں میں آزادی کی ایسی تڑپ پیدا کرتے تھے جسے برطانوی حکومت اپنے تمام تر جبر کے باوجود ختم نہ کرسکی۔

اسی سیاسی اور صحافتی ماحول نے آگے چل کر اکبر الٰہ آبادی، فراق گورکھپوری، نرالا، مہادیوی ورما، ترقی پسند ادیبوں اور دیگر اہلِ قلم کو ایک ایسی فکری فضا فراہم کی جس میں ادب براہِ راست قومی تحریک کا ترجمان بن گیا۔ چنانچہ الٰہ آباد میں صحافت اور ادب دو الگ شعبے نہیں تھے بلکہ ایک ہی قومی شعور کے دو موثر اظہار تھے، جنھوں نے آزادی کی تحریک کو عوامی سطح پر مقبول، مضبوط اور پائیدار بنانے میں تاریخی کردار ادا کیا۔

الٰہ آباد یونیورسٹی، آنند بھون، سوراج بھون، قومی اخبارات، ادبی انجمنیں، مشاعرے اور علمی مجالس نے مل کر ایک ایسا فکری ماحول تشکیل دیا جس میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادیبوں نے آزادی کو اپنی تخلیقی زندگی کا بنیادی موضوع بنا لیا۔ یہاں ادب محض حسن و عشق کی روایت تک محدود نہ رہا بلکہ قومی آزادی، سماجی انصاف، تہذیبی خودمختاری اور استعماری مزاحمت کا ترجمان بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ الٰہ آباد کی ادبی روایت ہندوستان کی قومی تحریک کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

1857 کے بعد جب برطانوی حکومت نے ہندوستان میں سخت گیر پالیسیاں نافذ کیں اور سیاسی اظہار پر پابندیاں عائد کیں تو اہلِ قلم نے استعارے، علامت، طنز اور مزاح کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اسی فضا میں لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کا ظہور ہوا، جنھوں نے اردو شاعری کو استعمار مخالف فکر کا ایک موثر ذریعہ بنا دیا۔

اکبر الٰہ آبادی کا کردار تحریکِ آزادی میں ایک منفرد ثقافتی محافظ کا تھا۔ وہ صرف برطانوی سیاسی اقتدار کے مخالف نہیں تھے بلکہ اس تہذیبی اور ذہنی غلامی کے بھی شدید ناقد تھے جسے انگریز ہندوستانی معاشرے پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ سیشن جج کے منصب پر فائز تھے، اس لیے براہِ راست سیاسی سرگرمیوں میں

حصہ لینا ان کے لیے ممکن نہ تھا، لیکن ان کے قلم نے وہ کام انجام دیا جو بہت سے سیاسی خطابات بھی نہ کر سکے۔ انھوں نے طنز و مزاح کو استعمار کے خلاف ایک موثر فکری ہتھیار میں تبدیل کر دیا۔

مثلاً وہ کہتے ہیں۔

غافل نہ ہو اصولِ ترقی سے ایک دم
غوغا ہے چار سو پٹ دی وال ان دی نیٹ کا
اکبر کو غرض فخر مآثر سے ہے اپنے
چرچا نہیں کچھ اس کو کمیٹی و بجٹ کا

ڈاکٹر محمد حسن اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اکبر بظاہر ماضی پرست نظر آتے ہیں، لیکن ان کا شعور گہرا سیاسی تھا اور انھوں نے برطانوی سامراج کے ثقافتی حملے کو سب سے پہلے بھانپا تھا۔''

(اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ، ص20)

یہ وہی زمانہ تھا جب مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہندوستان کی قومی تحریک نئی منزلوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اکبر الہ آبادی نے گاندھی جی کی شخصیت، قیادت اور عوامی مقبولیت کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ ان کی جدوجہد کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ بعد میں ان کی اس نوعیت کی نظموں اور قطعات کو 'گاندھی نامہ' کے عنوان سے یکجا کیا گیا۔

اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے
طبع گاندھی گورمنٹ کو برہم نہ کرو
ہاتھ پائی ہے شب وصل کی کچھ غم نہ کرو
بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر الہ آبادی کی شاعری نے عوام کو یہ احساس دلایا کہ آزادی کی جنگ صرف میدانِ کارزار میں نہیں بلکہ فکر، تہذیب اور زبان کے محاذ پر بھی لڑی جا رہی ہے۔ اسی لیے ان کا یہ شعر آزادی کے متوالوں کی زبان پر رہتا تھا۔

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

یہ شعر اس حقیقت کا مظہر ہے کہ الہ آباد کی صحافت اور ادب نے مل کر قومی تحریک کو نظریاتی استحکام بخشا۔

اسی ادبی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے الہ آباد یونیورسٹی میں تدریس

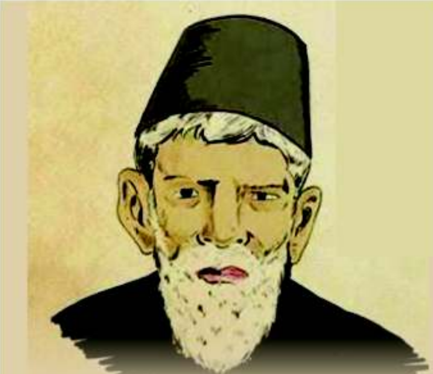

اکبر الہ آبادی کی شاعری نے عوام کو یہ احساس دلایا کہ آزادی کی جنگ صرف میدانِ کارزار میں نہیں بلکہ فکر، تہذیب اور زبان کے محاذ پر بھی لڑی جا رہی ہے۔

کے ساتھ ساتھ قومی شعور کی آبیاری میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ وہ خود تحریکِ عدم تعاون کے دوران 1920 میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ ان کی شاعری میں انسانی آزادی، وطن دوستی اور ظلم کے خلاف احتجاج نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً۔

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
میری صدا ہے گل شمع شام آزادی
سنا رہا ہوں دلوں کو پیام آزادی
لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے
اچھل رہا ہے زمانے میں نام آزادی

فراق کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اعجاز حسین اور سید احتشام حسین نے بھی اپنی تنقیدی تحریروں کے ذریعے نوجوان نسل کے اندر آزادی، جمہوریت اور قومی خودمختاری کا شعور پیدا کیا۔ ان کی تحریریں محض ادبی تنقید نہیں بلکہ فکری بیداری کی دستاویزات تھیں۔

اسی ادبی ماحول میں داغ دہلوی کے ممتاز شاگرد نوح ناروی نے بھی الہ آباد کو اپنا مسکن بنایا۔ اگرچہ ان کی شاعری کلاسیکی روایت سے وابستہ تھی، لیکن ان کے کلام میں حب الوطنی اور قومی وقار کے جذبات بھی نمایاں تھے۔ اسی طرح اصغر گونڈوی نے اپنی شاعری کے ذریعے حوصلہ، استقلال اور آزادی کی آرزو کو آواز دی۔ ان کا یہ شعر اس قومی مزاج کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اردو کے ساتھ ساتھ ہندی ادب نے بھی الہ آباد میں تحریکِ آزادی کی فکری تشکیل میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ سوریا کانت ترپاٹھی نرالا، مہادیوی ورما اور سمترا نندن پنت اس ادبی فضا کے تین ایسے روشن مینار تھے جنھوں نے چھایا واد کی جمالیاتی روایت کو قومی آزادی اور انسانی وقار کے تصورات سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان کی شاعری میں رومانویت کے ساتھ ساتھ استعمار کے خلاف علامتی مزاحمت بھی پوری قوت سے جلوہ گر ہوتی ہے۔

نرالا کی نظموں نے برطانوی حکومت کے معاشی استحصال اور سماجی ناانصافی کو بے نقاب کیا۔ ان کی نظمیں 'بھیکشوک' اور 'بادل راگ' اسی مزاحمتی شعور کی نمائندہ تخلیقات ہیں۔ چندر شیکھر آزاد کی شہادت کے بعد نرالا نے نوجوانوں میں حریت اور خودداری کے جذبات بیدار کرنے کے لیے متعدد نظمیں لکھیں۔ ان کی مشہور نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

जागो फिर एक बार
प्यार जगाते हुए हारे सब तारे तुम्हें
अरुण पंख तरुण किरण
खड़ी खोलती द्वार
जागो फिर एक बार।

اسی ادبی روایت کو مہادیوی ورما نے ایک نئے فکری اور سماجی شعور سے ہم آہنگ کیا۔ وہ محض ہندی ادب کی ممتاز شاعرہ ہی نہیں بلکہ ایک فعال سماجی مصلح اور قومی تحریک کی ہمدرد بھی تھیں۔ الہ آباد میں پریاگ مہیلا ودیا پیٹھ کی پرنسپل کی حیثیت سے انھوں نے خواتین میں تعلیم، خود اعتمادی، قومی شعور اور سماجی خدمت کے جذبے کو فروغ دیا۔ ان کی شاعری میں آزادی، استقلال اور انسانی وقار کا تصور نہایت لطیف مگر موثر انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کے یہ اشعار اس عزم و استقلال کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں:

पंथ होने दो अपरिचित,
प्राण रहने दो अकेला।
घेर ले छाया अमात्य, आज कज्जलं अश्रु झार में,
झुक न देगा दृग पलक में, स्वर्ण अभिलाषा का लेख।

اسی طرح ان کا یہ معروف گیت جدوجہد، استقلال اور مقصد سے وابستگی کا استعارہ بن گیا:

बांध लेंगे क्या तुझे ये मोम के बंधन सजीले?
पंथ की बाधा बनेंगे तितलियों के पर रंगीले?
विश्व का क्रंदन भुला देगी मधुप की मधुर
गुनगुन?
जाग तुझको दूर जाना।

اسی سلسلے کی ایک اور اہم شخصیت سمترا نندن پنت تھے، جنھوں نے اپنی شاعری میں فطرت، انسان دوستی اور آزادی کے تصورات کو حسین امتزاج کے ساتھ پیش کیا۔ اگرچہ ان کی شناخت بنیادی طور پر چھایا وادی شاعر کی ہے، لیکن ان کے کلام میں قومی بیداری اور انسانی آزادی کی آرزو بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ نرالا، مہادیوی ورما اور پنت نے مل کر الٰہ آباد کو ہندی ادب کا وہ مرکز بنا دیا جہاں شاعری قومی شعور کی تشکیل کا موثر وسیلہ بن گئی۔

اسی زمانے میں الٰہ آباد کی ادبی فضا ترقی پسند فکر سے بھی آشنا ہوئی۔ 1936 میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد الٰہ آباد اس تحریک کا مضبوط ترین مرکز بن کر ابھرا۔ چونکہ انجمن کا مرکزی دفتر الٰہ آباد منتقل ہو چکا تھا، اس لیے یہاں ادبی سرگرمیوں میں غیر معمولی تیزی آ گئی۔

چنانچہ 1937 میں الٰہ آباد میں اردو اور ہندی ادیبوں کی ایک مشترکہ کانفرنس منعقد ہوئی، جس کے انعقاد میں سودیشی انجمن نے اہم کردار ادا کیا۔ اس انجمن کی سکریٹری محترمہ شیام کماری نہرو تھیں، جنھیں ترقی پسند ادب سے خصوصی دلچسپی تھی۔ یہ اجلاس سودیشی نمائش کے پنڈال میں منعقد ہوا، جب کہ اس کی مجلسِ صدارت میں مولوی عبدالحق، آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی شامل تھے۔ اس کانفرنس نے اردو اور ہندی کے ادیبوں کو ایک مشترکہ قومی پلیٹ فارم پر جمع کیا اور ادب کو قومی آزادی اور سماجی اصلاح کے وسیع تر مقاصد سے وابستہ کرنے کی راہ ہموار کی۔

اس کامیاب کانفرنس کے بعد مارچ 1938 میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے ایک اور عظیم الشان ادبی اجتماع الٰہ آباد میں منعقد کیا۔ اس مرتبہ کوشش کی گئی کہ صرف اتر پردیش ہی نہیں بلکہ دیگر صوبوں سے بھی ممتاز ادیب اور شاعر شرکت کریں۔ یہ کوشش کامیاب رہی اور بہار، پنجاب، گجرات، لاہور اور دوسرے علاقوں سے بڑی تعداد میں اہلِ قلم اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔

الٰہ آباد کی ادبی روایت کا ایک نہایت اہم باب چندر شیکھر آزاد کی شہادت سے بھی وابستہ ہے۔ 27 فروری 1931 کو الفریڈ پارک میں جب برطانوی پولیس نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا تو انھوں نے طویل مقابلے کے بعد گرفتار ہونے کے بجائے اپنی آخری گولی خود پر چلا کر آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کردی۔ ان کی یہ قربانی ہندوستانی تحریک آزادی کی تاریخ میں حریت، خودداری اور ایثار کی لازوال علامت بن گئی۔

یہ اجلاس بھی سودیشی نمائش کے پنڈال میں منعقد ہوا، جب کہ اس کے مہتمم پنڈت بشمبھر ناتھ پانڈے تھے، جو اس زمانے میں انجمن کی الٰہ آباد شاخ کے جنرل سکریٹری تھے۔

اس کانفرنس میں سجاد ظہیر پہلے ہی الٰہ آباد میں موجود تھے، جب کہ لاہور سے فیض احمد فیض، لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری، جوش ملیح آبادی، آنند نارائن مُلا، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، علی گڑھ سے شاہد لطیف اور اشرف علی، بنارس سے امرت رائے، سریندر بالو پوری، گجرات سے کاکا کالیلکر اور مقامی اہلِ قلم میں اعجاز حسین، فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین اور وقار عظیم نے شرکت کی۔

الٰہ آباد کی ادبی روایت کا ایک نہایت اہم باب چندر شیکھر آزاد کی شہادت سے بھی وابستہ ہے۔ 27 فروری 1931 کو الفریڈ پارک میں جب برطانوی پولیس نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا تو انھوں نے طویل مقابلے کے بعد گرفتار ہونے کے بجائے اپنی آخری گولی خود پر چلا کر آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کردی۔ ان کی یہ قربانی ہندوستانی تحریکِ آزادی کی تاریخ میں حریت، خودداری اور ایثار کی لازوال علامت بن گئی۔
(گپتا، منمتھ ناتھ، 1985)

چندر شیکھر آزاد کی اس شہادت نے الٰہ آباد کے ادبی حلقوں پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں نے انھیں قومی ہیرو کے طور پر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ خصوصاً ہندی شاعروں نے انھیں آزادی، قربانی اور قومی غیرت کی علامت بنا کر اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اس طرح ادب نے اس تاریخی واقعے کو عوامی حافظے کا مستقل حصہ بنا دیا۔

تحریکِ آزادی کے آخری مرحلے میں 1942 کی بھارت چھوڑو تحریک نے پورے ملک کی طرح الٰہ آباد میں بھی زبردست عوامی بیداری پیدا کی۔ 8 اگست 1942 کو مہاتما گاندھی کی تاریخی اپیل کے فوراً بعد شہر میں احتجاجی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔ قومی رہنماؤں کی گرفتاریاں اس تحریک کو روک نہ سکیں بلکہ طلبہ، مزدور، کسان اور عام شہری خود میدانِ عمل میں آ گئے۔

خصوصاً الٰہ آباد یونیورسٹی کے طلبہ نے مسلسل جلوس نکالے، قومی پرچم لہرایا اور برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔ سیدا آباد، کچہری اور دیگر مقامات پر پولیس کی فائرنگ سے متعدد طلبہ، کسان اور عام شہری شہید ہوئے، لیکن عوام کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ سرکاری دفاتر پر قبضہ کرنا، کانگریسی پرچم لہرانا اور مواصلاتی نظام کو مفلوج کرنا اس عوامی مزاحمت کی نمایاں صورتیں تھیں۔

اسی دوران سرکاری افسر امیر رضا نے پولیس کی بلااشتعال فائرنگ کے خلاف احتجاجاً اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ ان کا یہ اقدام اس امر کا ثبوت تھا کہ برطانوی حکومت کی ظالمانہ پالیسیوں سے صرف عوام ہی نہیں بلکہ بعض سرکاری اہلکار بھی شدید اختلاف رکھتے تھے۔

ان تمام تاریخی شواہد سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ تحریکِ آزادی میں الٰہ آباد کی مرکزیت محض سیاسی یا انتظامی نوعیت کی نہ تھی، بلکہ اس کی اصل طاقت اس کی علمی، ادبی، صحافتی اور تہذیبی روایت میں مضمر تھی۔ یہاں کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، اساتذہ، طلبہ اور سیاسی رہنماؤں نے مشترکہ طور پر ایسا فکری ماحول پیدا کیا جس نے آزادی کی تحریک کو نظریاتی استحکام، اخلاقی جواز اور عوامی وسعت عطا کی۔

جملہ حقیقت کی طرف مورخ تارا چند نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''الٰہ آباد بیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی اور فکری سرگرمیوں کا ایک مرکز تھا جہاں قومی تحریک کے بڑے فیصلے تشکیل پاتے تھے۔'' (ترجمہ)

(History of the Freedom Movement of India, Tarachand.)

■

Dr. Mohd Shahid Khan
Govt. Teacher, Govt Inter College
Fatehpur- 212601 (UP)
Mob.: 8545941850
Email: shahidonly8@gmail.com

تحریکِ آزادی میں مسلم خواتین کی فکری تشکیل اور مہاتما گاندھی

طوبیٰ ادریس

تحریکِ آزادیِ ہند ایک ہمہ گیر قومی عمل تھا، جس نے برصغیر کے سماجی، سیاسی اور فکری ڈھانچوں کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ اس جدوجہد کی تاریخ محض سیاسی کشمکش تک محدود نہیں بلکہ یہ اجتماعی شعور، مزاحمت اور قومی بیداری کی ایک مربوط داستان ہے۔ اس ضمن میں مہاتما گاندھی کا یہ قول کہ ''قومی جہدِ آزادی کی تاریخ ہندوستانی خواتین کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی'' ایک بنیادی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ خواتین، بالخصوص مسلم خواتین، اس تحریک کا ایک ناگزیر جزو تھیں۔

مسلم خواتین کی شرکت کو ایک منظّم فکری اور سماجی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے، کیونکہ یہ محض وقتی یا جذباتی وابستگی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ایک تدریجی فکری تشکیل کا مظہر تھی۔ ان خواتین کی ایک بڑی تعداد تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتی تھی، جس نے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور قومی تقاضوں کو شعوری طور پر سمجھا اور قبول کیا۔ ان کی فکری ساخت میں گاندھیائی نظریات خصوصاً عدمِ تشدد، قومی یکجہتی، عوامی خدمت اور سماجی اصلاح نے نمایاں کردار ادا کیا۔ مہاتما گاندھی نے نہ صرف نظری سطح پر رہنمائی فراہم کی بلکہ خطوط، ذاتی ملاقاتوں اور تنظیمی سرگرمیوں کے ذریعے ان کی عملی تربیت بھی کی، جس کے اثرات ان کی سیاسی و سماجی فعالیت میں واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

مزید برآں، یہ خواتین انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے وابستہ ہوکر قومی تحریک کے مختلف پہلوؤں میں فعال رہیں۔ ان کی سرگرمیوں میں عوامی جلسوں میں شرکت، ولایتی اشیا کے بائیکاٹ، شراب کی دکانوں کے خلاف احتجاج اور عوامی رابطہ مہمات شامل تھیں۔ ان عملی اقدامات کے ساتھ ساتھ انھوں نے قید و بند کی صعوبتوں کو بھی برداشت کیا، جو ان کے عزم اور نظری وابستگی کی دلیل ہے۔ ان کی جدوجہد کے پس منظر میں ایک واضح فکری جہت کارفرما تھی، جس میں گاندھیائی فکر کے اثرات نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہاں چند خواتین کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو گاندھی جی اور ان کی تحریک سے متاثر تھیں اور جنھوں نے اسی اثر کے تحت تحریکِ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

آمنہ قریشی

آمنہ قریشی برصغیر کی ان ممتاز مسلم خواتین میں شمار ہوتی ہیں جن کی فکری و عملی تشکیل براہِ راست تحریکِ آزادی کے انقلابی ماحول میں گاندھی جی کے زیرِ سرپرستی ہوئی۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئیں جہاں حب الوطنی، ایثار اور قربانی زندگی کے بنیادی اصول تھے۔ ان کے والد امام عبدالقادر، جو جنوبی افریقہ میں مذہبی خدمات کے باعث امام صاحب کے نام سے معروف تھے، عربی گھوڑوں کے ایک وسیع اور کامیاب کاروبار کے مالک تھے اور ایک متمول زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن قومی جدوجہد کے تقاضے نے انھیں اس آسائش سے دستبردار ہونے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف اپنا کاروبار ترک کیا بلکہ سادگی اور خدمت پر مبنی زندگی اختیار کرتے ہوئے عملی طور پر گاندھی جی کے ساتھ تحریکِ آزادی کا حصہ بن گئے۔ اسی سلسلے میں جب مہاتما گاندھی نے جوہانسبرگ چھوڑ کر فونکس آشرم میں قیام اختیار کیا تو آمنہ قریشی کے والد نے بھی ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے اہلِ خانہ سمیت وہاں منتقل ہو گئے۔ اس وقت آمنہ قریشی کم عمر تھیں اور اسی سادہ، محنت طلب اور اصولی ماحول میں ان کی ابتدائی تربیت ہوئی۔ بعد ازاں 1961 میں یہ خاندان کوچرب آشرم پہنچا، جہاں آمنہ کی عمر بمشکل سات برس تھی۔ اگلے سال ہی 1971 میں امام صاحب اپنے خاندان سمیت سابرمتی آشرم منتقل ہوگئے، جو گاندھیائی فکر و عمل کا مرکز تھا۔

سابرمتی آشرم کی زندگی نہایت منظم، سادہ اور اصولوں کی سخت پابندی پر مبنی تھی، جہاں مذہب وملت کی ہر تفریق سے بالاتر ہو کر سب کے لیے یکساں ضوابط نافذ تھے۔ اسی ماحول میں آمنہ قریشی کی شخصیت پروان چڑھی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئیں، ان کی خوش مزاجی، ذہانت اور جذبِ خدمت نمایاں ہوتا گیا، اور وہ آشرم کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے لگیں۔ چونکہ آشرم میں ان کے خاندان کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی، جہاں تحریکِ آزادی کے سرکردہ رہنما اور مجاہدین آتے رہتے تھے۔ ان شخصیات سے مسلسل روابط اور ان کے خیالات سے شناسائی نے آمنہ قریشی کے ذہن کو جلا بخشی اور ان کے اندر حب الوطنی اور خدمتِ قوم کا مضبوط شعور پیدا کیا۔ اس ماحول نے نہ صرف ان کی ذہنی تربیت کی بلکہ انھیں زندگی کا ایک واضح نصب العین بھی عطا کیا۔

مہاتما گاندھی کی قربت اور براہِ راست رہنمائی نے بھی ان کی فکری تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا، یہاں تک کہ وہ انھیں اپنی حقیقی بیٹیوں کی مانند عزیز رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے جب مئی 1933 میں ان کی شادی غلام رسول قریشی سے ہوئی تو اس موقع پر شادی کا دعوت نامہ مہاتما گاندھی کی جانب سے بھیجا گیا اور ہندو رسم و رواج کے مطابق کنیا دان بھی انھوں نے ہی انجام دیا، جو اس بات کی علامت ہے کہ آمنہ قریشی کو ان کی سرپرستی اور قربت کس قدر حاصل تھی۔

گاندھی جی نہ صرف ان کی عمومی تربیت پر توجہ دیتے تھے بلکہ ان کی تعلیم و نشوونما کے حوالے سے بھی خاص فکر مند رہتے تھے۔ چونکہ آشرم کی مصروف اور محنت طلب زندگی کے باعث آمنہ کو باقاعدہ اسکولی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا، جس کا انھیں گہرا احساس تھا۔ انھوں نے اس محرومی کا اظہار گاندھی جی کے سامنے کیا، جس پر گاندھی جی نے نہایت شفقت، بصیرت اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ان کی رہنمائی کی۔ گاندھی جی نے اپنے مکتوب میں آمنہ کی صاف گوئی کو سراہتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا کہ آشرم کے بچوں کی تعلیم پر مطلوبہ توجہ نہ دی جا سکی اور اس کمی میں اپنی ذمہ داری کو بھی تسلیم کیا۔ تاہم انھوں نے اس صورتِ حال کو اصلاح کی جانب لے جاتے ہوئے آمنہ قریشی کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی اور اس کے لیے عملی امکانات بھی فراہم کیے۔ انھوں نے بھاؤ نگر اور امریلی جیسے مقامات کے تعلیمی اداروں کا ذکر کرتے ہوئے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہاں انھیں بہتر تعلیم اور خصوصی توجہ حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے خطوط میں آمنہ کو اردو سیکھنے کے انتظام پر بھی زور دیا، جو ان کی شخصیت سازی میں ان کی دلچسپی کا واضح ثبوت ہے۔

آمنہ قریشی کو اگرچہ رسمی اور باقاعدہ اسکولی تعلیم کا زیادہ موقع میسر نہ آسکا، تاہم آشرم کی زندگی کی عملی تربیت نے ان کی شخصیت کو اس انداز میں سنوارا کہ وہ

مہاتما گاندھی کی قربت اور براہ راست رہنمائی نے بھی ان کی فکری تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا، یہاں تک کہ وہ انہیں اپنی حقیقی بیٹیوں کی مانند عزیز رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے جب مئی 1933میں ان کی شادی غلام رسول قریشی سے ہوئی تو اس موقع پر شادی کا دعوت نامہ مہاتما گاندھی کی جانب سے بھیجا گیا اور ہندو رسم و رواج کے مطابق کنیا دان بھی انہوں نے ہی انجام دیا، جو اس بات کی علامت ہے کہ آمنہ قریشی کو ان کی سرپرستی اور قربت کس قدر حاصل تھی۔

آزادیِ وطن کی جدوجہد کے لیے ہمہ وقت تیار رہیں۔ یہ تربیت محض نظری نہیں بلکہ عملی، اخلاقی اور فکری بنیادوں پر استوار تھی، جس نے ان کے اندر ایثار، صبر اور استقامت جیسی صفات کو راسخ کیا۔ چنانچہ جب ڈانڈی مارچ کے موقع پر تحریکِ آزادی ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی تو یہ وہ لمحہ تھا جب اس تربیت کی حقیقی معنویت سامنے آئی۔ اس دور میں مہاتما گاندھی نے اپنے رفقا اور آشرم کے افراد سے غیر معمولی قربانیوں کی توقع رکھی اور آمنہ قریشی کا خاندانی پس منظر اس معیار پر پورا اترتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے والد نے علالت کے باوجود ستیہ گرہ کی قیادت میں حصہ لیا اور شدید جسمانی و ذہنی اذیتوں کا پامردی سے مقابلہ کیا، جب کہ ان کے شوہر غلام رسول قریشی بھی ان ابتدائی دستوں میں شامل تھے جو اس تحریک کے آغاز سے قبل ہی روانہ کیے گئے اور بعد ازاں گرفتار ہو کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ اس پس منظر میں آمنہ قریشی کے اندر بھی جذبِ حریت پوری شدت کے ساتھ موجزن تھا اور وہ خود بھی عملی طور پر اس جدوجہد میں شریک ہونے کی خواہاں تھیں۔ تاہم اس مرحلے میں مہاتما گاندھی نے خواتین کی شرکت کے حوالے سے ایک محتاط حکمتِ عملی اختیار کی اور آمنہ قریشی کو صبر و تحمل کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی تلقین کی۔ ان کے مکتوبات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ آمنہ کے جذبے سے بخوبی آگاہ تھے، مگر ساتھ ہی انھوں نے انھیں یہ احساس دلایا کہ قومی خدمت کا دائرہ صرف میدانِ احتجاج تک محدود نہیں بلکہ گھریلو اور معاشرتی ذمہ داریوں کی انجام دہی بھی اسی جدوجہد کا حصہ ہے، خصوصاً اس زمانے میں جب وہ زچگی کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

CHI.AMINA,

I have your letter. I hear from Imam Saheb that you have become impatient to go to jail. That is not proper, however. When God wills that you should go to jail, you will get an opportunity without seeking it. It is enough that you yourself are ready. Till that time comes, look after the children. Preserve good health and do whatever service you from home. It is possible in this struggle to serve even from home. It is enough that you have shed fear

BAPU from Blessings

گاندھی جی کی یہ رہنمائی ایک مربی اور مدبر قائد کی حیثیت سے ان کی بصیرت کو ظاہر کرتی ہے، جو افراد کی انفرادی کیفیت اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں مناسب کردار ادا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ بعد ازاں جب حالات نے اجازت دی اور خواتین کو بھی

تحریک میں کھل کر حصہ لینے کا موقع ملا تو آمنہ قریشی نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ عملی میدان میں قدم رکھا۔ انھوں نے دیگر خواتین کے ساتھ مل کر شراب اور ولایتی کپڑوں کی دکانوں کے خلاف احتجاج میں حصہ لیا، جس کے نتیجے میں انھیں گرفتار کیا گیا اور قید کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ان کی یہ استقامت اور جرأت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آشرم کی تربیت اور گاندھیائی فکر نے ان کی شخصیت میں ایک غیر معمولی پختگی اور عزم پیدا کر دیا تھا۔

مزید برآں، بعد کے زمانے میں جب آشرم کی تنظیمِ نو کی گئی تو آمنہ قریشی کو اس کے اندرونی نظم ونسق کی ذمہ داری سونپی گئی، جسے انھوں نے نہایت حسنِ تدبیر اور خلوص کے ساتھ انجام دیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے بچوں بلکہ دیگر بچوں کی بھی تربیت ایک شفیق ماں کی طرح کی، جو ان کی شخصیت کے تربیتی اور اخلاقی پہلو کو نمایاں کرتی ہے۔

اس طرح آمنہ قریشی کی زندگی اس امر کی بھرپور عکاسی کرتی ہے کہ کس طرح مہاتما گاندھی کی فکری رہنمائی، عملی تربیت اور ذاتی توجہ نے ایک ایسی باشعور، باعمل اور ثابت قدم خاتون کی تشکیل کی، جو تحریکِ آزادی کے فکری و عملی دھارے میں ایک نمایاں اور موثر کردار کی حامل بن کر سامنے آئی۔

بی بی امت السلام

بی بی امتُ السلام اُن خواتین میں شمار ہوتی ہیں جو مہاتما گاندھی کی فکر سے گہرے طور پر متاثر ہوئیں اور جن کی فکری و اخلاقی تشکیل میں گاندھی جی کی براہِ راست تربیت اور رہنمائی کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ وہ ریاستِ پٹیالہ کے ایک معزز، متمول اور بااثر مسلم راجپوت خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کرنل عبدالحمید خاں ریاست کے وزیرِ مالیات کے منصب پر فائز تھے، جس سے خاندان کی سماجی حیثیت اور سیاسی اثر ورسوخ کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ ان کی ولادت موتی باغ محل جیسے شاہانہ ماحول میں ہوئی، جہاں تہذیبی شائستگی، وقار اور شعور کی فضا نے ان کی ابتدائی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی پس منظر آگے چل کر ان کے اندر خوداعتمادی، وقار اور قومی ذمہ داری کے احساس کو جلا دینے کا سبب بنا۔

امتّ السلام کی زندگی میں بنیادی تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب انھیں مہاتما گاندھی کی خودنوشت تحریر کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ مطالعہ ان کے لیے محض ایک علمی تجربہ نہیں بلکہ ایک گہری فکری اور روحانی بیداری کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ اسی بیداری نے انھیں سابرمتی آشرم تک پہنچایا، جہاں ان کی زندگی ایک نئے رخ پر گامزن ہوئی۔ یہ سفر محض مکانی تبدیلی نہ تھا بلکہ ایک داخلی، فکری اور تہذیبی انقلاب کی علامت تھا، جس میں ایک رئیس اور پردہ دار خاتون نے سادگی، خدمت اور قومی وابستگی کو اپنی زندگی کا محور بنا لیا۔

سابرمتی آشرم میں قیام کے دوران امتُ السلام کی شخصیت میں جو تبدیلیاں آئیں، وہ مہاتما گاندھی کی قربت اور رہنمائی کا براہِ راست نتیجہ تھیں۔ گاندھی جی نے ان کی تربیت میں کردار سازی کو بنیادی حیثیت دی اور انھیں ضبطِ نفس، صبر، سادگی اور خدمتِ خلق جیسے اوصاف سے آراستہ کیا۔ ان کی فطری بے قراری کو انھوں نے تدریجاً استقامت اور توازن میں تبدیل کیا، جس سے ان کی شخصیت میں فکری پختگی اور عملی سنجیدگی پیدا ہوئی۔ ان کے مابین قائم تعلق محض ایک سیاسی یا تنظیمی رشتہ نہ تھا بلکہ اعتماد، شفقت اور فکری سرپرستی پر مبنی ایک گہرا تعلق تھا، جس میں گاندھی جی انھیں اپنی بیٹی کے طور پر مخاطب کرتے تھے۔ اس رشتے نے امتُ السلام کی عملی زندگی کو ایک نئی سمت عطا کی۔ خدمت اب ان کے نزدیک محض ہمدردی کا جذبہ نہ رہی بلکہ ایک شعوری اور اخلاقی ذمہ داری بن گئی۔ ہریجنوں کی فلاح، دیہی اصلاح، خواتین کی تربیت اور ہندو مسلم اتحاد کے فروغ کے لیے کام کرنا ان کے لیے وقتی جذبہ نہیں بلکہ ایک منظم اور سوچا سمجھا فریضہ تھا۔ گاندھیائی فکر نے ان کے اندر یہ شعور راسخ کیا کہ حقیقی انقلاب خارجی تبدیلی سے پہلے داخلی اصلاح سے جنم لیتا ہے، اور یہی اصول ان کی عملی زندگی کا محور بن گیا۔

گول میز کانفرنس کے بعد امتُ السلام نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا بنیادی نصب العین بنا لیا۔ یہی نصب العین ان کے تمام فیصلوں، عملی اقدامات اور قربانیوں کی اساس قرار پایا۔ سندھ کے فسادات کے دوران ان کا جان ہتھیلی پر رکھ کر متاثرہ علاقوں میں جانا اس بات کی واضح مثال ہے کہ انھوں نے گاندھیائی اصولوں بالخصوص سچائی اور عدمِ تشدد کو کس حد تک اپنی عملی زندگی میں جذب کر لیا تھا۔ ان کے لیے یہ جدوجہد محض سیاسی سرگرمی نہ تھی بلکہ ایک اخلاقی فریضہ تھی، جسے وہ پوری ذمہ داری اور اخلاص کے ساتھ نبھاتی رہیں۔ گاندھی جی نے سندھ بھیجتے وقت پیر عبداللہ ہارون رشید کو بی بی امت السلام کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا:

گول میز کانفرنس کے بعد امت السلام نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا بنیادی نصب العین بنا لیا۔ یہی نصب العین ان کے تمام فیصلوں، عملی اقدامات اور قربانیوں کی اساس قرار پایا۔ سندھ کے فسادات کے دوران ان کا جان ہتھیلی پر رکھ کر متاثرہ علاقوں میں جانا اس بات کی واضح مثال ہے کہ انھوں نے گاندھیائی اصولوں بالخصوص سچائی اور عدمِ تشدد کو کس حد تک اپنی عملی زندگی میں جذب کر لیا تھا۔

"From her childhood she has been devoted to the cause of Hindu-Muslim unity. The murders that are taking place in Sind are worrying me no doubt, but Amtul Salaam also is worried. I am, therefore, sending her to you on the strength of our relations during the Khilafat movement. I think you can play a big role in stopping these murders. I am not thinking at the moment of the political aspect. It is a question of humanity. Behn Amtul Salaam does not

know anything of politics and is not interested in it .She is a staunch Muslim. She is never irregular in reading the Koran. When she is not ill she observes the Ramadan strictly .She has been silently serving a good many Muslims .She is brave .She intends to lay down her life if these murders are not stopped ,and I have fully encouraged her to do so .I hope that you will not misunderstand her or me in this .connection .I do not have with me a stauncher or nobler man or woman than she .And when she wishes to sacrifice her life to save the honour of Islam and serve the Hindus ,I consider it my duty to give her my blessings ."

گاندھی جی نے امت السلام کو بھی خط لکھا تھا کہ:

''جیوں جیوں تیرا خیال کرتا ہوں تیری قدر بڑھتی ہے مجھے اچھا لگتا ہے۔ تجھے تیرا کام اپنی ذمہ داری پر کرنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے تو یہی مشن لے کر میرے پاس آئی تھی اور یہی مشن لے کر سندھ گئی تھی اور جائے گی۔ سندھ کے مسلمانوں کو تجھے بتانا ہے کہ سیاسی اور دوسرے معاملات میں خون خرابے، زبردستی یا جھوٹ سے انصاف نہیں ملتا۔ تیرا سندھ جانا اور جان تک کی پروا نہ کرنا صرف قتل وغارت گری روکنے کے لیے ہے۔ یہ میرا مقصد تجھے بھیجنے میں تھا اور اب بھی ہے۔ خدا تیرا راستہ صاف کرے۔ وہی ایک رہنما ہے۔ اور تو، میں سب اس کے بندے ہیں باقی سب جھوٹ ہے۔ باپو کی کروڑوں دعائیں''

سندھ میں بی بی امتؐ السلام کی موجودگی محض علامتی نہ تھی بلکہ وہ عملی طور پر اُن دشوار گزار علاقوں تک پہنچیں جہاں عام لوگوں کی رسائی ممکن نہ تھی۔ گھنے جنگلات، سنسان راستوں اور خوف زدہ بستیوں میں گھوڑوں پر سوار ہو کر جانا اور قتل و غارت کے خاتمے میں کردار ادا کرنا اس غیر معمولی اخلاقی جرات اور اعتماد کا مظہر تھا، جو انھیں مہاتما گاندھی کی صحبت اور رہنمائی سے حاصل ہوا تھا۔ اسی طرح نواکھالی فسادات کے دوران بھی وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ رہیں اور اتحادِ ملت کے فروغ کے لیے روزہ رکھ کر ان ہی کے ہاتھوں افطار کیا۔ مسلم خواتین میں ان کی تعمیری سرگرمیوں نے ایک نئے شعور کو جنم دیا اور عورت کے سماجی و اخلاقی کردار کو نمایاں کیا، جو دراصل گاندھیائی فلسفہ خدمت کا عملی اظہار تھا۔ مزید برآں، مہاتما گاندھی نے امتّ السلام کی محض حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ ان کی مسلسل تربیت کے ذریعے ان کے جوش کو ضبط، جذبات کو توازن اور قربانی کو حکمت میں ڈھالا، جس کے نتیجے میں ان کی شخصیت میں استقامت، عاجزی اور سنجیدگی پیدا ہوئی۔ گاندھی جی کی شہادت کے بعد بھی انھوں نے ان کے مشن کو جاری رکھا۔ مغویہ عورتوں کی بازیابی، سرحد پار سفر اور پاکستان تک جانا اسی فکر کا تسلسل تھا، جس میں انسانیت کو سیاست پر فوقیت حاصل ہے۔ یوں ان کی پوری زندگی اس امر کی روشن دلیل ہے کہ وہ گاندھیائی نظریات کو محض تسلیم کرنے والی نہیں بلکہ انھیں عملی طور پر جینے والی ایک باعمل شخصیت تھیں۔

تحریکِ آزادی کے ایک اہم مرحلے، یعنی ڈانڈی مارچ کے دوران، امینہ طیب کی خدمات کو ایک منظّم اور نمایاں جہت اس وقت حاصل ہوئی جب مہاتما گاندھی نے انھیں ان کی بیٹی ریحانہ طیب کے ہمراہ گجراتی خواتین کی ایک اہم کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔

یوں بی بی امتؐ السلام کی حیات اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ کس طرح ایک متمول اور روایت پسند پس منظر رکھنے والی خاتون، فکری بیداری، اخلاقی تربیت اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی کے زیرِ اثر ایک ایسی باشعور، باعمل اور انسان دوست شخصیت میں ڈھل سکتی ہے، جس کی زندگی خدمت، اتحاد اور قومی ذمہ داری کا ایک مربوط اور عملی نمونہ بن کر سامنے آتی ہے۔

امینہ طیب

امینہ طیب بھی اُن ممتاز خواتین میں شمار ہوتی ہیں جو مہاتما گاندھی کی فکر سے گہرے طور پر متاثر ہوئیں اور جن کی فکری و عملی تشکیل میں گاندھیائی تربیت کے اثرات نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ گجرات کے قومی رہنما عباس طیب کی اہلیہ اور برصغیر کے نامور سیاسی و سماجی رہنما بدرالدین طیب کی صاحبزادی تھیں۔ اس معزز اور باوقار خاندانی پس منظر نے ان کی شخصیت میں ابتدائی ہی سے قومی شعور، خدمتِ خلق اور اجتماعی ذمہ داری کے احساس کو راسخ کر دیا۔

انھوں نے ابتدا ہی سے انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے وابستگی اختیار کی اور تحریکِ آزادی میں نہ صرف اپنے شوہر کی جدوجہد میں ثابت قدمی کے ساتھ معاونت کی بلکہ خود بھی ایک فعال اور باعمل کارکن کے طور پر سامنے آئیں۔ ان کی یہ سرگرمیاں محض جذباتی وابستگی تک محدود نہ تھیں بلکہ ان میں تنظیمی فہم، سیاسی بصیرت اور عملی شرکت کا واضح امتزاج پایا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کے مکتوبات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے عباس طیب کی جدوجہد کے ضمن میں ان کی اہلیہ اور بیٹیوں کے کردار کو قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا، جو امینہ طیب جی کی موثر شرکت کا بین ثبوت ہے۔

تحریکِ آزادی کے ایک اہم مرحلے، یعنی ڈانڈی مارچ کے دوران، امینہ طیب کی خدمات کو ایک منظّم اور نمایاں جہت اس وقت حاصل ہوئی جب مہاتما گاندھی نے انھیں ان کی بیٹی ریحانہ طیب کے ہمراہ گجراتی خواتین کی ایک اہم کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ کانفرنس دراصل خواتین کو قومی جدوجہد میں فعال اور منظّم کردار ادا کرنے کے لیے تیار کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش تھی، جس میں امینہ طیب نے نہایت بصیرت، سنجیدگی اور قائدانہ صلاحیت کے ساتھ شرکت کی۔ اس کانفرنس میں شراب اور ولایتی کپڑوں کے بائیکاٹ کو تحریک کا بنیادی جزو قرار دیا گیا۔ مزید برآں، کھادی کے فروغ کو قومی خود انحصاری کی علامت کے طور پر اپناتے ہوئے خواتین نے سوت کاتنے، اس کی ترویج کرنے اور سماجی سطح پر اس رجحان کو عام کرنے کا عہد کیا۔ خط میں مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:

MY DEAR RAIHANA,

I have your letter .I would like you , Mother and others to attend here on Sunday .I am holding a conference of Gujarat women for the purpose of discussing the propriety and possibility of their tackling the problem of drink and foreign cloth .

ان مقاصد کے حصول کے لیے تشکیل دی گئی پانچ رکنی مجلسِ عاملہ کی صدارت امینہ طیب جی کے سپرد کی گئی، جو ان کی قائدانہ صلاحیتوں اور گاندھی جی کے اعتماد کا واضح مظہر ہے۔ بعد ازاں، جب اس تحریک کو مزید استحکام اور تنظیم درکار ہوئی تو مہاتما گاندھی نے امینہ طیب جی سے براہِ راست رجوع کیا اور انھیں اہم قومی امور میں شریک کیا۔ وائسرائے کے نام خطوط پر دستخط جیسے حساس اور ذمہ دارانہ فرائض ان کے سپرد کیے گئے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک بااعتماد، سنجیدہ اور فعال قیادت کے طور پر تسلیم کی جا چکی تھیں۔

یوں امینہ طیب جی کی حیاتِ عملی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ ایک باوقار خاندانی پس منظر، گاندھیائی فکر سے وابستگی اور عملی جدوجہد کے امتزاج نے ایک ایسی باشعور، منظم اور باعمل خاتون کو جنم دیا، جس نے تحریکِ آزادی میں خواتین کے کردار کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ اسے ایک بامعنی اور موثر سمت بھی عطا کی۔

بیگم سکینہ طیب

بیگم سکینہ لقمانی بھی اُن باوقار اور باہمت مسلم خواتین میں شمار ہوتی ہیں، جو مہاتما گاندھی کی فکر سے اثر پذیر ہو کر تحریکِ آزادی کے عملی منظرنامے میں نمایاں ہوئیں، اور جن کی جدوجہد میں گاندھیائی اصولِ عدم تشدد، استقامت اور قومی یکجہتی کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ جسٹس بدرالدین طیب کی صاحبزادی تھیں اور ان کے شوہر سر لقمانی ممبئی کے معروف طبیب تھے۔ اس معزز خاندانی پس منظر نے ان کے اندر ابتدائی ہی سے قومی احساس اور جرأتِ کردار کو پروان چڑھایا۔

تحریکِ آزادی کے دوران شراب اور ولایتی کپڑوں کے بائیکاٹ کی مہم میں بیگم سکینہ لقمانی نے نہایت فعال اور موثر شرکت کی۔ گجراتی خواتین کی جانب سے وائسرائے کو ارسال کیے گئے خط پر ان کے دستخط اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ محض تماشائی نہ تھیں بلکہ اس تحریک کی صفِ اوّل کی کارکن تھیں۔ وہ دکانوں کے قریب پُرامن دھرنا دے کر بیٹھتیں اور ان کی باوقار موجودگی ہی ایسی اثر انگیز تھی کہ خریدار آگے بڑھنے سے ہچکچاتے تھے۔ تاہم اس پُرامن احتجاج کو جواز بنا کر ان پر تشدد کا الزام عائد کیا گیا اور انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ضلع تھانہ کے علاقہ کرلا میں ان پر مقدمہ قائم کیا گیا، جہاں انھیں چار ماہ قید بامشقت اور جرمانے کی سزا سنائی گئی اور عدم ادائیگی کی صورت میں مزید قید کا حکم دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر بھی کافی زیادہ تھی، چنانچہ اس سخت سزا نے ملک بھر میں شدید ردِعمل کو جنم دیا۔ ممبئی میں خواتین نے ان کے حق میں جلوس نکالا اور مہادیو باغ میں ایک اہم اجلاس منعقد ہوا، جس میں مقررین نے ان کی جرأت و استقامت کو خراجِ تحسین پیش کیا اور اس

آمنہ قریشی، بی بی امت السلام، امینہ طیب اور بیگم سکینہ لقمانی کی زندگیوں سے واضح ہوتا ہے کہ گاندھیائی فکر نے ان کے اندر خدمت، قربانی، صبر اور قومی یکجہتی جیسے اوصاف کو مستحکم کیا اور انہیں ایک منظم جدوجہد کا حصہ بنایا۔ یہ خواتین محض تحریک کا حصہ ہی نہ بنیں بلکہ اپنی بصیرت اور عزم کے باعث اس کی مؤثر نمائندہ بھی ثابت ہوئیں۔

واقعے کو قومی بیداری کی علامت قرار دیا۔ عوامی دباؤ کے نتیجے میں حکومت کو جلد ہی ان کی سزا میں تخفیف کرنی پڑی اور قید کو نسبتاً آسان بنا دیا گیا۔

بیگم سکینہ لقمانی کی سیاسی بصیرت کا ایک نمایاں اظہار اس وقت بھی دیکھنے میں آیا جب مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد انھوں نے مسلم خواتین کا ایک اہم اجلاس منعقد کیا، جس میں گاندھی جی کی فوری اور غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ اقدام اس بات کا غماز ہے کہ وہ تحریکِ آزادی کو محض ایک سیاسی جدوجہد نہیں بلکہ ایک مشترکہ قومی فریضہ سمجھتی تھیں۔ مزید برآں، مہاتما گاندھی کی شہادت کے موقع پر ممبئی میں نکالے گئے طویل جلوس کی قیادت انھوں نے اپنی ضعیف العمری کے باوجود خود سنبھالی۔ یہ عمل ان کے غیر متزلزل عزم، حوصلے اور گاندھیائی فکر سے گہری وابستگی کا بین ثبوت ہے۔

اس طرح بیگم سکینہ لقمانی کی حیاتِ عملی اس امر کی روشن مثال ہے کہ انھوں نے گاندھیائی اصولوں کو محض نظری سطح پر قبول نہیں کیا بلکہ انھیں اپنی عملی جدوجہد کا حصہ بنایا۔ ان کی شخصیت اس حقیقت کی عکاس ہے کہ تحریکِ آزادی میں مسلم خواتین نے نہ صرف بھرپور شرکت کی بلکہ اپنی استقامت، بصیرت اور جرأت کے ذریعے اس جدوجہد کو ایک ہمہ گیر قومی تحریک کی صورت دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

یوں تحریکِ آزادی کے مطالعے سے یہ پہلو نمایاں طور پر ابھرتا ہے کہ مسلم خواتین نے اس جدوجہد میں محض ضمنی نہیں بلکہ ایک فعال اور موثر کردار ادا کیا، اور ان کی اس عملی شرکت کے پسِ منظر میں ایک مضبوط فکری و اخلاقی تربیت کارفرما تھی۔ اس تناظر میں مہاتما گاندھی کی شخصیت بطور ایک اہم فکری محرک سامنے آتی ہے، جن کی رہنمائی، خطوط اور عملی اسوہ نے ان خواتین کی ذہنی تشکیل میں بنیادی اثر ڈالا۔ آمنہ قریشی، بی بی امتّ السلام، امینہ طیب اور بیگم سکینہ لقمانی کی زندگیوں سے واضح ہوتا ہے کہ گاندھیائی فکر نے ان کے اندر خدمت، قربانی، صبر اور قومی یکجہتی جیسے اوصاف کو مستحکم کیا اور انھیں ایک منظّم جدوجہد کا حصہ بنایا۔ یہ خواتین محض تحریک کا حصہ ہی نہ بنیں بلکہ اپنی بصیرت اور عزم کے باعث اس کی موثر نمائندہ بھی ثابت ہوئیں۔ مزید برآں، زہرہ انصاری، ریحانہ طیب اور فاطمہ عریضی جیسی دیگر مسلم خواتین بھی اسی فکری دھارے سے متاثر ہو کر قومی جدوجہد میں شریک رہیں، جس سے یہ بات مزید تقویت پاتی ہے کہ یہ شرکت ایک وسیع تر فکری تحریک کا نتیجہ تھی۔ اس طرح مسلم خواتین کا کردار تحریکِ آزادی میں ایک باوقار اور مستقل حیثیت رکھتا ہے، جس کی بنیاد گاندھیائی فکر، اخلاقی تربیت اور عملی رہنمائی پر قائم تھی اور جس نے اس جدوجہد کو ایک ہمہ گیر قومی تحریک بنانے میں نمایاں حصہ ادا کیا۔

■

Tuba Idrees
H-20,Opposite Haji Complex
Joga Bai, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi,110025
Mob. 9990263581
Email: Tubaidrees687@gmail.com

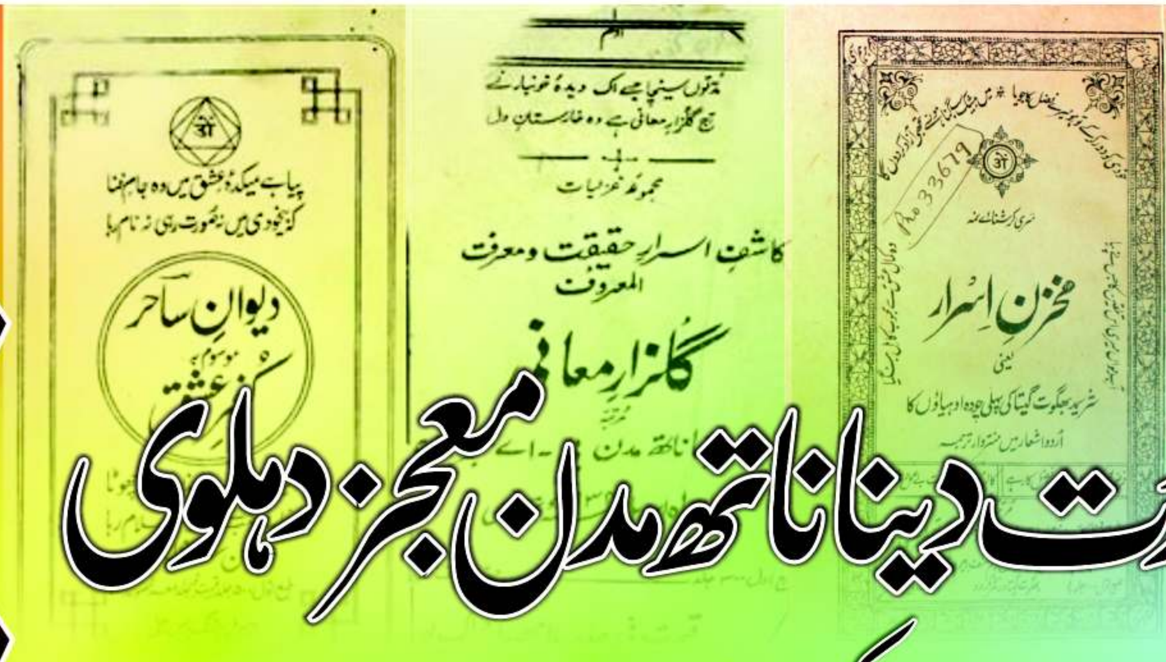

محمد سلیم پلسا رکت

پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی کی ادبی خدمات

پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی نے اردو ادب کی تاریخ میں محض تخلیقی سطح پر ہی نہیں بلکہ فکری، تہذیبی اور روحانی سطح پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کی شخصیت نہ صرف ادبی میدان میں ممتاز ہے بلکہ وہ ایک ایسے علمی و روحانی سلسلے کے نمائندہ ہیں جنھوں نے ہندوستانی فلسفے، تصوف اور اردو ادب کے درمیان ایک حسین امتزاج پیدا کیا۔

معجز دہلوی کی خدمات کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ہندو مذہبی کتابوں خصوصاً بھگوت گیتا، اشٹاوکر گیتا اور اودھوت گیتا کو اردو نظم میں منتقل کر کے ایک ایسا ادبی کارنامہ انجام دیا جو تہذیبی ہم آہنگی اور فکری اشتراک کی اعلیٰ مثال ہے۔ ان کا یہ کارنامہ محض ترجمہ نہیں بلکہ ایک تخلیقی، فنی اور روحانی بازآفرینی ہے۔

پنڈت دینا ناتھ مدن کا تعلق ایک ممتاز کشمیری برہمن خاندان سے تھا جسے دہلی میں 'مدن فیملی' کے نام سے شہرت حاصل تھی۔ یہ خاندان شروع ہی سے علم و ادب، فلسفہ اور تصوف سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ ان کے والد رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن ایک بڑے عالم تھے جو سنسکرت، فارسی اور اردو پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی تصنیف 'برہم درشن' فلسفہ الوہیت کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس علمی ماحول نے معجز دہلوی کی فکری تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ معجز دہلوی کی ادبی و فکری سمت کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مضبوط خاندانی روایت کا تسلسل ہے۔

معجز دہلوی محکمہ تعمیرات پنجاب میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ وہ بچپن سے ہی سنسکرت زبان اور اس میں شامل علمی اور ادبی خزانے سے کافی گہرا علمی شغف رکھتے تھے۔ خاص کر فلسفہ الوہیت میں۔

معجز دہلوی کا زمانہ وہ تھا جب دہلی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ یہاں اردو زبان اپنی مکمل تہذیبی و ادبی صورت میں موجود تھی۔ ہندی، فارسی اور سنسکرت کے میل جول سے ایک ایسا فکری ماحول پیدا ہوا جس میں بین المذاہب مکالمہ ممکن ہوا۔ اسی ماحول نے معجز دہلوی کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ ہندو فلسفے کو اردو زبان کے قالب میں پیش کریں۔

معجز دہلوی کی ادبی خدمات کو درج ذیل اہم شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: منظوم تراجم، تصوف اور فلسفہ کی تشریح، غزل گوئی، تہذیبی و فکری ہم آہنگی، لسانی تجربہ اور اصطلاح سازی، ترجمہ اور تخلیق کا امتزاج وغیرہ۔

ان کے یہاں ترجمہ محض لفظی منتقلی نہیں بلکہ ایک تخلیقی عمل ہے۔ ان کی سب سے بڑی فنی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے اصل مفہوم کو پوری دیانت داری کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے اسے اردو شعری روایت کے مطابق نہایت خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔ انھوں نے ہر اشلوک کو ایک مکمل شعر کی شکل میں پیش کیا، جس سے نہ صرف مفہوم کی مکمل ترسیل ممکن ہوئی بلکہ کلام کا شعری حسن بھی قائم رہا۔ زبان سادہ، رواں اور عام فہم ہے، جس کے باعث قاری بغیر کسی دقت کے معنی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اشعار میں ادبی چاشنی اور فنی لطافت بھی برقرار رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مفہوم، سادگی، روانی اور شعری حسن کو ایک ساتھ نبھانا کسی بھی مترجم کے لیے ایک بڑا فنی چیلنج ہوتا ہے، لیکن مترجم نے اس ذمہ داری کو کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ایک اشارہ مکتفی ہے مردِ عاقل کے لیے
عمر بھر تعلیم نا کافی ہے جاہل کے لیے

(پیامِ سالک ص ۷۷)

'مخزن اسرار' معجز دہلوی کی سب سے اہم تصنیف ہے، جو شریمد بھگوت گیتا کا اردو منظوم ترجمہ ہے۔ انھوں نے مخزن اسرار کے نام سے دو بار شائع کیا تھا۔ پہلی بار 1915 میں چودہ ابواب کا منظوم ترجمہ تھا اور 1930 میں مکمل اٹھارہ ابواب کا۔

بھگوت گیتا ہندو مذہب کی ایک نہایت مقدس، بااثر اور عالمگیر روحانی کتاب ہے، جسے ہندوستانی فلسفے کا نچوڑ کہا جاتا ہے۔ یہ عظیم صحیفہ رزمیہ داستان مہابھارت کا حصہ ہے اور 'بھیشم پرب' میں شامل ہے۔ اس کتاب کی بنیاد کرشن اور ارجن کے درمیان ہونے والے مکالمے پر قائم ہے، جو میدانِ جنگ میں پیش آتا

ہے۔ جب کوروکشیتر کی جنگ شروع ہونے والی ہوتی ہے تو ارجن اپنے عزیز و اقارب، اساتذہ اور دوستوں کو مخالف صف میں دیکھ کر شدید ذہنی اضطراب اور اخلاقی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر شری کرشن اس کی روحانی اور اخلاقی رہنمائی کرتے ہیں، اور یہی تعلیمات 'بھگوت گیتا' کہلاتی ہیں۔

بھگوت گیتا اٹھارہ ابواب (ادھیاؤں) اور تقریباً سات سو اشلوکوں پر مشتمل ہے۔ ہر باب انسانی زندگی کے کسی خاص روحانی یا اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کا اسلوب مکالماتی ہے، جس میں سوال و جواب کے ذریعے گہرے فلسفیانہ مسائل کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی کا 'مخزنِ اسرار' اردو ادب میں منظوم ترجمہ نگاری کا ایک منفرد اور قابلِ قدر نمونہ ہے۔ یہ محض شریمد بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ نہیں بلکہ ایک ایسا فکری اور ادبی کارنامہ ہے جس میں ہندوستانی فلسفے، اسلامی تصوف اور اردو شعری روایت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ معجز دہلوی نے اس ترجمے کے ذریعے نہ صرف گیتا کے دقیق روحانی مضامین کو اردو قالب میں منتقل کیا بلکہ انھیں عام فہم، سلیس اور دلنشیں انداز میں پیش بھی کیا۔ بھگوت گیتا جیسے دقیق متن کو ایسی زبان میں منتقل کرنا جس میں اصل مفہوم بھی محفوظ رہے اور شعری حسن بھی برقرار رہے، ایک نہایت دشوار کام تھا، مگر معجز دہلوی اس میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ معاصر ناقدین نے بھی اس خصوصیت کو سراہتے ہوئے لکھا ہے۔ 1931 میں شائع ہوا اخبار 'ریاست' میں لکھا ہے:

''اردو اشعار نہایت سلیس اور عام فہم ہیں اور اصل کتاب کے نفسِ مطلب کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔'' (مخزنِ اسرار ص 7)

یہی سادگی دراصل ان کے ترجمے کی سب سے بڑی قوت ہے۔

معجز دہلوی کی فنی مہارت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے بھگوت گیتا کے ہر اشلوک کو ایک مکمل شعر میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ یہ اسلوب نہایت مشکل تھا کیونکہ سنسکرت اشلوکوں کے مفہوم کو اردو شعر کے محدود دائرے میں سمیٹنا آسان نہیں۔ انھوں نے نہ صرف مفہوم کی حفاظت کی بلکہ شعری بندش اور

معجز دہلوی نے گیتا کے پیچیدہ فلسفیانہ مضامین کو سمجھانے کے لیے تمثیلی اور تصویری اسلوب اختیار کیا۔ انھوں نے ہر باب سے پہلے مختلف تصویری خاکے اور علامتی توضیحات شامل کیں، جن کا مقصد قاری کو روحانی مفاہیم تک رسائی دینا تھا۔انھوں نے دل، عقل، نفس، روشنی اور تاریکی جیسے عناصر کو تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا۔ مثلاً وہ دل کو حاکم، عقل کو منصف، اور محسوسات کو اہل کار قرار دیتے ہیں۔ اس اندازِ بیان سے مجرد فلسفہ ایک جیتی جاگتی کیفیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ان کے نزدیک ظاہری کائنات اور انسانی باطن کے درمیان گہرا تعلق موجود ہے۔

موسیقیت کو بھی قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ترجمہ محض لفظی ترجمہ نہیں بلکہ ایک تخلیقی بازآفرینی محسوس ہوتا ہے۔ یہ انداز اردو منظوم ترجمہ نگاری میں ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔

مخزنِ اسرار کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندو فلسفے اور اسلامی تصوف کے درمیان ایک فکری ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے۔ معجز دہلوی نے گیتا کے روحانی تصورات کو صوفیانہ اصطلاحات اور افکار کے ذریعے واضح کیا، جس سے اردو داں طبقے کے لیے ان تعلیمات کو سمجھنا آسان ہوگیا۔ انھوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ روحانی تجربات اور باطنی حقائق مختلف مذہبی روایتوں میں الگ الفاظ کے باوجود ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سنسکرت اصطلاحات کے مقابل صوفیانہ اصطلاحات پیش کیں، مثلاً:

محویت، سمادھی، وحدت، ادویت، فنا، لیہ، نفس، پران، عالم، جگت، شاہد، ساکشی وغیرہ۔

یہ تقابل محض لسانی نہیں بلکہ فکری اور روحانی نوعیت کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معجز دہلوی نہ صرف سنسکرت فلسفے سے واقف تھے بلکہ اسلامی تصوف پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

معجز دہلوی نے گیتا کے پیچیدہ فلسفیانہ مضامین کو سمجھانے کے لیے تمثیلی اور تصویری اسلوب اختیار کیا۔ انھوں نے ہر باب سے پہلے مختلف تصویری خاکے اور علامتی توضیحات شامل کیں، جن کا مقصد قاری کو روحانی مفاہیم تک رسائی دینا تھا۔ انھوں نے دل، عقل، نفس، روشنی اور تاریکی جیسے عناصر کو تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا۔ مثلاً وہ دل کو حاکم، عقل کو منصف، اور محسوسات کو اہل کار قرار دیتے ہیں۔ اس اندازِ بیان سے مجرد فلسفہ ایک جیتی جاگتی کیفیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ظاہری کائنات اور انسانی باطن کے درمیان گہرا تعلق موجود ہے۔ اسی تصور کو واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''انسان اور عالم کے درمیان کامل مشابہت ہے، چنانچہ ایک کو عالمِ صغیر اور دوسرے کو عالمِ کبیر کہا گیا ہے۔'' (مخزنِ اسرار۔ ص 25)

یہ تمثیلی انداز ان کی فکری گہرائی اور تخلیقی صلاحیت دونوں کا مظہر ہے۔

مخزنِ اسرار صرف فکری اعتبار سے ہی اہم نہیں بلکہ ادبی و فنی لحاظ سے بھی ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ اس میں کئی ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اسے اردو منظوم تراجم میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

'پیامِ سالک' دینا ناتھ مدن معجز دہلوی کی ایک اہم علمی اور ادبی تصنیف ہے، جو مہامنی اشٹاوکر کی مشہور روحانی کتاب اشٹاوکر گیتا کا اردو منظوم ترجمہ ہے۔ یہ کتاب 1932 میں شائع ہوئی اور اردو ادب میں روحانی و فلسفیانہ تراجم کے سلسلے میں ایک نمایاں اضافہ ثابت ہوئی۔ معجز دہلوی نے اس تصنیف کے ذریعے سنسکرت کی ایک نہایت دقیق اور عمیق روحانی کتاب کو اردو داں طبقے کے لیے قابلِ فہم بنایا۔

اشٹاوکر گیتا ہندوستانی فلسفے خصوصاً ادویت (غیر دوئی) کی ایک اہم کتاب ہے، جس میں راجہ جنک اور مہامنی اشٹاوکر کے درمیان سوال و جواب کے انداز میں معرفت، توحید اور حقیقتِ مطلق کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ معجز دہلوی نے اس فلسفیانہ متن کو اردو نظم کا پیرایہ عطا کر کے اسے ادبی اور روحانی دونوں اعتبار سے مؤثر بنا دیا۔

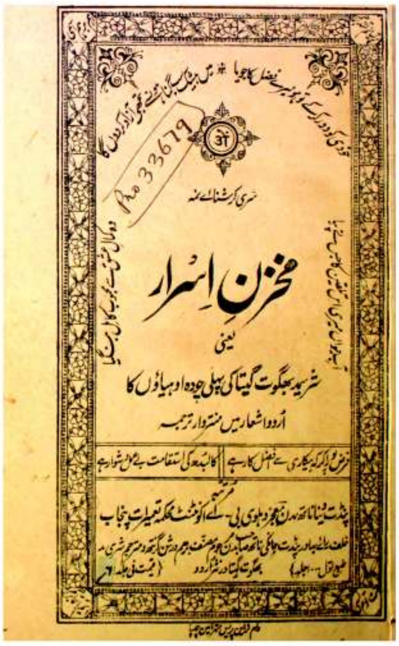

پیامِ سالک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ خالص روحانی متن کا اردو منظوم ترجمہ ہے۔ اس میں ظاہری رسوم و قیود سے زیادہ باطنی شعور، معرفتِ نفس اور حقیقتِ مطلق پر زور دیا گیا ہے۔ اشٹاوکر گیتا بنیادی طور پر انسان کو اس کی اصل روحانی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے اور دنیاوی وابستگیوں سے بلند ہو کر حق کی معرفت حاصل کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ معجز دہلوی نے اس کتاب کے ذریعے ان روحانی تعلیمات کو اردو قارئین تک پہنچایا، جو اس سے پہلے صرف سنسکرت جاننے والوں تک محدود تھیں۔ ان کے نزدیک یہ ترجمہ صرف ادبی خدمت نہیں بلکہ روحانی رہنمائی کا ذریعہ بھی تھا۔

دیباچے میں وہ خود اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'شائقینِ علمِ توحید کو اس بزرگ ہستی کی نادر اور دلکش روحانی تعلیم سے حتی المقدور آگاہ کرنا مقصود ہے۔'
(پیامِ سالک۔ص 2)

'پیامِ سالک' میں توحید، معرفتِ نفس، ترکِ خواہشات اور روحانی آزادی جیسے مضامین نہایت نمایاں ہیں۔ اشٹاوکر گیتا کے مطابق انسان کی اصل حقیقت جسم یا ذہن نہیں بلکہ خالص شعور ہے۔ جب انسان اپنی اس حقیقی شناخت کو پالیتا ہے تو وہ دنیاوی خوف، غم اور وابستگیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

یہ تعلیمات تصوف کے کئی بنیادی تصورات سے مماثلت رکھتی ہیں، مثلاً: فنا فی الحق، ترکِ نفس، وحدت الوجود، معرفتِ ذات وغیرہ۔ اسی لیے معجز دہلوی نے ان فلسفیانہ تصورات کو اردو صوفیانہ اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا۔ ان کا انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہندو فلسفے اور اسلامی تصوف دونوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔

اشٹاوکر گیتا کی ایک اہم خصوصیت اس کا مکالماتی اسلوب ہے۔ یہ کتاب راجہ جنک اور اشٹاوکر کے درمیان سوال و جواب کی صورت میں ترتیب دی گئی ہے۔ اس اسلوب سے فلسفیانہ مسائل نہ صرف زیادہ واضح ہو جاتے ہیں بلکہ قاری کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔

پیامِ سالک کی زبان نہایت سادہ، رواں اور دلنشیں ہے۔ معجز دہلوی نے فلسفیانہ مضامین کو پیچیدہ اصطلاحات کے بجائے آسان اور عام فہم زبان میں بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب خواص کے ساتھ ساتھ عام قارئین کے لیے بھی قابلِ استفادہ بن گئی۔ ان کے اشعار میں تصنع یا لفظی نمائش نہیں بلکہ فکری سلاست اور معنوی شفافیت پائی جاتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ہٹ گئے اس کے لیے دیر و حرم فعل و جزا
ہو گیا بے لوث جس کا قلب مانند خلا

سادگی کے باوجود اس ترجمے میں گہری فکری اور روحانی معنویت موجود ہے۔ ہر شعر اپنے اندر فلسفے اور معرفت کی کئی پرتیں سموئے ہوئے ہے۔ معجز دہلوی نے اشٹاوکر گیتا کے دقیق مضامین کو نہایت فکری دیانت کے ساتھ اردو قالب میں منتقل کیا۔ انھوں نے محض ترجمہ نہیں کیا بلکہ فلسفے کی روح کو بھی برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ پیامِ سالک صرف ادبی متن نہیں بلکہ ایک روحانی تجربہ محسوس ہوتی ہے۔

معجز دہلوی بنیادی طور پر ایک قادرالکلام شاعر تھے، اس لیے ان کے ترجمے میں شعری حسن نمایاں ہے۔ انھوں نے قوافی کی خوبصورتی، بحر کی روانی، بندش کی چستی، موسیقیت کا خاص خیال رکھا۔ انھوں نے 'پیامِ سالک' کے تمام اشعار بحرِ رمل مثمن سالم محذوف الآخر میں کہے ہیں۔ نمونے کے لیے ایک شعر ملاحظہ ہو۔

رنج و راحت وصل و فرقت سے نظر اپنی ہٹا
نیستی ہستی سے بالا خود بخود ہو جا فنا

رنج و راحت، وصل و فرقت، سے نظر اپنی ہٹا
فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن
نیستی ہستی سے بالا، خود بخود ہو، جا فنا

پیامِ سالک کا دیباچہ معجز دہلوی کی فکری بصیرت کا اہم مظہر ہے۔ اس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ ان کا مقصد محض ایک قدیم سنسکرت متن کو اردو میں منتقل کرنا نہیں بلکہ اہلِ اردو کو روحانی معرفت کی ان تعلیمات سے روشناس کرانا ہے جو انسان کو باطنی سکون اور حقیقت کی پہچان عطا کرتی ہیں۔

اودھوت گیتا ہندوستانی روحانی ادب کی ایک نہایت عمیق، وجدانی اور بلند پایہ کتاب ہے، جسے روایتی طور پر سوامی دتاتریہ (Dattatreya) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ادویت فلسفے یا وحدتِ مطلق کے نظریے کی خالص تعبیر پیش کرتی ہے۔ ہندوستانی فلسفیانہ روایت میں اسے ایک ایسا روحانی متن سمجھا جاتا ہے جس میں سالک کی آخری روحانی کیفیت، یعنی

پیامِ سالک کا دیباچہ معجز دہلوی کی فکری بصیرت کا اہم مظہر ہے۔ اس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ ان کا مقصد محض ایک قدیم سنسکرت متن کو اردو میں منتقل کرنا نہیں بلکہ اہلِ اردو کو روحانی معرفت کی ان تعلیمات سے روشناس کرانا ہے جو انسان کو باطنی سکون اور حقیقت کی پہچان عطا کرتی ہیں۔

کامل آزادی اورعرفانِ ذات، اپنے انتہائی درجۂ اظہار تک پہنچ جاتی ہے۔اودھوت گیتا کا اسلوب دیگر فلسفیانہ متون سے مختلف ہے۔اس میں منطقی استدلال یا فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے وجدانی تجربہ، روحانی سرمستی اور باطنی انکشافات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس متن میں ایک خاص قسم کی روحانی حرارت اور داخلی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔لفظ 'اودھوت' سنسکرت زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: ایسا شخص جو دنیاوی آلائشوں، نفسانی خواہشات اور ظاہری بندھنوں سے مکمل طور پر آزاد ہو چکا ہو۔ ہندوستانی روحانی روایت میں اودھوت اس سالک کو کہا جاتا ہے جو روحانی سفر کی آخری منزل تک پہنچ کر ظاہری اور باطنی قیدوں سے ماورا ہو جائے۔اس تصور کو تصوف میں 'مجذوب'، 'فانی فی اللہ' یا 'صاحبِ حال' سے قریب تر سمجھا جا سکتا ہے۔

پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی نے اودھوت گیتا کو 'ترانۂ مجذوب' کے عنوان سے اردو نظم میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ اردو ادب میں ایک منفرد ادبی اور روحانی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔معجز دہلوی نے نہ صرف اشلوکوں کا ترجمہ کیا بلکہ ان کی روحانی کیفیت، وجدانی فضا اور صوفیانہ رمزیت کو بھی اردو شاعری میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے اس ترجمے میں سادہ مگر مؤثر زبان، شعری موسیقیت، فکری گہرائی اور روحانی تاثیر کو یکجا کیا۔

اودھوت گیتا اپنی شدتِ اظہار، وجدانی کیفیت اور رمزیت کے باعث اردو صوفیانہ ادب سے گہری مماثلت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'ترانۂ مجذوب' اردو تصوف کی روایت کے قریب محسوس ہوتی ہے۔معجز دہلوی کے ترجمے میں روحانی مضامین خشک فلسفہ نہیں رہتے بلکہ ایک شعری تجربے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

عالمِ کثرت میں ہے جو خود بخود جلوہ طراز
کیسے میں اس پاک ہستی سے کروں عرضِ نیاز
(ترانۂ مجذوب۔ص21)

اس شعر میں وحدتِ وجود، عرفان اور روحانی استغنا کی کیفیت نمایاں ہے۔ترانہ مجذوب کی ایک اہم خصوصیت اس کا وجدانی اسلوب ہے۔ اشعار میں جذب، کیف اور روحانی سرشاری کی فضا موجود ہے۔ یہ اسلوب قاری کو محض فکری سطح پر نہیں بلکہ جذباتی اور روحانی سطح پر بھی متاثر کرتا ہے۔

ترانۂ مجذوب کے اشعار میں ایک خاص صوفیانہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ کیفیت انسان کو ظاہری دنیا سے بلند کر کے باطن کی دنیا کی طرف لے جاتی ہے۔ اس میں سالک کی وہ داخلی حالت جلوہ گر ہے جس میں وہ اپنی ذات کو مٹا کر حقیقتِ مطلق میں گم ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت کی ترجمانی ان کے اس شعر میں ملتی ہے:

مانندِ خلا ہے جانِ جہاں
بے لوث و صافی و پنہاں
تقسیمِ جز و کل سے برتر
قید اور بریت میں یکساں

پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی نے اودھوت گیتا کو 'ترانۂ مجذوب' کے عنوان سے اردو نظم میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ اردو ادب میں ایک منفرد ادبی اور روحانی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔

غرض اودھوت گیتا کا یہ ترجمہ نہ صرف اردو منظوم ترجمہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے بلکہ ہندوستانی فلسفے اور اسلامی تصوف کے درمیان ایک فکری اور روحانی پل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

'گلزارِ معانی' پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی کا مجموعۂ غزلیات ہے، جو ان کی شاعرانہ بصیرت، روحانی فکر اور فلسفیانہ رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ اگرچہ معجز دہلوی کو زیادہ شہرت ان کے منظوم تراجم، خصوصاً مخزنِ اسرار، پیامِ سالک اور ترانہ مجذوب کی وجہ سے حاصل ہوئی، تاہم ان کی غزل گوئی بھی اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

ان کی غزلوں میں روایتی عشقیہ مضامین کے بجائے تصوف، معرفت، وحدت، باطنی تجربات اور روحانی کیفیات نمایاں ہیں۔ان کا کلام محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ ایک گہری فکری اور روحانی جستجو کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گلزارِ معانی اردو کی صوفیانہ شاعری کی روایت میں ایک اہم اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔

معجز دہلوی کی غزلوں میں توحید کا تصور نہایت گہرائی سے موجود ہے۔ان کے نزدیک کائنات کی تمام رنگا رنگی ایک ہی حقیقت کا اظہار ہے۔ ظاہری کثرت کے پیچھے وحدت کا راز پوشیدہ ہے، اور انسان اگر بصیرت کی نگاہ پیدا کرے تو ہر شے میں ایک ہی نور کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔ان کا یہ شعر اسی تصور کی ترجمانی کرتا ہے:

ہمیں باہر نظر آتی ہے جو نیرنگیِ عالم
حقیقت میں وہ پرتو ہے ہمارے دل کے اندر کا

غرض پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی اردو ادب کی اُن نابغۂ روزگار شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی علمی، ادبی اور روحانی بصیرت کے ذریعے اردو زبان کے دامن کو وسعت عطا کی۔ان کی ادبی خدمات کا سب سے نمایاں پہلو سنسکرت کے اہم روحانی اور فلسفیانہ متون، خصوصاً شریمد بھگوت گیتا، اشٹاوکر گیتا اور اودھوت گیتا کے منظوم اردو تراجم ہیں، جنھیں انھوں نے بالترتیب مخزنِ اسرار، پیامِ سالک اور ترانۂ مجذوب کے نام سے اردو ادب میں پیش کیا۔ان تراجم کی اہمیت صرف اس اعتبار سے نہیں کہ انھوں نے ایک زبان سے دوسری زبان میں مفاہیم منتقل کیے، بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ انھوں نے ہندو فلسفے اور اسلامی تصوف کے درمیان ایک فکری اور روحانی ہم آہنگی پیدا کی۔ انھوں نے پیچیدہ روحانی اور فلسفیانہ مضامین کو نہایت سادہ، سلیس اور شعری انداز میں بیان کر کے اردو منظوم ترجمہ نگاری کو ایک نئی جہت عطا کی۔

یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی ادبی خدمات محض ترجمہ نگاری یا شاعری تک محدود نہیں بلکہ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، بین المذاہب فکری روابط اور روحانی ادب کے ایک اہم نمائندہ ہیں۔ان کا علمی و ادبی سرمایہ اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے، جس پر مزید تحقیق اور تنقیدی مطالعے کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسلیں ان کی فکری عظمت اور تہذیبی خدمات سے بہتر طور پر آگاہ ہو سکیں۔

Dr. Mohamed Saleem Pulsarakath
Associate Professor Department of Urdu
Farook College (Autonomous)
Kozhikode, Kerala-673632
Mob.9497612434
Email: saleempulsarakath@farookcollege.ac.in

شخصیات

شیخ عمران

ادھو مہاجن بسمل کا شاعرانہ اختصاص

اردو زبان کے فروغ میں جہاں مسلم شعرا نے اہم کردار ادا کیا وہیں غیر مسلم شعرا نے بھی اردو کے فروغ اور اس کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ غیر مسلم شعرا نے بھی اردو کی مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی۔ ان شعرا میں ادھو مہاجن بسمل کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ بسمل ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ایک نیک آدمی تھے۔ اردو میں ایسے شعرا کی تعداد کم ہے جنھوں نے اردو کے ساتھ دیگر زبانوں کو یکساں طور پر متاثر کیا ہے۔ بسمل کو اردو کے علاوہ ہندی اور مراٹھی زبانوں پر کامل دسترس حاصل تھی۔ مراٹھی ان کی مادری زبان تھی لیکن کبھی انھوں نے اس کا احساس نہیں دلایا۔ اردو سے ان کی محبت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ اردو کے سچے عاشق تھے۔ بسمل ہماری گنگا جمنی تہذیب اور یکجہتی کی مثال کہے جاسکتے ہیں۔ 25 جنوری 2026 کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے جو بلاشبہ اردو کے حلقے کے لیے ایک خسارہ ہے۔

زمانہ ہمیشہ ایک رفتار پر برقرار نہیں رہتا۔ لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن وہی لوگ گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو خلوص و ایثار، عزم و عمل اور جدوجہد کا پیکر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی اشخاص کے کارناموں سے لوگ تاریکی میں رہبری حاصل کرتے ہیں۔ بسمل ایک روشن دماغ، وسیع النظر، فراخ دل، کسی بھی قسم کے بھید بھاؤ سے دور، علاقائی اور مذہبی حد بندیوں سے بے نیاز اردو کے سچے شیدائی تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ایثار و قربانی، خلوص و محبت اور بے لوث خدمت خلق میں صرف ہوا۔ انھوں نے اپنے اعلی اخلاق اور خلوص و محبت سے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ بسمل نے یقین محکم عمل پیہم، جہد مسلسل اور عزم مصمم کی روشوں کو اپنا کر علم و ادب کے میدان میں عظمت و سربلندی حاصل کی۔

بسمل کو اردو کے علاوہ ہندی اور مراٹھی زبانوں پر کامل دسترس حاصل تھی۔ مراٹھی ان کی مادری زبان تھی لیکن کبھی انھوں نے اس کا احساس نہیں دلایا۔ اردو سے ان کی محبت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ اردو کے سچے عاشق تھے۔ بسمل ہماری گنگا جمنی تہذیب اور یکجہتی کی مثال کہے جاسکتے ہیں۔ 25 جنوری 2026 کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے جو بلاشبہ اردو کے حلقے کے لیے ایک خسارہ ہے۔

بسمل کی پیدائش 17 فروری 1950 کو جلگاؤں کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی۔ گھر کا ماحول تعلیم سے رچا بسا تھا۔ حسب روایت تعلیم حاصل کی۔ عالم شباب سے ہی وہ شعروسخن کا ذوق رکھتے تھے۔ بسمل کو اردو زبان سے بے حد محبت تھی۔ رفتہ رفتہ ان کے اندر اردو ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس دلچسپی نے انھیں اردو کا ایک نامور شاعر بنادیا۔ بسمل کے متعلق ایک بات اہم ہے، جس کا ذکر کرنا ضروری ہے، مراٹھی ان کی مادری زبان رہی ہے۔ ہندی ان کے پیشہ کی زبان اور اردو سے ان کی محبت بے پناہ ہے۔ انھوں نے کل 18 کتابیں سپرد قلم کیں۔ اردو تصانیف میں 'غزل کے ساتھ'، 'حرف غزل'، 'محمدؐ سب کے لیے'، 'لفظوں کے حصار میں'، 'مناظر عاشق ہرگانوی سے مصاحبہ'، 'میری خامہ فرسائیاں'، 'دشت امکاں سے پرے' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جو بسمل کے ادب نواز ہونے کی دلیل ہے۔

اردو کی کم و بیش سبھی اصناف میں انھوں نے طبع آزمائی کی۔ جن میں نعت، منقبت، نظم، گیت، غزل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ غزل ان کی محبوب صنف رہی ہے۔ جس میں انھوں نے کئی اہم تجربے کیے ہیں۔ غزل ہماری تہذیبی اور جذباتی زندگی کی شریک بھی رہی ہے اور ترجمان بھی۔ شعرانے گل و بلبل، ساغر

وینا کے رمزیہ اشاروں سے زندگی کے اتار چڑھاؤ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ غزل زندگی کی تمام تر کیفیتوں سے مملو ہوگئی ہے۔ بسمل کے یہاں ایسی ہی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ زیادہ تر شعرا نے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے غزل کا سہارا لیا۔ اردو کے ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے بسمل پہچانے جاتے تھے۔ ان کی غزلیں فنی تقاضوں پر پوری اترتی ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

غزل کہوں تو میں اپنی غزل کے ساتھ رہوں
سخن کی راہ میں پیہم عمل کے ساتھ رہوں
بکھیرتا رہوں خوشبو ہر ایک محفل میں
گلاب چمپا چنبیلی کنول کے ساتھ رہوں
بنوں سہارا میں دنیا میں بے سہاروں کا
ترے کرم سے خدایا میں بل کے ساتھ رہوں
لڑائی کرنے سے بہتر ہے صلح کرتا رہوں
اسی امید سے میں آج کل کے ساتھ رہوں

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہایت روانی کے ساتھ انھوں نے غزلیں کہی ہیں۔ جس سے بسمل کی قادرالکلامی کا احساس ہوتا ہے۔ حُسن و عشق کے راز و نیاز کا بیان بسمل کی شاعری کا امتیاز ہے، جسے بڑی خوبی سے انھوں نے ادا کیا ہے۔ اچھے شاعر کی یہ پہچان ہے کہ اس میں خیال کی بلندی ،مشاہدے کی گہرائی، تجربے کی کثرت اور اظہار کی صداقت فن کی سرپرستی میں پروان چڑھتے ہیں۔ ادھو مہاجن بسمل میں یہ خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں موضوعات اور تراکیب کو اپنے مخصوص انداز میں برتا اور اس میں نئی معنویت پیدا کی۔ اشعار پیش ہیں ۔

تصور میں ہمارے بھی کسی کا حسن پلتا ہے
تغزل کا چراغ اس واسطے آنکھوں میں جلتا ہے
ہمارے دل میں اُٹھتی ہیں ہوائیں درد کی جس دم
ہمارے دل میں تخلیقات کا طوفاں مچلتا ہے
زمانہ ہے نہ جانے کب یہ رخ اپنا بدل ڈالے
ہوا پر اختیار آخر کہاں انساں کا چلتا ہے

شاعر اپنے عہد کا نباض ہوتا ہے۔ اس کا دائرہ فکر وسیع ہوتا ہے۔ بسمل نے اپنی غزلوں میں اپنے دور کے حادثات و واقعات، زندگی کے تجربات، مشاہدات محسوسات کو شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بندھے ٹکے انداز میں شاعری نہیں کی ،نہ تو سماج سے انحراف کیا اور نہ ہی روایت سے۔ بلکہ سماج اور اس کے مسائل کو شعر کے قالب میں ڈھال کر جدید لب و لہجے میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے اعلی اقدار کے خیالات کا اظہار جس انداز میں ہوا ہے وہ لائق توجہ ہے جیسے ۔

مری غزلوں سے مرے اشعار سے
ہو رہے ہیں لوگ اب بیدار سے
حسن سے اخلاق سے اور پیار سے
خود کو اونچا کیجیے کردار سے
آیئے جام صلح کا لطف لیں
فائدہ کیا آپسی تکرار سے

بسمل نہ صرف غزل کے فن سے واقف تھے بلکہ غزل کے بیرون و اندرون سے کما حقہ ہم آہنگی بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے غزلیں کہیں اور بھر پور کہیں۔ غزل کے مختلف پہلوؤں کو بحسن خوبی برتا اور اپنے پیغام کو سامعین و قارئین تک موثر کن انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ بسمل کی ادب دوستی سے متاثر ہوکر ڈاکٹر عظیم راہی لکھتے ہیں:

’’وہ اردو زبان و ادب کے عشق میں ایسے فریفتہ ہوگئے ہیں کہ اب اپنا خاندانی شجرہ بھی بھول گئے ہیں اور اپنا ادبی شجرہ بنالیا ہے۔ جو ابراہیم ذوق سے داغ دہلوی اور کالی داس گپتا رضا سے ہوکر ان کے استاد محترم نذیر فتح پوری تک پہنچتا ہے۔‘‘

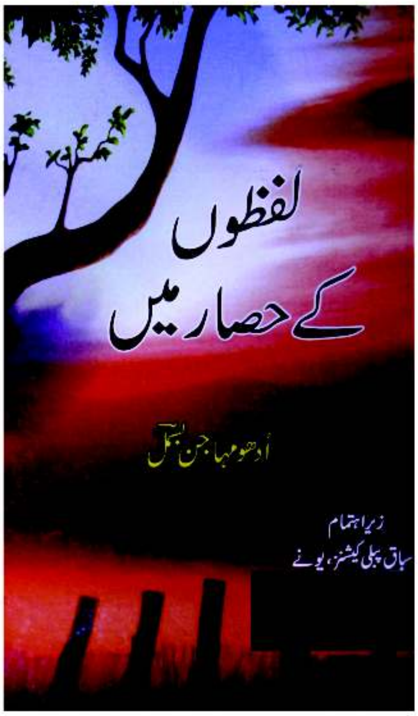

شاعری میں استاد اور شاگرد کا رشتہ بڑا پرانا ہے۔ تخلیقی فن کار کو شاعری کے فن، تکنیک سے واقفیت کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تبھی وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر شاہکار تخلیقات سپرد قلم کرتا ہے۔ شعرا کی صلاحتیں ان کے کلام کی خوبی یا عیب کا باعث ہوتی ہیں۔ استاد کا کام ان کی فطری صلاحیتوں کو جلا دینا ہوتا ہے۔ انھوں نے معروف اردو شاعر و محقق نذیر فتح پوری کی شاگردی قبول کی۔ نذیر فتح پوری نے انھیں شاعری کے رموز و اوقاف سکھانے کے ساتھ ساتھ شاعری کے بہت سے اہم نکات بھی بتائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسمل ایک اچھے شاعر کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ نذیر فتح پوری بسمل کے متعلق لکھتے ہیں:

’’بسمل صاحب اپنے آپ کو میرا شاگرد تسلیم کرتے ہیں اس طرح کے دوسرے کچھ لوگ پہلے بھی آئے اور مقصد حاصل ہوتے ہی چشم زدن میں ایسے روپوش ہوئے کہ تلاش کے لیے کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ بسمل صاحب 25 سال پہلے میرے پاس آئے اور پھر دل و جان سے میرے ہی ہوکر رہ گئے۔ بہکائے گئے، ورغلائے گئے۔ دوسرے راستے ،شجر اور سائے کی نشان دہی کر کے اس طرف کوچ کرنے کا اشارہ کیا۔ دلیلیں پیش کیں۔ تاویلیں بتائیں۔ اسباب سماعت میں اتارے گئے۔ لیکن یہ بندہ اپنے اس قول پر قائم رہا۔ ابتدا میں ہاتھ جوڑ کر وعدہ کیا تھا۔ ’’استاد میں آپ سے کبھی نہیں بدلوں گا۔‘‘ اور اپنے وعدہ کو سچ کر دکھایا۔ آج ہم دونوں ہی زندگی میں ناگہانی راستوں سے گزر رہے ہیں۔ عمر میں وہ مجھ سے دو تین برس ہی پیچھے چل رہے ہیں لیکن ان کا قلم ،مجھ سے بھی آگے نکلنے کے لیے حدیں پھلانگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قلم اپنی ذات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، بس جس ہاتھ میں جتنی قوت اور جس ذہن میں جتنی طراوت ہوتی ہے اس کے سبب قلم رفتار پکڑتا چلا جاتا ہے۔ اردو، ہندی اور مراٹھی میں بسمل صاحب کی تقریباً 18 کتابیں آچکی ہیں۔ پونا کے ادبی ماحول کے پیش نظر یہ تعداد قابل ذکر ہی نہیں، قابل فخر بھی ہے۔‘‘

(ادھو مہاجن بسمل کے نام پچاس خطوط، نذیر فتح پوری، 2025 دہلی، ص 8-9)

ادھو مہاجن بسمل کی شاعری میں احساس کی گہرائی اور فکر کی بلندی وہ نمایاں عناصر ہیں جو قارئین کو متوجہ کرتے ہیں۔ اردو کے غیر مسلم شعرا میں بسمل اپنی سوچ و

فکر اور شاعرانہ فہم وشعور کے اعتبار سے اپنا ایک الگ مقام رکھتے تھے۔اشعار پیش ہیں۔

جب کوئی درد مرے دل سے جدا ہوتا ہے
جانے کیوں سارے زمانے کو گلہ ہوتا ہے
کر ستم شوق سے اف تک نہ کروں گا میں بھی
کیا کسی پھول کو شبنم سے گلہ ہوتا ہے
مجھ کو محفل میں بلاتا ہے ہمیشہ لیکن
میں پہنچتا ہوں تو جانے کیوں خفا ہوتا ہے
یہ ستم بھی مجھے بسمل ہے گوارہ اس کا
کردے رُسوا مجھے اس کا جو بھلا ہوتا ہے

تاثیر،فصاحت،سلاست،نادر تشبیہات بسؔمل کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔زبان کی شستگی اور برجستگی بھی بہت خوب ہے۔فطرت سے انھوں نے شاعری کے لیے موزوں طبیعت پائی تھی۔قدرت نے انھیں نہایت شستہ وسلیم ذوق سخن عطا کیا تھا۔ایک اچھے سخنور کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔انھوں نے اپنے کلام میں شعری صنعتوں،تشبیہات و استعارات کو انتہائی حسین اور دلکش انداز میں استعمال کرکے دلچسپ بنادیا اور اپنے مشاہدات کو شعری سانچوں میں ڈھال کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔مثلاً

ترے دل پر میں کچھ تحریر کرلوں
کہ تجھ کو میں اپنی تقدیر کرلوں
کہیں سے آ گلے مجھ کو لگا لے
کہ غم کی دور میں تصویر کرلوں
ہو کوئی خواب تو مجھ کو بتا دے
ترا ہر خواب میں تعبیر کرلوں
کہ میں بھی یاد میں بسمل کسی کی
کہیں ایک مقبرہ تعمیر کرلوں

ادھومہاجن بسمل نے صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ اپنی شاعری سے مذہبی رواداری کا ثبوت بھی دیا ہے۔انھوں نے شاعری کے دوران کبھی اپنے مذہب کو حائل نہیں ہونے دیا۔وہ دیگر مذاہب کا اتنا ہی احترام کرتے تھے۔اپنی شاعری سے انھوں نے مذہبی معاملات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں۔

جہاں کہیں بھی رہو جب اذان تک پہونچو
یہ التجا ہے خدا کے مکان تک پہونچو
جو زلزلوں سے سونامی سے تم کو بچنا ہے
رضائے حق میں اسی کی امان تک پہونچو
اس لیے تو ہوں بسمل ہے میرا کام یہی
اک امتحان سے اک امتحان تک پہونچو

بسمل کا شعری احساس انسانی جذبات کے اظہار سے عبارت ہے۔حسن وعشق کے دائرے میں رہتے ہوئے ان کی شاعری سادگی اور پرکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔اچھی شاعری کی جو خصوصیات ناقدین ادب نے طے کی ہیں ان کی شاعری ان پر پورا اترتی ہیں۔ان کے کلام میں سوز وگداز کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ان کے قلب کے درد کی کیفیت ان اشعار سے واضح ہوتی ہے۔

ادھر سے وہ ادھر کیوں ہو رہی ہے
محبت در بہ در کیوں ہورہی ہے
وہ آنکھوں آنکھوں سے کہتے ہیں جب بھی
زمانے کو خبر کیوں ہورہی ہے
یہ دنیا زخم بھی جو دیتی تھی ہر دم
بتاؤ چارہ گر کیوں ہو رہی ہے
دعا میری ترے ہی حق میں بسمل
نہ جانے بے اثر کیوں ہورہی ہے

ادھو مہاجن بسمل کی شاعری دل کی شاعری ھے ، اس لیے دامن شعر و ادب میں ان کا نام ایک گل تازہ کی طرح ھمیشہ مھکتا رھے گا۔شخصیت و شاعری کے تعین میں لوگ عمریں گزار دیتے ھیں لیکن بسمل ان خوش نصیب شعرا میں سے تھے جن کی شاعری کا ھر کسی نے اعتراف کیا۔ اردو شاعری کے اھم ستون کی حیثیت سے وہ ھمیشہ یاد رکھے جائیں گے او ر اھل اردو ان کی شاعری پر اتنا ھی ناز کریں گے جتنا آج کرتے ھیں۔

نعت گوئی میں ادھومہاجن بسمل نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔بسمل کی نعتوں میں شاعرانہ تصنع نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے محسن انسانیت نبی کریم سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔بارگاہِ رسالت میں گلہائے عقیدت کو اشعار کے ذریعہ موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔

وہ نورانی باتیں ہی سب بولتا ہے
زبان محمد سے رب بولتا ہے
اٹھو بہر تعظیم سر کو جھکا دو
کہ آقا کے در پر ادب بولتا ہے
محمد کے شیدائی کی کچھ نہ پوچھو
وہ سچ بولتا ہے وہ جب بولتا ہے
محمد سے بڑھ کر نہیں کوئی بسمل
عجم بولتا ہے عرب بولتا ہے

’محمد سب کے لیے‘ بسمل کی نعتوں کا مجموعہ ہے۔ بسمل کی نعت گوئی کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے نذیر فتح پوری نے لکھا ہے:

’’مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی کثرت سے حضرت محمد کی شان میں نعت کے نذرانے پیش کیے ہیں۔

ایک دفتر ایسی نعتوں سے بھرا ہوا ہے جن کے خالق ہندو ہیں۔پنڈت جوش ملسیانی،جگن ناتھ آزاد،کالی داس گپتا رضا جیسے ادبی طور پر بلند کردار کے حامل شعرا نے بہت عقیدت اور محبت میں ڈوب کر حضرت محمد کی شان میں بے پناہ نعتیہ نذرانے پیش کیے ہیں۔ادھومہاجن بسمل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔کڑی سے کڑی ملتی ہے تو ہار بنتا ہے۔اس ہار میں اور پھول جڑتے جائیں گے اور اس کی خوشبو پھیلتی جائے گی اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔‘جناب اُدھومہاجن بسمل نے شہرت اور ناموری حاصل کرنے کے لیے نعت نہیں لکھی بلکہ انھوں نے خالص عقیدت اور محبت کے اظہار کا وسیلہ نعت کو بنایا۔وہ عقیدت وہ محبت جو رسالت مآب حضرت محمد کے لیے بسمل صاحب کے دل میں جاں گزیں ہے۔اس کا پرتو ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔‘‘

(محمد سب کے لیے،ادھومہاجن بسمل،جنوری 2018،پونے،ص 7-8)

ادھومہاجن بسمل کی شاعری دل کی شاعری ہے، اس لیے دامن شعر وادب میں ان کا نام ایک گل تازہ کی طرح ہمیشہ مہکتا رہے گا۔شخصیت وشاعری کے تعین میں لوگ عمریں گزار دیتے ہیں لیکن بسمل ان خوش نصیب شعرا میں سے تھے جن کی شاعری کا ہر کسی نے اعتراف کیا۔اردو شاعری کے اہم ستون کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور اہل اردو ان کی شاعری پر اتنا ہی ناز کریں گے جتنا آج کرتے ہیں۔

■

Dr. Shaikh Imran
Assistant Professor Urdu
Vasantrao Naik Govt. Instt.
of Arts & Social Sciences
Nagpur (Maharashtra)
Mob. 9921986904
Email:shaikhimranvas@gmail.com

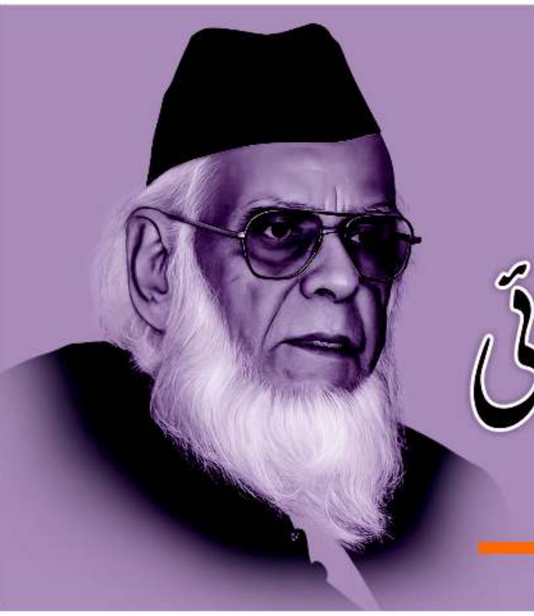

کلیم عاجز کی غزل گوئی

روایت اور اسلوب

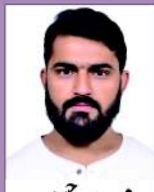

محمد ناصر حسین

کلیم عاجز نے غزل، نظم، نعت، مرثیہ اور رباعی جیسی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے۔ یہ بھی ایک قابلِ غور بات ہے کہ غزل کی صنف میں اتنا گہرا ڈوبنے کے لیے محض ذوق کافی نہیں، اس کے لیے روایت پر پکڑ اور اپنے مزاج کی گہری پہچان دونوں ضروری ہیں۔ کلیم عاجز کے یہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ وہ جمال پرست تھے اور شاعری سے انھیں عشق تھا۔ پیکر تراشی کے دلنواز نمونے ان کے یہاں جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں ادا بندی، بیباکی، سہل پسندی اور مسلسل گوئی کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ عناصر یوں ہی نہیں آ گئے، ان کے پیچھے ایک پوری روایت ہے جسے کلیم عاجز نے اپنے اندر جذب کیا اور پھر اپنی شرطوں پر باہر نکالا۔

روایت کے تناظر میں دیکھا جائے تو کلیم عاجز کا سب سے گہرا اور فطری رشتہ میر تقی میر سے ہے۔ اردو غزل کی تاریخ میں میر وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے درد کو شاعری کی روح بنایا، سادہ زبان میں ایسی بات کہی جو دل کی گہرائی میں اترتی ہے اور اپنی ذات کے تجربے کو اس طرح پیش کیا کہ وہ ہر پڑھنے والے کا تجربہ بن جائے۔ کلیم عاجز نے یہی راستہ اپنایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ میر کا درد ایک ٹوٹی ہوئی تہذیب کا ماتم ہے جب کہ کلیم عاجز کا درد تقسیمِ ہند کے خونی سانحے، عزیزوں کی شہادت، دربدری اور ذاتی محرومیوں کا حاصل ہے۔ یوں میر کی روایت کو انھوں نے اپنے عہد کی زبان اور اپنی زمین کا لہجہ دیا۔ غالب سے ان کا رشتہ نسبتاً مختلف نوعیت کا ہے۔ غالب کی پیچیدہ معنویت اور فلسفیانہ تہہ داری کلیم عاجز کے سہل پسند مزاج کے ساتھ نہیں چلتی، تاہم غالب کی طرح اپنے فن پر اعتماد اور تعلّی کا وصف انھوں نے ضرور اپنایا، البتہ اسے اپنی مٹی کے رنگ میں رنگا۔ داغ کی عوامی زبان اور محاورے کی چاشنی کا عکس بھی کلیم عاجز کے یہاں ملتا ہے، مگر داغ کی شوخی اور رنگینی کے بجائے کلیم عاجز نے سنجیدگی اور وقار کو ترجیح دی۔ اس طرح انھوں نے اردو غزل کی روایت کے مختلف دھاروں سے انتخابی رشتہ قائم کیا اور ہر جگہ سے وہی لیا جو ان کی شخصیت اور ان کے عہد کے لیے موزوں تھا۔

دبستانِ عظیم آباد کی شعری روایت بھی کلیم عاجز کی تفہیم میں کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ شاد عظیم آبادی اور اس دبستان کے دیگر شعرا کی طرح کلیم عاجز کے یہاں بھی مقامی رنگ، علاقائی زبان کی چاشنی اور زمین سے جڑی ہوئی شاعری کا وصف موجود ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کلیم عاجز اس روایت کے سب سے معتبر اور جاندار وارث ہیں جس نے شاعری کو عوام کی زبان اور عوام کے دل کے قریب رکھا۔ انھوں نے اس روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اسے ایک نئی قومی اور ادبی شناخت عطا کی۔ جو کام دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ میں اپنی اپنی جگہ ہوا، اسی کا ایک اور رنگ دبستانِ عظیم آباد میں ملتا ہے اور کلیم عاجز اس رنگ کی سب سے روشن مثال ہیں۔ اس روایتی پس منظر کو سمجھے بغیر کلیم عاجز کے اسلوب کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

روایت اور کلیم عاجز کے اس رشتے کو بیان کرنے میں پروفیسر عتیق اللہ نے ایک جامع بات کہی ہے جو اس مقام پر نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

''روایت کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے ان کے اپنے کچھ شعری جواز ہوں گے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ خواہ مخواہ روایت سے خوف نہیں کھاتے اور نہ ہی روایت کے لیے راستے کھلے رکھتے ہیں بلکہ وہ اسے اخذ بھی کرتے ہیں تو اپنی شرطوں پر۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کلیم عاجز تجربہ پسند شاعر تھے، وہ تجربہ پسند تو قطعاً نہیں تھے لیکن روایت کو تجربۂ ذات کے ساتھ مربوط کر کے دیکھنے کا ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ اس لیے کلیم عاجز روایت کو من و عن قبول نہیں کرتے اس سے دو دو ہاتھ کرتے، جھگڑتے اور پھر کچھ نہ کچھ ٹوٹ پھوٹ سے عاری ہے تو اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے عصر کی شاعری کے مقبول عام رجحانات اور محاورے کو فیشن کے طور پر قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں...''

(سہ ماہی بھاشا سنگم، جنوری تا جون 2019، ص97)

یہ بات اس لیے اہم ہے کہ اردو غزل کی روایت میں تجربے کی صداقت ہمیشہ سے کلیدی معیار رہی ہے۔ میر نے جو کہا وہ جھیلا تھا، غالب نے جو لکھا وہ محسوس کیا تھا۔ کلیم عاجز کا معاملہ بھی یہی ہے۔ تقسیمِ ملک کا وہ خونی سانحہ، عزیز و اقربا کی شہادت، دربدری اور بھائی کا فراق یہ محض موضوعات نہیں بلکہ ان کی شاعری کی اصل جڑیں ہیں۔ اسی تجربے نے انھیں روایت کا معتبر وارث بنایا اور اسی نے ان کے اسلوب کو ایک الگ وزن اور گہرائی دی۔ جو شاعر محض روایت کا پیرو کار رہتا ہے وہ نقال رہتا ہے، مگر جب روایت کسی جیے ہوئے تجربے سے گزرتی ہے تو نئی شاعری جنم لیتی ہے۔ کلیم عاجز کے یہاں یہی ہوا۔

اب کلیم عاجز کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات کی طرف آتے ہیں۔ ان کے اسلوب کا پہلا اور سب سے نمایاں وصف عربی و فارسی الفاظ کے بجائے عوامی زبان، خصوصاً عظیم آباد کی علاقائی بولیوں کا خوبصورت استعمال ہے۔ اس پہلو پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ

یہ محض زبان کا معاملہ نہیں بلکہ ایک شعری موقف ہے۔ کلیم عاجز کا یہ انتخاب اس بات کا اعلان ہے کہ شاعری صرف فارسی دان یا عربی دان طبقے کے لیے نہیں، بلکہ وہ عوام کے لیے ہے جو بازار میں بولتے اور گھروں میں جیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں اس کی جھلک دیکھیے۔

اس کی فکر نہ کیجو عاجز کون یہاں کیا بولے ہے
کرنے والا کام کرے ہے بولنے والا بولے ہے
بنسی تو اک لکڑی ٹھہری بنسی بھی کیا بولے ہے
بنسی کے پردے میں پیارے کرشن کنہیا بولے ہے

یہ الفاظ اور یہ لہجہ اردو کی ادبی زبان میں بالعموم نہیں ملتا۔ لیکن کلیم عاجز نے انھیں ایسے سلیقے سے برتا ہے کہ یہ اجنبی نہیں لگتے بلکہ قاری کے دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ علاقائی بولی کا یہ استعمال کلیم عاجز کے فن کی کمزوری نہیں بلکہ ایک شعوری ادبی انتخاب ہے جو انھیں اپنی مٹی سے جوڑے رکھتا ہے اور ان کی شاعری کو ایک مخصوص جغرافیائی اور ثقافتی شناخت عطا کرتا ہے۔ مگدھی اور دیسی لہجے کا یہ رنگ انھیں دبستانِ عظیم آباد کی روایت کا حصہ بناتا ہے اور بیک وقت اس روایت کو ایک نئی بلندی تک لے جاتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ کلیم عاجز غمِ جاناں کو غمِ دوراں اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنا دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ذاتی دکھ اور اجتماعی کرب اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ انھیں الگ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعری محض اظہار نہیں رہتی بلکہ ایک اجتماعی تجربے کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اردو غزل کی روایت میں یہ وصف میر کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور کلیم عاجز نے اسے اپنے عہد کے تناظر میں نئے سرے سے زندہ کیا۔ چند اشعار دیکھیے۔

جھومتے ہیں سب مرے اشعار پر
میرے دل میں سب کے دل کی بات ہے
جو سبب بن گیا محفل کی پریشانی کا
وہ فسانہ تھا مری سوختہ سامانی کا
مری شاعری میں نہ رقصِ جام نہ مے کی رنگ فشانیاں
وہی دکھ بھروں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں

پہلے شعر میں جو دعویٰ ہے ’’میرے دل میں سب کے دل کی بات ہے‘‘ یہ محض شاعرانہ مبالغہ نہیں۔ یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ کلیم عاجز کا درد اتنا آفاقی ہے کہ مختلف لوگ اس میں اپنا اپنا درد پہچانتے ہیں۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو کسی شاعر کو مقبول سے عظیم بناتی ہے۔

تیسری خصوصیت سادہ الفاظ میں بلند خیالی اور معنی آفرینی ہے، جسے اردو تنقید میں سہلِ ممتنع کہا جاتا ہے اور جسے حاصل کرنا سب سے مشکل ہے۔ کلیم عاجز کے اسلوب پر غور کرتے ہوئے اس پہلو کی گواہی خود ان کے اشعار دیتے ہیں۔

کبھی جو گوشۂ خلوت میں شمع ہاتھ آئی
لپٹ کے رو لیے یارانِ انجمن کے لیے
ہم ان سے شکوۂ بے داد کیا کریں عاجز
یہاں تو پاسِ وفا قفل ہے دہن کے لیے
تجھے سنگ دل یہ پتا ہے کیا کہ دکھے دلوں کی دوا ہے کیا
کبھی چوٹ تو نے بھی کھائی ہے کبھی تیرا دل بھی دکھا ہے کیا
تو رئیسِ شہرِ ستمگراں میں گدائے کوچۂ عاشقاں
تو امیر ہے تو بتا مجھے میں غریب ہوں تو برا ہے کیا

پہلے دو اشعار میں تقسیمِ ملک کا درد، بے گھری کا کرب اور وطن سے محبت کا جذبہ ایک ہی مصرعے میں سمٹ آیا ہے۔ ظاہر میں یہ ایک سادہ بات ہے مگر اس سادگی کے پیچھے معنی کی ایک پوری دنیا آباد ہے۔ اگلے دو شعروں میں طبقاتی امتیاز پر جو طنز ہے وہ آج بھی اتنا ہی تازہ اور چبھتا ہوا ہے جتنا اس وقت تھا۔ اس طرح کلیم عاجز کی بظاہر سادہ شاعری ایک سماجی دستاویز کا درجہ بھی رکھتی ہے جسے ادبی تنقید میں اکثر نظر انداز کیا گیا ہے۔

اسلوب کی چوتھی خصوصیت آپ بیتی کو پوری صداقت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ کلیم عاجز کی شاعری محض تخیل کی اڑان نہیں بلکہ جیے ہوئے لمحوں کی تعبیر ہے۔ جو کچھ انھوں نے بھوگا وہی انھوں نے لکھا اور اسی صداقت نے ان کے کلام کو لازوال بنایا۔ یہ بات یاد رہے کہ محض ذاتی تجربہ شاعری کو عظیم نہیں بناتا، عظیم وہ شاعری بنتی ہے جو ذاتی تجربے کو آفاقی سچ میں بدل دے۔ کلیم عاجز کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تقسیمِ ملک کا ذاتی درد، عزیزوں کی شہادت اور دربدری کا کرب اس طرح بیان کیا کہ ہر وہ شخص جس نے کبھی کوئی گہرا نقصان اٹھایا ہو، اس شاعری میں اپنا عکس پا لیتا ہے۔ کلیم عاجز نے عنفوانِ شباب میں جو حالات کے ستم دیکھے انھیں قیامتِ صغریٰ سے بھی تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان حادثوں کے بعد تا حیات جب بھی ان کی آنکھیں بھیگیں تو آنسوؤں میں اس درد کا نمک پایا گیا اور جب بھی مسکرائے تو زخموں نے انھی ان کا ماضی یاد دلایا:

یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کے رفیق ہیں یہی میری رات کی رانیاں
کبھی آنسوؤں کو سکھا گئیں مرے سوزِ دل کی حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گئیں مرے آنسوؤں کی روانیاں
چند آہوں کا مرقع ہے کلامِ عاجز
ڈال رکھا ہے نقاب اس پہ غزل خوانی کا

پانچویں خصوصیت غزل میں مسلسل گوئی کا وصف ہے جو کلیم عاجز کے اسلوب کو ایک خاص امتیاز بخشتا ہے۔ وہ ایک ہی موضوع کو تسلسل کے ساتھ اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ غزل اور نظم دونوں کی لذت بیک وقت حاصل ہو جائے۔ یہ تسلسل محض اتفاقی نہیں بلکہ کلیم عاجز کی فنی بصیرت کا ثبوت ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جدید قاری کو غزل کی روایتی بکھری ہوئی ابیات پرستی سے آگے جا کر ایک ایسی کیفیت کی ضرورت ہے جو مسلسل اور یکسو رہے۔ اسی لیے ان کی غزلیں پڑھتے ہوئے ذہن کا دھیان نہیں بٹتا، بات ایک سرے سے دوسرے سرے تک بہتی چلی جاتی ہے۔ ایک مسلسل غزل سے چند اشعار دیکھیں۔

جب بھی تری نظروں نے شہ دل کو ذرا دی ہے
کہہ دی ہے غزل ہم نے اور تجھ کو سنا دی ہے
رنگوں کی ہنرمندی لفظوں میں چھپا دی ہے
جو بات بھی کہہ دی ہے تصویر بنا دی ہے
اے صنفِ غزل تیری توقیر بڑھا دی ہے
تو اور جواں ہوگی جا میں نے دعا دی ہے
ہر سمت ڈھنڈھورا ہے ہر سو یہ منادی ہے
عاجز کو خوشی مت دو یہ درد کا عادی ہے

اس غزل میں ہر شعر ایک مستقل اکائی ہونے کے ساتھ ساتھ اگلے شعر کا سیاق بھی ہے۔ یہ وہ فن ہے جو غزل کی روایت میں نادر ہے اور کلیم عاجز نے اسے بار بار اور کامیابی سے برتا ہے۔

کلیم عاجز کے اسلوب کی ایک اور اہم خصوصیت جس پر تنقیدی نظر ڈالنا ضروری ہے وہ تعلّی کا وصف ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں میر، غالب اور اقبال نے بھی اپنے فن پر ناز کا اظہار کیا ہے، مگر اس کے پیچھے ان کے کلام کا وہ ٹھوس سرمایہ تھا جو خود اس دعوے کی دلیل بنتا تھا۔ کلیم عاجز کے یہاں بھی تعلّی کے اشعار کی کمی نہیں۔

ساتھ عاجز کے گیا سوزِ سخن سازِ سخن
پھر کوئی ایسا غزل خواں نہ زمانے سے اٹھا
بیاں جب کلیم اپنی حالت کرے ہے
غزل کیا کہے ہے قیامت کرے ہے
آزمانا ہے اگر بازو و دل کی قوت
تو بھی شمشیر اٹھا ہم بھی غزل کہتے ہیں

ان اشعار میں اعتماد ہے اور یہ اعتماد بے بنیاد نہیں بلکہ ان کا کلام خود اس کا جواز فراہم کرتا ہے۔ تاہم ناقد کا کام یہ ہے کہ وہ دعوے اور دلیل دونوں کو ایک ساتھ پرکھے۔ جب تعلّی کثرت سے آئے اور ہر غزل میں اپنی برتری کا اعلان ہو تو یہ فنی اعتماد کی بجائے عادتِ ثانیہ بننے لگتی ہے اور ایک حد پر پہنچ کر قاری کو خوشگوار نہیں لگتی۔ اس پہلو کو نظر انداز کرنا کلیم عاجز کے ساتھ تنقیدی انصاف نہیں ہوگا۔

کلیم عاجز کے اسلوب کا ایک اور پہلو جو توجہ کا مستحق ہے وہ طنز کا استعمال ہے۔ وہ شیخ، ناصح اور واعظ کو بیچ میں لاتے ہیں مگر ان کے ساتھ برتاؤ میں کلاسیکی رسمی مخالفت نہیں بلکہ ایک سچا اور تیکھا طنز ہے جو ان کے اپنے مشاہدے اور تجربے سے نکلتا ہے۔

جنابِ شیخ پر افسوس ہے، ہم نے تو سمجھا تھا
حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہوں گے
مجھ سے چاہیں تو اہلِ خرد مانگ لیں
تھوڑی آشفتگی تھوڑا دیوانہ پن

ان اشعار میں طنز کی جو دھار ہے وہ کلیم عاجز کے اسلوب کا ایک اہم لیکن کم زیر بحث آنے والا پہلو ہے۔ کلاسیکی غزل میں شیخ کی مخالفت ایک رسمی عمل تھا جو تقریباً ہر شاعر کرتا تھا۔ کلیم عاجز نے اسی روایتی عمل کو ایک نئی اور ذاتی معنویت دی اور یوں روایت کو نئے سیاق میں زندہ کیا۔

اسلوب کے حوالے سے عظیم ناقد کلیم الدین احمد کی ایک جامع رائے جو کلیم عاجز کی شاعری کی داخلی ساخت کو سمجھنے میں معاون ہے، اسے یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''کلیم عاجز کے شعروں کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے شعروں میں ایک مخصوص سادگی ہے۔ ان کے الفاظ جانے پہچانے اور ان کی ترکیبیں ایسی سیدھی سادی ہوتی ہیں کہ مفہوم فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان کے اشعار سطحی ہوتے ہیں، بلکہ الفاظ، ترکیبوں اور معنی کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہتا۔ یوں کہیے کہ ان کے الفاظ ایسے شفاف ہیں کہ معنی کو ایک نگاہِ غلط انداز بھی پا لیتی ہے۔''

(کلیم الدین احمد، وہ جو شاعری کا سبب ہوا، طوبیٰ پبلی کیشنز، حیدر آباد، طبع سوم: 1996، ص: 29)

یہ رائے اپنی جگہ بالکل درست ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس سادگی اور شفافیت کا منبع کہاں ہے۔ کلیم عاجز نے یہ سادگی روایت کو توڑ کر نہیں بلکہ روایت کو اپنے مزاج کے رنگ میں ڈھال کر حاصل کی ہے۔ انھوں نے فارسی آمیز اور علمی اصطلاحات سے لدے اسلوب کو چھوڑا، مگر غزل کی روایتی بحروں، ردیف و قافیے کی پابندی اور شعری مزاج کو برقرار رکھا۔ اس طرح ان کا اسلوب نہ روایت کی نفی ہے نہ اس کی اندھی تقلید بلکہ یہ ایک تخلیقی مکالمہ ہے جو ایک باشعور فنکار اپنی روایت کے ساتھ کرتا ہے۔

کلیم عاجز کے کلام کے کلیدی الفاظ میں غم، دکھ، بہار، دامن، لہو، صحرا، چمن، آنسو، آہ اور ٹیس بنیادی ہیں۔ ان کے اسلوب میں حسن و عشق کی باتیں کم اور درد و غم و اندوہ کا بیان زیادہ ہے۔ یہ درد محض موضوع نہیں، یہ ان کا اسلوب ہے، ان کا لہجہ ہے اور ان کی شناخت ہے۔ موضوع کے لحاظ سے چاہے وہ حمدِ باری لکھیں یا نعت، عشق کے مضامین باندھیں یا سیاست کے، اخلاقیات کو موضوع بنائیں یا پند و نصیحت کو، سب میں درد کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور موجود رہتا ہے۔

کلیم عاجز کو گل و بلبل و چمن جیسی فرسودہ علامتوں سے گریز ہے اور جہاں یہ علامتیں استعمال ہوئی بھی ہیں وہاں انھیں نئے سیاق میں برتا گیا ہے۔ روایتی علامتوں کا یہ تخلیقی استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ کلیم عاجز روایت کے باشعور اور ہوشیار وارث ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ روایت کی طاقت اس میں ہے کہ اسے نئے معنی دیے جائیں نہ کہ اسے حرفاً حرفاً دہرایا جائے۔

خوشی کیا ہے کسی آوارۂ وطن کے لیے
بہار آئی تو آیا کرے چمن کے لیے

یہاں چمن اور بہار روایتی علامتیں ہیں مگر ان کا سیاق نیا ہے۔ تقسیم کا درد، بے گھری کا کرب یہی کلیم عاجز کا فن ہے۔ تاہم ایک اہم نکتہ جو تنقیدی ایمانداری کا تقاضا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ کلیم عاجز کے اسلوب کا مرکزی محور درد اور غم تک محدود رہا۔ یہ بات جہاں ان کی عظمت کی دلیل ہے وہیں ایک حد تک ان کی محدودیت کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ اردو غزل کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں فلسفے کی گہرائی بھی ہے، طنز کی تیزی بھی، عشق کی لطافت بھی اور سماجی شعور کی پختگی بھی۔ کلیم عاجز نے اپنی شاعری کا بیشتر حصہ درد کی ایک ہی وادی میں بسر کیا۔ یہ وادی شاعری کے باب میں بلاشبہ سرسبز اور دلکش ہے، مگر اس سے باہر کی دنیا بھی اتنی ہی بامعنی ہے۔ یہ کہنا ناانصافی نہ ہوگی کہ اگر کلیم عاجز نے اپنے موضوعاتی دائرے کو تھوڑا اور وسیع کیا ہوتا تو ان کا کلام اور بھی کثیر الجہات ہوتا۔

یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ کلیم عاجز کے زیادہ تر ناقدین نے ان کے محاسن بیان کرنے میں اس قدر فیاضی دکھائی ہے کہ معائب کی طرف نظر ہی نہیں گئی۔ تعریف کو تنقید کا لباس پہنانا نہ ادب کی خدمت ہے نہ شاعر کی۔ ایک ناقد کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند سے بالاتر ہو کر متن کو اس کی پوری پیچیدگی میں دیکھے۔ کلیم عاجز ایک بڑے شاعر ہیں اور بڑے شاعر اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ بڑی تنقید ہو۔

مجموعی طور پر کلیم عاجز کو اردو کی حزنیہ شاعری کے اماموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کی کلاسیکی روایت سے درد کی میراث لی، دبستانِ عظیم آباد سے زمین سے جڑے لہجے کی نعمت پائی اور ان دونوں کو ملا کر ایک ایسا اسلوب تراشا جو خالص ان کا اپنا ہے۔ یہ اسلوب روایت کی توسیع بھی ہے اور اس سے ایک تخلیقی انحراف بھی نیز یہی وہ تناؤ ہے جو کلیم عاجز کی شاعری کو زندہ اور بامعنی رکھتا ہے۔ 2015 میں کلیم عاجز اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اردو ادب ایک ایسی آواز سے محروم ہو گیا جسے دوبارہ پیدا کرنا ممکن نہیں۔ انہی کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتے ہیں جو ان کی شاعری کا ایک حد تک نمائندہ بھی ہے اور ان کی انفرادیت کا اعلان بھی۔

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

■

Md. Nasir Husain
MM Johar Hall of Boys, Room No.:3
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mob: 8674840809
Email: nkmisbahi0@gmail.com

خلیق الرحمن اعوان

ڈاکٹر موہن سنگھ اوبرائے دیوانہ

کی شعری کائنات

تقسیم ہند و پاک نے صوبہ پنجاب کو بھی دو حصوں، مشرقی پنجاب (ہندوستان) اور مغربی پنجاب (پاکستان) میں تقسیم کر دیا۔اس صوبے کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت لاہور مغربی پنجاب کا حصہ ہوگیا۔ نتیجتاً مشرقی پنجاب لاہور جیسے خوبصورت شہر کے ساتھ ساتھ دارالحکومت سے بھی محروم ہو گیا۔ مشرقی پنجاب کے لیے دارالحکومت کے طور پر ایک نئے شہر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے مشرقی پنجاب کے دارالحکومت کے طور پر ایک منصوبہ بند شہر کا خواب دیکھا، جس کی زندہ تعبیر کی صورت میں سوِز۔فرینچ معمار لی کاربوزئیر (Le Corbusier) نے چنڈی گڑھ کے منصوبے کی صورت میں پیش کی، جو ہندوستان کا پہلا منصوبہ بند شہر اور پنجاب کا دارالحکومت ہوا۔ عام طور پر کسی بھی خطے میں لوگوں کی بڑھتی ہوئی آبادی ہی اس خطے کو شہر یا قصبے کی شکل دیتی ہے۔ شہر کے مقامی لوگوں کی اپنی ایک زبان، تہذیب و ثقافت ہوتی ہے مگر چنڈی گڑھ چونکہ ایک منصوبے کے تحت تشکیل دیا جانا تھا اس لیے علاقے میں بسنے والے لوگوں کو جو پنجابی زبان کی شاخ پوادی بولتے تھے انھیں منتقل کر کے نواح میں بسا دیا گیا۔ لہٰذا اس شہر کی کوئی ایک زبان، تہذیب یا ثقافت نہ بن سکی۔ تقسیم کے بعد مغربی پنجاب سے آنے والے مہاجرین اور مشرقی پنجاب سے کاروبار یا ملازمت کے سلسلے سے آنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس علاقہ میں آباد ہوگئی۔ جن میں پنجابی، ہندی، اردو اور پہاڑی (ہماچل کی مختلف بولیاں) بولنے والے لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں میں درج بالا زبانوں کے ایسے ادیب بھی شامل تھے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اس شہر یا قومی سطح پر شہرت حاصل کی بلکہ عالمی منظر نامے پر بھی ان زبانوں کی نمائندگی کی۔ اس شہر نے جہاں دوسری زبانوں کی آبیاری کی وہیں اردو کی نشو نما میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اردو کو اظہار خیال کا وسیلہ بنانے والوں کی ایک اچھی تعداد یہاں ابتدا ہی سے موجود تھی۔ اس مقالے میں چنڈی گڑھ کی تشکیل کے بعد کے انھیں ادیبوں کی فہرست میں شامل اردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانے والے (میری نظر میں) سب سے پہلے شاعر و ادیب ڈاکٹر موہن سنگھ اوبرائے دیوانہ ہیں، جنھوں نے پہلی بار 1933 میں History of Punjabi Literature کے نام سے اس زبان و ادب کی تاریخ لکھی۔ اس طرح یہ پنجابی کی پہلی اور مفصل تاریخ لکھنے والے سب سے پہلے ادیب ہوئے۔ ان کی ہندی، انگریزی، پنجابی اور اردو چاروں زبانوں میں کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اردو میں ان کی شعری اور نثری تخلیقات کے ساتھ ساتھ کئی تراجم بھی موجود ہیں۔ ان میں گورو گرنتھ صاحب کے حصہ 'جپ' کا منظوم اردو ترجمہ 'نغمہ دیدار الٰہی' کے نام سے، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

موہن سنگھ اوبرائے دیوانہ غیر منقسم پنجاب کے گاؤں دیوی ضلع راولپنڈی میں 17 مارچ 1899 کو پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی آنرز میں بی۔اے، کلکتہ یونیورسٹی سے، ایم۔اے اور پھر 1931 میں یہیں سے 'جدید اردو شاعری کے رجحانات' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1933 میں ہی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے پنجابی ادب کی تاریخ پر پہلی اور مفصل کتاب لکھنے پر ڈی، لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازے گئے۔ اس کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں انگریزی اور پنجابی کے استاد رہے۔ 1928 کو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پنجابی کے لیکچرر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور 1944 میں ریڈر ہو گئے۔ 1959 تک انھوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ پنجابی میں بحیثیت صدر خدمات انجام دیں۔ تقسیم کے بعد ہندوستان آ گئے اور زندگی کا بقیہ حصہ چنڈی گڑھ میں ہی گزارا۔ دیوانہ نے 1914 میں پہلی بار ایک افسانہ لکھ کر ادبی زندگی کا آغاز کیا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی تحقیقی و تنقیدی مضامین، ڈرامے، ترجمے اور شعری مجموعے شائع کیے۔ دیوانہ جس دور میں لکھ رہے تھے اس زمانے میں اردو شاعری اور خاص طور پر صنف غزل کی نمائندگی وہ لوگ کر رہے تھے جنھوں نے اردو غزل کو نئی سمت و رفتار بخشی۔ ان میں مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی جیسے شعرا شامل تھے جنھیں اردو غزل کے عناصر اربعہ کہا گیا۔ اس دور کا لکھنے والا ہر شاعر ان شعرا سے اثر قبول کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانہ کے کلام میں بھی تشبیہات و تلمیحات، استعارات و محاورات کے باوجود بات کہنے کا ایک خوبصورت انداز پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں عام فہم الفاظ کے استعمال کے ساتھ مشکل الفاظ و تراکیب کو بھی برتا گیا ہے۔ ان کے 5 شعری مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آئے جن میں، 'دوشیزہ' (نظم) 1926، 'کیفیات' (غزل) 1937، 'نئی دنیا' (نظم) 1944 'سفینہ' (نظم و غزل) 1970 اور 'جپ'، بنام نغمہ دیدار الٰہی' (گرو نانک جی کی تخلیق، گرو گرنتھ صاحب کے حصہ، جپ جی

کا منظوم اردو ترجمہ) شامل ہیں، ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے ہندی، انگریزی اور پنجابی میں بھی اہم تخلیقی کارنامے نجام دیے ہیں، بلکہ پنجابی زبان و ادب کی تاریخ دیوانہ کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے،اس کے باوجود دیوانہ کو اردو زبان سے والہانہ محبت تھی، اس زبان کو اجداد کی وراثت تسلیم کرتے اور اپنی محبوب ترین زبان بھی سمجھتے ،شعر دیکھیں۔

اردوئے معلیٰ جسے کہتا ہے زمانہ
وہ ورثۂ اسلاف ہے وہ میری زباں ہے

(سفینہ از موہن سنگھ دیوانہ، لکھنہ لیتھیو پریس، دہلی،1970،ص39)

منور لکھنوی ان کی شعری قابلیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’محبت پرستی کے باریک ترین رمزوں کو اہل دل کے سامنے کلیجہ چیر کر رکھنے والا۔علم و ادب کا پُجاری۔ صنم خانہ شعر وسخن کا یہ عظیم المرتبت اور مستحکم الایمان کافر۔ ۔ ۔دیوانہ ایک خاص نظریہ کا مالک ہے،اردو شاعری میں اس کا طرز بیان اور اس کا تخیل سب سے جدا اور انوکھا ہے۔‘‘

(نئی دنیا، موہن سنگھ دیوانہ، رام لال پوری،1944،ص89)

دیوانہ کی غزلوں کو پڑھ کر منور لکھنوی کے یہ تاثرات بالکل سچ معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ دیوانہ کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے اور انھوں نے جس بھی موضوع کو اظہار کے لیے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اس کے ساتھ انصاف کیا ہے مگر عشق و محبت کے باریک ترین موضوع کو انھوں نے نہایت خوبصورتی سے پیش کرتے ہوئے محبت کی پریشانیاں انسان کے ذہن و دل پر جس طرح اثر انداز ہوتی ہیں ان کیفیات کو بھی بڑی بے تکلفی سے برتا ہے، چند شعر دیکھیں۔

بہت پٹکا ہے سر دل کی پریشانی نہیں جاتی
جہاں کشمکش کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
بہت پچھتا رہے ہیں حضرتِ دیوانہ دل دے کر
تعجب ہے کہ داناؤں کہ نادانی نہیں جاتی

(سفینہ از موہن سنگھ دیوانہ، لکھنہ لیتھیو پریس، دہلی،1970،ص32)

یہ غزل دیوانہ کے مجموعہ سفینہ ،اشاعت 1970 میں چھپی تھی مگر اسی زمین میں عصر حاضر کے شاعر ابرار احمد کاشف کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی جس کے شعر اس طرح سے ہیں۔

یہ منظر دیکھ کر ساحل کی حیرانی نہیں جاتی
مجھے چھو کر بھی کوئی موج طوفانی نہیں
غم دنیا سے پہلو تو مرا آباد رہتا ہے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

اسی طرح عصر حاضر کے ایک اور شاعر عبدالحفیظ ساحل قادری کی اسی زمیں میں یہ غزل بھی دیکھیں۔

فسردہ دل ہے نظروں کی پریشانی نہیں جاتی
کہ اب تصویر میری مجھ سے پہچانی نہیں جاتی
پیام مرگ دیتے ہیں ہزاروں حادثے پھر بھی
ہماری قوم کی ساحل تن آسانی نہیں جاتی

مراد یہ کہ جدیدیت کا جو رنگ ہمیں آج کے شعرا کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے یہ دیوانہ کے ہاں اُس زمانے میں ہی موجود تھا۔اس میں دورائے نہیں کہ دیوانہ نے ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ دیکھا ہے اور ان کی شاعری میں جگہ جگہ یہ رنگ نمایاں طور پر دیکھا بھی جا سکتا ہے البتہ انھوں نے روایت سے ہٹ کر بات کہنے کو فوقیت بھی دی ہے جس کا اندازہ درج بالا شعروں سے لگایا جا سکتا ہے۔غزل ملاحظہ ہو۔

تعلقات کی دنیا کا حال کیا کہیے
کہ مرنا سہل ہے جینا محال کیا کہیے
ادب کی محفلوں اور دین کی مجالس میں
نہ کیف حال نہ لطف مقال کیا کہیے
حرام ہو گئی انگور و جو کی سادہ کشید
لہو غریب کا ٹھہرا حلال کیا کہیے
تمام چیزیں ہڑپنے کے بعد بھی بھوک ایسی
سیاست ایسی ہے لعنت مآل کیا کہیے
بس ایک نقش ہے چربے اسی کے اٹھتے ہیں
فسانہ ہائے عروج و زوال کیا کہیے

(سفینہ از موہن سنگھ دیوانہ،ص42)

انھوں نے اپنی شاعری میں انسان اور انسانی اقدار کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی بیشتر شاعری میں پیش کیا گیا خیال محض ایک شخص اور اس کے دل کی کیفیات کا عکاس ہی نہیں ہوتا بلکہ سماج کی تمام تر برائیوں کو پیش کرتا ہے۔سماج کے ان تمام امور کو موضوع بناتے ہیں جو ایک بہتر سماج کو تشکیل دے سکیں۔یہ ترقی پسندی کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔درج بالا غزل میں جہاں دل کی حالت کا بیان کرتے ہیں وہاں کسی خاص رشتے یا تعلق تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ تعلقات کی دنیا کہتے ہیں اور تعلقات کی دنیا میں گھر،رشتہ دار،دوست،عاشق معشوق،حتیٰ کہ مکمل سماج آتا ہے کیونکہ جس سماج میں ہم زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں اس کا ہر شخص اور ہر شعبہ ہم سے منسلک ہوتا ہے۔وہیں دوسرے شعر میں زبان و ادب کی بدلتی ہوئی صورت حال پر افسوس کرتے ہیں۔اس شعر سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے سے زبان کے صحیح استعمال اور لفظوں کی غلط ادائیگی کی بنیاد ہو چکی تھی۔تیسرے اور چوتھے شعر میں انھوں نے مکمل ترقی پسندانہ جذبے کا اظہار کیا ہے اور سماج کے دبے کچلے اور مظلوم بے زبانوں کی زبان بننے کی کوشش ہے۔اس تعلق سے عبدالقادر سروری یوں رقم طراز ہیں۔

’’وہ دیوانہ ایک خاص طرز فکر اور مخصوص انداز بیان کے مالک ہیں۔۔اسلوب کی بداعت میں دیوانہ ہمارے موجودگی شعرا میں کسی سے پیچھے نہیں۔۔۔۔جنابِ دیوانہ کو شاعری کے اس گُر پر اتنا قابو حاصل ہے کہ ہمارے زمانہ کے بہت سے امور جن پر صاف اظہارِ خیال ممکن نہ تھا۔‘‘

(کیفیات از موہن سنگھ دیوانہ، آتما رام اینڈ سنز،ص10)

یہ بات سچ ہے کہ جس دور میں دیوانہ لکھ رہے تھے یہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا مگر چونکہ جس علاقے میں یہ آبسے تھے یہاں اس زبان اور اس کے ادب کی کوئی خاص نشو نما نہیں ہوئی تھی۔اس کی دو وجہیں ہیں۔ایک تو یہ کہ شہر چنڈی گڑھ کی تشکیل کے لیے یہاں کی بستیوں کو اجاڑ کر نواحی علاقوں میں منتقل کر دیا گیا تھا اور یہاں کی کوئی اپنی تہذیب و ثقافت نہ رہی تھی اور دوسرا یہ کہ اس علاقے میں بسنے والے تمام لوگ پنجابی زبان کی بولی پوادی بولنے والے تھے۔ایسا بھی نہیں تھا کہ ان علاقوں میں اردو یا کسی دوسری زبان کا ادب تخلیق کرنے والے بڑے ادبا موجود ہوں۔جس وقت دیوانہ کی چنڈی گڑھ آمد ہوئی اسی زمانے میں زیادہ تر لوگ یہاں آ رہے تھے۔ممکن ہے اس دور میں اردو بولنے والے کئی لوگ یہاں آباد ہوئے ہوں مگر میری تحقیق کے مطابق ایسے کسی تخلیقی نمونے کے سراغ نہیں ملتے جن کا ذکر کیا جا سکے۔اس طرح اگر یہ نہ بھی کہا جائے کہ دیوانہ اس علاقے میں اردو کے پہلے ادیب ہیں تاہم یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان سے پہلے یا ان کا ہم عصر کوئی دوسرا شخص بھی اردو شعر و ادب تخلیق کر رہا تھا۔

دیوانہ غزل اور نظم دونوں کہتے تھے،ان کی نظموں

میں بھی غزل کی طرح دلکشی ہوتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی ان کی نظموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”اردو زبان میں اس قسم کے نئے خیالات کا جدید انداز بیان وزبان میں شائع ہونا ایک نئی بات ہے۔ فقیر کے نزدیک اردو کی روز افزوں ترقی کے لحاظ سے اسمیں کوئی بات قابل اعتراض نہیں بلکہ مستحق ستائش ہے۔“

(دوشیزہ از موہن سنگھ دیوانہ مطبع انتظامی کانپور، 1926، ص 33، سنہ اشاعت درج نہیں ہے، البتہ دیوانہ نے پیش لفظ کے بعد یہ تاریخ لکھی ہے)

نظم ملاحظہ ہو۔

نظم (کشمکش حیات)

کشمکش حیات کا شر سے بھرا شراریہ
دوسروں کی بھی موت ہے تیرا بھی اختتام ہے
جہد بقا میں لاکھ پڑ، تری فنا ہے لابدی
برق کا ہے نہ باد کا خاک کا جو مقام ہے
تو ہی نہیں ہے منتظم تو ہی نہیں ہے منقسم
وہ بھی شریک کار ہے جس کا یہ کُل نظام ہے
ہم کو ملا نہ آج تک طعنۂ کُفر کا جواب
دین ہے خاص کس طرح فیض جب اس کا عام ہے
زال جہاں کے دام میں بندہ اب آنے کا نہیں
رنج ونشاط دونوں کو دور سے اب سلام ہے

موہن سنگھ دیوانہ کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے یہ ماضی کی ادبی روایتوں سے جتنے قریب ہیں اتنے ہی حال سے آشنا بھی۔ انسان جس شدت احساس سے سن سکتا ہے ان کا قلم اسی شدت جذبات کے ساتھ قلم بند کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ انھوں نے کسی خاص نظریے، فکر یا کسی ایک طرز تحریر یا میلان کو بنیاد نہیں بنایا، انھوں نے ادب کو شہرت یا قبولیت کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ جب جس طرح ان کے ذہن میں خیال نے دستک دی ہے اسی صورت میں منظر عام پر لے آتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے انھوں نے اپنے کلام کو سجانے سنوارنے کی طرف توجہ نہیں دی شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام صاف ستھرا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ماضی کے روایتی موضوعات تو ملیں گے مگر تعداد اتنی کم ہے کہ بغور مطالعہ کیے بغیر اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ انھوں نے جو زمینیں اور جو حالات پیش کیے ہیں وہ ہماری آنکھوں دیکھے معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قدیم موضوعات کو بھی جدید رنگ میں ڈھال دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

محبت غزل ہے عبادت غزل ہے
غزل معرفت ہے شریعت غزل ہے
حریفوں سے یہ قول دیوانہ کہہ دو
غزل ہے جو حسرت تو حسرت غزل ہے

(سفینہ از موہن سنگھ دیوانہ، 1970، ص 3)

بیٹھا ہوں سر راہ تماشائے رواں ہے
سمٹا ہوا پیری کی نگاہوں میں جہاں ہے
پایا تجھے جس نے تجھے ہر چیز میں پایا
پانے کی یہی ایک دلیل ایک نشاں ہے
اس شخص کی مٹھی میں ہے صد نوع کرامات
دیوانہ کہ ہے خندہ جبیں عذب بیاں ہے

(سفینہ از موہن سنگھ دیوانہ، 1970، ص 39)

جو عشق کو کھیل سمجھتے ہیں وہ غم کی لذت کیا جانیں
جو کھوئے گئے ہیں وحدت میں عرفان کثرت کیا جانیں
منکر ہیں خدا کی ہستی سے جو آپ خدا بن بیٹھے ہیں
ایمان کی رفعت کیا جانیں مستی کی وسعت کیا جانیں
بازیٔ حیات وموت مجھے عاری نہیں مقصد اولی سے
پردے کے پیچھے کیا کیا ہے بے نور بصیرت کیا جانیں
ہر قول وفعل دو عالم کا وہ ایک محرک و ناظم ہے
حسنات نظم سے بے بہرہ شعریت خلقت کیا جانیں
ہر موسم کا حسن اپنا ہے ہر دین کا نشہ اپنا ہے
ہر عہد کی اپنی قیمت ہے ہم فرق کی عظمت کیا جانیں

(ایضاً، ص 49)

اے زلف و رخ یار تری شعبدہ بازی
محمود سا فاتح بھی ہے مفتوح ایازی
شرمندۂ معنی نہ ہوا حرف محبت
با ایں ہمہ تفسیر حقیقی و مجازی

دیوانہ کے تعلق سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مذہبی روایتوں کو ترک کر کے دنیا کو ہی جہان جاوداں جان لیا تھا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دیوانہ کسی بھی مذہب کے عام رواجوں سے گریزاں ضرور تھے مگر انھوں نے خالق حقیقی کی وحدانیت کا مکمل طور پر جا بجا اظہار کیا ہے۔ ان کی پیدائش ہندو گھرانے میں ہوئی تھی، بت پرستی ترک کر چکے تھے، بظاہر ان کی پہچان سکھ مذہب کے پیروکار کی تھی دستار ہمیشہ پہنتے تھے، مگر اس مذہب کے ضابطوں کا سرے سے انکار کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی تمام کتابوں کے پیش لفظ میں خُداوند متعال کی شان میں حمدیہ اشعار کہنے کے بعد ہی کلام پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر شعر پیش ہے۔

جس نے جہاں بنایا اُس نے مجھے بنایا
کیا کیا نشہ ہے اس میں کیا کیا ہو ناز اس پر
تیرا آستانہ ہے تیری جبیں ہے
کہیں بھی سوا تیرے کوئی نہیں ہے

(ایضاً، ص 1)

دیوانہ کے ہاں بات کہنے کا ایک خوبصورت انداز ہے۔ مشکل الفاظ، تشبیہات واستعارات وتلمیحات کے باوجود ان کی شاعر بوجھل نہیں معلوم ہوتی بلکہ قاری کو اپنے مفہوم تک لے جاتی ہے۔ ظاہر ہے جس زمانے میں دیوان لکھ رہے تھے اس وقت غزل اپنے عہد زریں سے گزر رہی تھی اس لیے اس زمانے کے کسی بھی شاعر سے بہتر کی توقع ہی کی جا سکتی ہے اور دیوانہ اس پہ کھرے اترتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خوبصورت شعر قاری کے ذہن کا عکاس ہوتا ہے مگر دیوانہ کے ہاں اکثر وبیشتر قاری اپنے اندرونی جذبات کے ساتھ ساتھ سماج کو بھی کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ جس علاقے سے دیوانہ کا تعلق تھا اس کے نواحی علاقوں کو تاریخی یا ادبی کسی بھی لحاظ سے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے ادبا نے اس زبان وادب کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ البتہ چنڈی گڑھ کے حوالے سے جب بھی بات ہوگی دیوانہ کو اولیت حاصل رہے گی۔ ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں ہی معیاری ہیں۔ ان کی اردو شاعری پنجابی آمیز ڈکشن کی وجہ سے بھی خوب سراہی جاتی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ حسرت موہانی جیسے استاد شاعر کی صحبت کا فیض بھی حاصل رہا۔ جس کے نتیجہ میں معیاری تخلیقات کا وجود میں آنا لازمی تھا۔ علاقہ چنڈی گڑھ میں اس نوعیت کی تخلیق کرنے والوں میں دیوانہ پہلے شخص ہیں۔ جن کے تعلق سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ اس علاقہ کے اردو ادب کی مضبوط بنیاد ہیں۔ اور بنیاد بھی ایسی جسے کسی بھی زاویے سے کمزور نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ دیوانہ بہت معیاری شاعر نہ بھی ہوتے تاہم اس علاقے میں اولیت کا درجہ انھیں کو حاصل ہوتا۔

Khaliq ur Rehman Awan
Research Scholar
Panjab University
Chandigarh- 160014 (Punjab)
Mob: 8899210914
Email: khaliqawan165@gmail.com

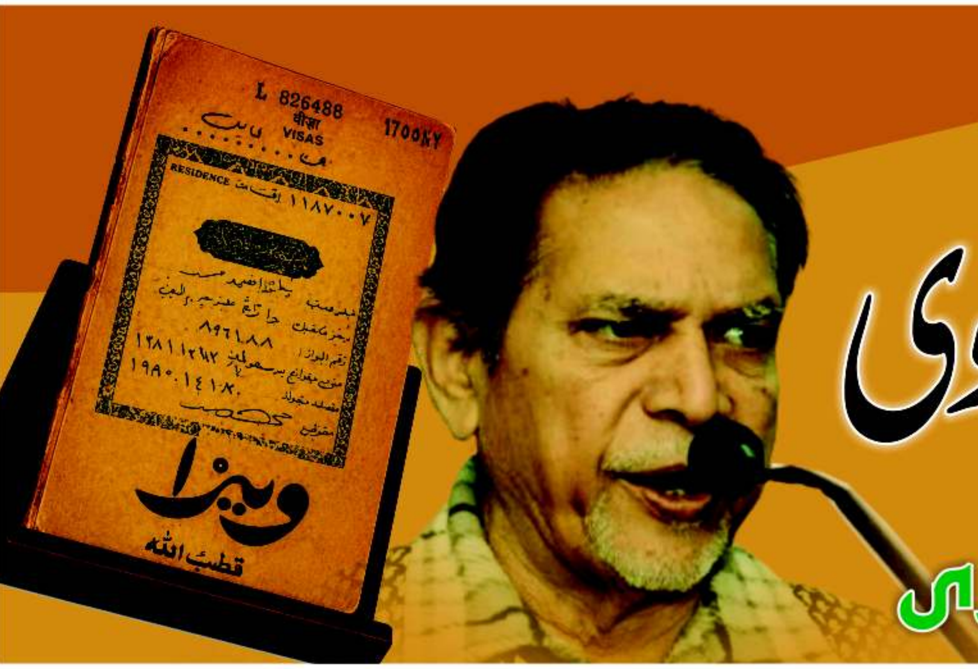

ایس ایم حسینی

قطب اللہ ندوی کی افسانہ نگاری

قطب اللہ بنیادی طور پر صحافی تھے اور اسی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ البتہ ان کے قلم اور مزاج میں ادبی ذوق بھی کارفرما نظر آتا ہے، قطب اللہ کا تحریری سفر پانچ دہائیوں پر محیط ہے اور اس عرصہ میں انھوں نے سینکڑوں سیاسی کالم، اداریے، مضامین، فیچر اور خبریں لکھیں، روزنامہ سالار بنگلور کے لیے 'آداب عرض ہے' اور روزنامہ آگ لکھنؤ کے لیے 'مغربی ایشیا کی ڈائری' کے عنوان سے ہفتہ واری کالم لکھتے رہے۔ دوران تعلیم ہی قومی آواز کے ادارتی عملہ سے 1974 میں منسلک ہوئے اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی وصحافتی سرگرمی کی ابتدا کی، راشٹریہ سہارا، انقلاب نیز متعدد اخبارات میں مختلف عہدوں پر رہے، اس دوران لکھنؤ سے دوسرے شہروں کا بھی رخ کیا لیکن یہ مدت عارضی رہی، اخبار مشرق لکھنؤ اور عوامی سالار کا آغاز بھی آپ کی سرپرستی اور نگرانی میں ہوا۔ صحافت کے موضوع پر ان کی دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔ اردو زبان وادب سے لگاؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ گونگی توپ کے نام سے 13 فلسطینی افسانوں کا ترجمہ کیا۔

قطب اللہ 23 مارچ 1951 کو مشرقی اتر پردیش کے گاؤں بڑھنی ضلع گورکھپور کے ایک معروف علمی ودینی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولانا محبت اللہ اردو کے صحافی، محقق، مترجم اور مصنف تھے، ابتدائی تعلیم جامعہ سلفیہ جھنڈا نگر نیپال سے حاصل کی اور 1970 میں دارالعلوم ندوۃ العلما سے فراغت کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو مضمون میں بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی، 1978 میں ایل ایل بی کے بعد 1980 میں عربی سے ماسٹر کیا، بعد ازاں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور 'ہندوستان میں آزادی کے بعد اردو صحافت' کے موضوع پر پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھا جو کسی سبب سے شائع نہ ہوسکا۔

قطب اللہ ندوی نے افسانوں کے مجموعے 'ویزا' 1984 کی اشاعت سے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا، جو نامی پریس لکھنؤ سے 1984 میں فخر الدین علی احمد میموریل اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے منظر عام پر آیا۔ ان کے افسانے ذاتی مشاہدات، تجربات اور احساسات کے ترجمان ہیں، جن میں حقیقت نگاری کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ دیہی زندگی کے مسائل، زمین، کھیت، جاگیرداری، کسان اور عورتیں ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں، قطب اللہ صاحب کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد کے ممتاز اردو ادیبوں اور صحافیوں کی صحبت اٹھائی جس میں حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، عابد سہیل، عشرت علی صدیقی، عثمان غنی، اردو ہندی صحافی مشتاق پردیسی، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

قطب اللہ کی پہلی کہانی 1969 میں شائع ہوئی۔ 'ویزا' میں کل 13 کہانیاں شامل ہیں، اس مجموعے کے بہت سے افسانے کئی رسائل میں شائع ہوچکے ہیں اور بعض آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن لکھنؤ سے نشر ہوئے۔ دیباچہ 'کہانی کی بات میں' ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی افسانے کے فن اور خصوصیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے قطب اللہ کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس مجموعہ کا ہر افسانہ کسی نہ کسی گہرے مشاہدے کا ترجمان ہے اور کوئی نہ کوئی سبق پڑھنے والا اس سے حاصل کر لیتا ہے۔ دلچسپی اس لیے اور زیادہ ہے کہ تمام افسانے حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں اور پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا، مجموعی طور پر ان افسانوں میں عصری رجحان ہونے کے باوجود زبان وبیان کی چاشنی موجود ہے اور پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔''

('ویزا' از قطب اللہ، مطبع نامی پریس، لکھنؤ، 1984، ص 8)

اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور صحافی عابد سہیل 'کہانی کی کہانی' میں نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''قطب اللہ اپنی ان پہلی کہانیوں کو اعتماد کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اور ان کا یہ اعتماد کچھ ایسا بلا وجہ بھی نہیں۔ واقعات کا فطری بہاؤ سیدھی سادی زبان، شہر اور دیہات کو ایک بڑے کل کے طور پر دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش اور سخن کو پردہ الفاظ میں چھپانے سے احتراز، ان کی افسانہ نگاری کے ایسے پہلو ہیں جن سے وہ پہچانے جائیں گے۔ ان کے افسانوں میں تاثر صدق وصفا کی جھلکیاں موجود ہیں اور یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ زبان وبیان اور تکنیک پر انھوں نے اگر زیادہ توجہ دی تو ان کے افسانے زیادہ گہرائی اور گیرائی سے مالا مال ہوجائیں گے۔'' (ایضاً ص 12)

قطب اللہ مجموعہ کا انتساب ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مرحومہ چچی جان جنھیں ہم سب پیار سے دیدی کہا کرتے تھے اور جنھوں نے مجھے ڈھیر ساری کہانیاں بچپن میں سنائیں۔''

''جناب شفاعت علی صدیقی اور بھائی رفیق احمد خان جنھوں نے مجھے بے مقصد کہانی لکھنے سے روکا۔''

انھوں نے 'اپنی شناخت' کے عنوان سے کہانی

سننے سے کہانی گڑھنے اور پھر چھپنے تک کے سفر کو اپنے خاص اسلوب میں لفظوں کے سپرد کیا ہے، لکھتے ہیں:

"میری امی جو کبھی پوری کہانی نہیں سنا پائیں انھوں نے مجھے کہانی گڑھنے پر مجبور کیا۔ کہانی سناتے سناتے جب وہ سو جاتیں تو اپنے بھائی بہنوں کی تسلی کے لیے میں خود کہانی سنانے لگتا جسے سن کر سب یک زبان ہو کر کہہ اٹھتے، نہیں...نہیں یہ کہانی نہیں ہے یہ تو آپ کی گڑھی ہوئی ہے۔ ویسی کہانی سنائیے جیسی پیاری دیدی سناتی ہیں یا وہ کہانی پوری کیجیے جسے امی جان ادھوری چھوڑ کر سو جاتی ہیں۔" (ایضاً ص 14)

قطب اللہ کے افسانوں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا رشتہ زمین سے اور اس کے باسیوں سے بہت گہرا ہے، وہ شہر سے زیادہ دیہات اور مناظر فطرت سے قربت محسوس کرتے ہیں، شہر ان کے یہاں سمٹا سمٹا یا محسوس ہوتا ہے، وہ روایتی افسانہ نگار نہیں ہے بلکہ انھوں نے دیہاتی ماحول اور گاؤں کی زبوں حالی، افلاس، تنگ دستی، ایک دوسرے کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے کا احساس، کسانوں کی مظلومیت، زمینداروں کی چیرہ دستی کو خوبصورتی کے ساتھ اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے اور قاری اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ ہر کہانی ایک سبق، مقصد اور پیغام سے بھرپور ہے۔

قطب اللہ نے اپنے افسانوں میں بے جا طوالت، گھماؤ پھراؤ اور پیچیدگی سے دامن بچاتے ہوئے سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے، ان کے افسانوں کے کردار ماورائی مخلوق معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ عام انسان، اس کی پریشانیوں نیز ذہنی وفکری کرب واحساس کو لفظوں کے پیکر میں تراشتے ہیں، یہ وہ کردار ہیں جنھیں یونیورسٹی کے کیمپس، شہر کے پر رونق علاقوں، مہیب سناٹوں، چوک چوراہے، گاؤں کے کچے گھروں، کھیت، کھلیان اور کسی دیہات میں پگڈنڈی کے کنارے سائے دار درخت کے نیچے آرام کرنے والے کسان کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں، اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"میری تخلیق عوام کے لیے ہے، شہر کا آدمی اسے پڑھ کر سمجھ سکتا ہے تو گاؤں کا کسان بھی آسانی سے اس کی گہرائی میں اتر سکتا ہے، میں نے اسی لیے ابہام سے دامن بچا کر ابلاغ کی کوشش کی ہے، علامتوں کے چکر میں پڑ کر میں ہر قاری کو شرح نہیں مہیا کر سکتا تھا۔" (ایضاً ص: 15)

کتاب میں شامل پہلا افسانہ 'گیدڑ' کے نام سے ہے، یہ کہانی ہے ہمارے ہندوستان کی، جس میں پیش کردہ حالات اور واقعات کا انطباق موجودہ زمانہ پر بخوبی کیا جا سکتا ہے، اس افسانہ کی خاص بات یہ ہے کہ موجودہ دور کے مطابق اس میں بآسانی معنویت تلاش کی جا سکتی ہے۔

دوسری کہانی 'کتا کتا' میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ شہر کس طرح گاؤں کو کھا جاتا ہے، جو چیزیں بچپن میں ہمیں عزیز ہوتی ہیں وہی بڑے ہو کر کچھ کتابیں پڑھ لینے کے بعد موہوم اور بے معنی لگتی ہیں، ہم ان سے صرف نظر کر لیتے ہیں اور ان کی اہمیت ہمارے نزدیک کھوٹے سکہ سے زیادہ نہیں ہوتی، یہ کہانی ہمیں پیغام دیتی ہے کہ اپنے اقدار، تہذیب، رہن سہن، طرز معاشرت، اپنی اصل اور اپنی مٹی سے ہمیشہ وابستہ رہنا چاہیے، نہ کہ انھیں شہر کی ہوا لگنے کے بعد کسی جھوٹن کی طرح اٹھا کر دور کر دینا چاہیے کیونکہ یہی وہ عناصر ہیں جو ہمیں ہمارے زندہ ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔

'گم شدہ پسلی' دیہاتی عناصر اور مناظر فطرت کی عکاسی سے وجود میں آنے والا ایک رومانوی افسانہ ہے جس میں معصومیت اور الھڑ پن کے جیتے جاگتے دلکش مرقعے ہیں، افسانہ کا مرکزی کردار ایک لڑکا واحد متکلم راوی کے طور پر موجود ہے جو کہانی سنا رہا ہے، جس میں دیہی زندگی کے مسائل، وہاں کے سادہ لوح، غم شناس، احسان مند افراد کی منظر کشی کی گئی ہے، خیرن کا معصوم، سادہ لوح کردار قاری پر اچھا تاثر قائم کرتا ہے اور کردار کی ذہنی اور نفسیاتی کوائف کی بھرپور عکاسی ملتی ہے، افسانہ کا اختتام راوی اور قاری دونوں کو ایک کھوئے ہوئے احساس سے دو چار کرتا ہے، انھیں کے الفاظ میں چند سطور ملاحظہ فرمائیں:

"میرے قدم رک نہ سکے اور میں بھی گاؤں سے باہر آ کر دور تک خیرن کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا دھانی کھیتوں کے درمیان چوڑی چکلی منڈیر پر لال چنریا اوڑھے سر پر گٹھری رکھے وہ بڑے غرور سے سر اٹھائے اپنے گھر کی جانب رواں تھی اور پھر جب وہ باغ کے اس پار چلی گئی تو میری نظریں تھک کر واپس آ گئیں۔"

"آج بھی میری آنکھیں دھان کے جوان پودوں کے درمیان لال چنریا اوڑھے سر پر گٹھری رکھے کسی کو تلاش کرتی ہیں۔ دور تک نگاہیں دوڑ لگاتی ہیں پھر کسی کو نہ پا کر سامنے باغ کے تناور درختوں کو چھو کر واپس آ جاتی ہیں۔ میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ مجھے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ اپنے اندر کچھ...کمی محسوس کرتا ہوں۔ جائزہ لیتا ہوں تو پہلو سے ایک پسلی غائب ملتی ہے مجھے یاد آتا ہے۔ ارے ہاں...میری ایک پی ابھی ابھی تو یہیں کہیں دھان کے کھیتوں میں کھو گئی ہے۔" (ایضاً ص 48-47)

چوتھی کہانی 'بہادر' کی ہے جو خودداری، دوستی، خلوص اور وفا کی علامت ہے، یہ افسانہ زمین داروں کے ذریعہ کسانوں کے استحصال اور ناحق انھیں پریشان کرنے کی کہانی بیان کرتا ہے، جس میں گاؤں اپنی مکمل آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے، افسانہ نگار نے کردار کے جغرافیہ کے اعتبار سے زبان، بولی، لہجہ اور انداز کا خاص خیال رکھا ہے۔

قطب اللہ کے افسانوں میں مقامی رنگ واضح نظر آتا ہے، چونکہ ان کا گاؤں بڑھنی ہند نیپال سرحد سے قریب ہے لہٰذا ایک ملک سے دوسرے ملک ہونے والی غیر قانونی درآمد اور برآمد، منشیات کی سپلائی، اسمگلنگ اور چور بازاری کو افسانہ 'دلدل' کا موضوع بنا کر ایک نیا زاویہ نظر عطا کیا ہے۔

'وفادار' گاؤں سے شہر آنے والے ایک چور کی کہانی ہے جس میں ہم ہر اس شخص کو تصور کر سکتے ہیں جو تعلیم، روزگار یا کسی مجبوری کے تحت شہر کا رخ کرتے ہیں اور وہاں انھیں جس قسم کے تصادم اور کش مکش کا سامنا کرنا ہوتا ہے وہ بہت صبر آزما ہے۔

قطب اللہ کے افسانوں کے موضوع گاؤں، دیہات، بھوک اور کسان کے مسائل ہیں، جو دو وقت کی روٹی کے لیے محنت ومشقت کرتے ہیں اور اپنی جان ہلاکت میں ڈالتے ہیں لیکن دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا ٹھیک سے جٹا نہیں پاتے۔

'وہ ہاتھ سمندر سورج' ایک علامتی افسانہ ہے جس میں اپنے ملک کی افرادی قوت کا المیہ پیش کیا ہے جو دوسرے ممالک کو برآمد کی جا رہی ہے۔

'سجدہ' مذہبی ٹھیکیداروں کی تعصب پسندی اور معاشرہ کی المناک صورت حال کی عکاسی نیز فرسودہ روایات پر ضرب لگاتا ہے، افسانہ کی اختتامی سطریں چونکانے والی ہیں جو حساس قاری کو حزن وفکر میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

کتاب میں شامل نواں افسانہ 'ویزا' ہے اور اسی کو مصنف نے مجموعہ کا عنوان بنایا ہے، کہانی کے ہیرو نیاز

کو جب دوبارہ سعودی جانے کا موقع ملتا ہے تو وہ اپنا پاسپورٹ اس لیے پھاڑ دیتا ہے کہ وہ وہاں اپنے گھر بار، دوست احباب نیز ان رسوم ورواج کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا جہاں اس کا سب کچھ بستا ہے۔ روزگار کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کرنے کا دکھ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو تہوار کے موقعوں پر بھی اپنے چاہنے والوں سے دور اجنبی شہر اور کاٹ کھانے والی اجنبی فضا میں سانس لیتا ہے، یہ کہانی روزگار کی تلاش میں عرب ممالک ہجرت کرنے والوں کے احساسات کی ترجمان ہے، جہاں نہ عید کی خوشی ہے نہ بقرعید کی مسرت، مشینی زندگی، آفس سے روم، روم سے آفس، نہ زندگی، نہ خواب، نہ حسرتوں کی تکمیل کی خواہش، سب کچھ مال ودولت اور نوکری کے درمیان الجھ کر رہ جاتا ہے، جتنا کماتے ہیں اس سے کہیں زیادہ قیمتی لمحوں کو کھو بیٹھتے ہیں، لیکن وہیں ہندوستان میں روزگار کے مسائل، پڑھنے اور ڈگریاں لینے کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوتا اور برسوں کی محنت پر پانی پھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، مختلف اقتباس سے چند سطریں ملاحظہ ہوں:

”اس نے پہلی بار سعودی عرب میں عید کا تہوار دیکھا۔ عجیب عید تھی نہ کوئی چہل پہل نہ دھوم دھام۔ فجر کی نماز کے بعد لوگ مسجدوں میں اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے سورج ذرا بلند ہوا کہ عید کی نماز ادا کی گئی اس کے بعد لوگ چپ چاپ اپنے گھروں میں جا کر قید ہوگئے نیاز یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا یہ کیسی عید ہے...“ (ایضاً ص 105)

”دسہرہ، عید، دیوالی، رکشا بندھن سب خواب سے لگ رہے تھے اس کے ایک دوست کی لڑکی شوبھا اسے راکھی باندھا کرتی تھی اس بار کوئی نہیں تھا جو اسے راکھی باندھتا...“

”مہیش کے گھر ہولی اور دیوالی میں مٹھائیاں اور گوجھیاں کھانے کو ملتی تھیں عید کے دن اس کے یہاں سارے دوست انل، اروند، مہیش وغیرہ جمگھٹ لگائے رہتے، سویوں کی بہار۔ مبارکباد کی بھرمار، گلے ملنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اف پیسے کے پیچھے۔ اس نے کیا کیا کھودیا تھا؟“ (ایضاً ص 106)

’حسو ماما‘ میں احسان فراموشی، لالچ اور حرص کو افسانہ نگار نے بنیادی موضوع بنایا ہے، ایک دلسوز افسانہ ہے جو نہ جانے کتنے گھروں کی حقیقت ہے۔

قطب اللہ بہت سیدھی سادی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن قصوں اور جملوں میں ایک تسلسل اور کشش ہوتی ہے، مناسب الفاظ کا استعمال اور مربوط جملے قاری کے ذہن کو کسی الجھن میں مبتلا نہیں کرتے، سب کچھ پرسکون ندی میں بہنے والے پانی کی طرح روح پرور ہوتا ہے، ایک سطر کے بعد دوسری سطر، ایک اقتباس کے بعد دوسرا اقتباس پڑھتے جائیے، کہانی کا سرا ہاتھ کی انگلیوں میں دھاگے کی طرح لپٹتا جاتا ہے، نہایت مسرت آمیز اور راحت آفریں انداز میں جیسے دادی کے گرد بچے گھیرا ڈال کر بیٹھے ہوں اور وہ مزے مزے سے کہانی کہتی جارہی ہیں۔

قطب اللہ کی کہانیوں میں زندگی ہے، وہ زندگی جو ہم سب الگ الگ انداز میں جیتے ہیں۔ ان افسانوں میں کہانی پن بھی ہے اور زبان وبیان کی دلکشی و رعنائی بھی۔ لیکن یہ کہانیاں قاری کو قدم قدم پر استعجاب اور تحیر میں نہیں ڈالتیں بلکہ قاری کو اپنے ارد گرد نظر ڈالنے اور محسوس کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔

’آٹھواں دن‘ افسانہ نگار نے اسے قرار دیا ہے جب دو بچھڑے مل بیٹھیں۔ کہانی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ رشتوں اور محبت میں ’انا‘ اور ’میں‘ کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

’ترتیب دیا ہوا کل‘ ایک خوبصورت علامتی افسانہ ہے جو قاری کو چونکاتا بھی ہے اور مضطرب بھی کرتا ہے، یہ نیوکلیئر جنگ کی بھیانک تصویر پیش کرتا ہے جس میں سانپ، بندر وغیرہ تباہی اور بربادی کے استعارے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

’گم شدہ پسلی‘، ’دلدل‘، ’حسو ماما‘، ’بہادر‘ دیہی مناظر کی عکاسی کے تناظر میں قطب اللہ کے نمائندہ افسانے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ’گم شدہ پسلی‘ اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ ان کی افسانہ نگاری کی بیشتر خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ قطب اللہ نے گاؤں، دیہات کے رہن سہن، انداز گفتگو، بیباکی، سادہ لوحی اور عادات واطوار کے حوالہ سے اس وقت کے معاشرہ کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔

’وہ ہاتھ سمندر سورج‘ اور ’ترتیب یا ہوا کل‘ مجموعہ میں شامل دو علامتی افسانے ہیں لیکن پیش لفظ میں اس کے متعلق وہ پہلے ہی لکھ دیتے ہیں:

”میں نے کہیں کہیں علامت کا بھی سہارا لیا ہے لیکن بغیر سوچے سمجھے فیشن کے طور پر نہیں“ (ایضاً ص 17)

مصنف نے پیش لفظ میں اپنی کتاب کے بارے میں جو دعوی کیا ہے اس میں وہ سچے ہیں اور کتاب کی ایک ایک سطر، ایک ایک کہانی اس کی گواہی دیتی ہے۔ قطب اللہ کسی تحریک اور دبستان سے خود کو لازم نہیں کرتے، وہ آزادانہ طور پر مقصدی فکر کے تحت ادب کی تخلیق کرتے ہیں، کسی خاص سیاسی اور فکری نظام کے پابند نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان کی کوئی چیز دیکھنے کو ملتی ہے، وہ حقیقت نگاری کے نام پر تہذیب، اخلاق ومعاشرتی اقدار کو ہدف ملامت نہیں بناتے اور نہ ہی علامتوں اور مبہم استعاروں کے چکر میں پڑ کر کہانی کے لطف کو ختم کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی اور ان مظاہر کی عکاسی کی ہے جس سے واسطہ پڑا۔

قطب اللہ کی کہانیوں میں زندگی ہے، وہ زندگی جو ہم سب الگ الگ انداز میں جیتے ہیں۔ ان افسانوں میں کہانی پن بھی ہے اور زبان وبیان کی دلکشی ورعنائی بھی۔ لیکن یہ کہانیاں قاری کو قدم قدم پر استعجاب اور تحیر میں نہیں ڈالتیں بلکہ قاری کو اپنے اردگرد نظر ڈالنے اور محسوس کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں گاؤں اور شہر کی آویزش کا مطالعہ بچشم خود کیا ہے، اور افسانے میں دیہاتی عناصر کو قصے اور منظر نگاری کے ذریعہ ابھارا ہے، نیز گاؤں کی مظلومیت کے ساتھ شہر کے ظلم کو بھی آشکار کیا ہے، یہ افسانے پردہ کے پیچھے کا حال نہیں بیان کرتے بلکہ اس زندگی کے آئینہ دار ہیں جس کو تفہیم کی سطح پر کسی تشریح اور وضاحت کی ضرورت نہیں، انھوں نے ان افسانوں کی مدد سے اپنی زمین سے رشتہ جوڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

■

S.M. Husaini
Research Scholar, Dept. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mobile: 8960512979
Email: hamzahusaini0981@gmail.com

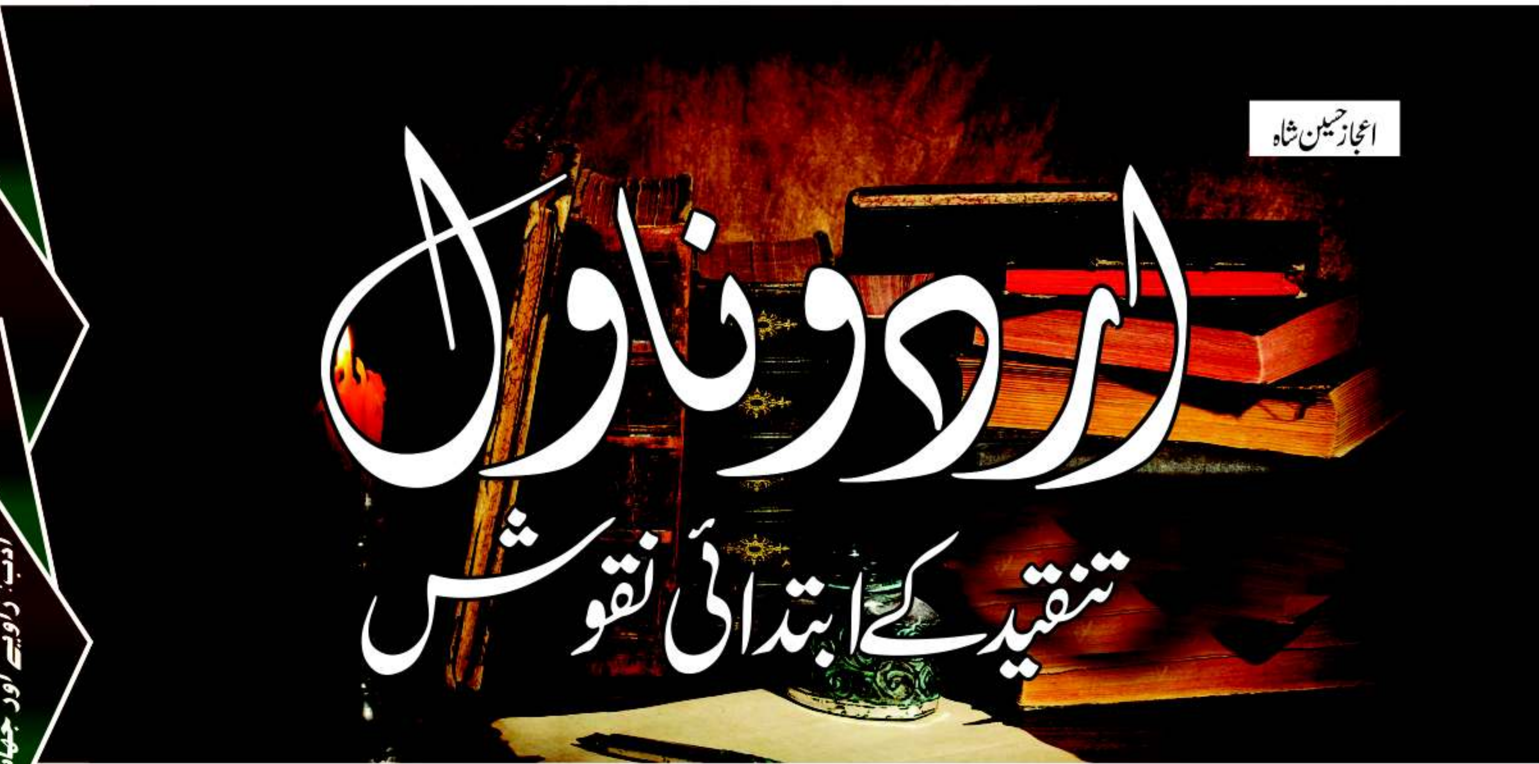

اردو ناول

تنقید کے ابتدائی نقوش

اعجاز حسین شاہ

اردو ناول کی روایت کے تانے بانے مغربی ادب سے جوڑتے ہوئے دیکھیں تو ڈپٹی نذیر احمد نے ڈینیل ڈیفو کے ناول ''رابنسن کروسو (Robinson Crusoe) کے تتبع میں بچیوں کی تربیت کی خاطر اصغری اور اکبری کا قصہ رقم کیا اور یوں اردو کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' (1869) منظر عام پر آیا۔ اگر چہ اردو ناول کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں دلی میں ہوئی لیکن لکھنو میں عبدالحلیم شرر نے پہلی بار اپنے مضامین میں ناول کا لفظ استعمال کیا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستانی فکر وشعور میں واضح طور پر تبدیلی آ چکی تھی۔ داستان کے خیالی قصوں سے حقیقت نگاری کی طرف سفر بڑی تیزی سے طے ہو رہا تھا اور ہندوستان میں اردو ناول لکھنے کی روایت با قاعدہ قائم ہو چکی تھی۔ آغاز میں اردو ناول نگاری کے ساتھ سانحہ یہ رہا کہ ناول کی ابتدا ان ناول نگاروں کے ہاتھوں ہوئی جو اصلاحی، تبلیغی اور مقصدی نقطہ نظر رکھتے تھے اور ناول کے فنی لوازمات سے پوری طرح آگاہ نہ تھے، دوسرا اس صنف سے پہلے شاعری کی کئی صدیوں پر محیط مستحکم روایت موجود تھی۔ یہ ناول نگار بھی اپنے ناولوں میں شاعری کی سی تاثیر پیدا کر کے عوامی توجہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے، اسی لیے ابتدائی ناولوں میں زندگی کا مشاہدہ تو ہے لیکن پیش کش سطحی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا کے بعد اردو ناول کی ایک مضبوط روایت قائم ہوگئی۔

اردو میں صنف ناول کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اس پر تنقید بھی شروع ہوگئی۔ ناولوں کے دیباچوں، تبصروں اور تقریظوں کی صورت میں ناول کی تنقید کے ابتدائی نمونے منظرِ عام پر آئے۔

ان دیباچوں، تبصروں اور تقریظوں کے علاوہ ناول کی پیدائش سے لیکر بعد کی آٹھ دہائیوں تک اس صنف کی تنقید میں کوئی معتبر تصنیف اور کوئی جامع تحریر سامنے نہیں آئی۔ اس کی ایک وجہ یہ رہی کہ اس عرصہ میں کسی نقاد کے لیے شاعری پر لکھنا ہی معتبر تنقیدی پیمانہ سمجھا جاتا تھا اور نثر پر بات کرنا ادبی شان کے خلاف تھا اور دوسری وجہ یہ رہی کہ یہ صنف ابھی ابتدائی دور سے گذر رہی تھی اور اس کے لیے تنقیدی پیمانے رائج ہو رہے تھے۔ دوسری بات اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ ابتدا میں شاعری کے فنی اور موضوعاتی پیمانوں کو فکشن کے لیے بھی برتا جاتا رہا ہے حالاں کہ فکشن کی تنقید کے تقاضے شاعری کی تنقید سے منفرد ہیں۔

اردو ناول کی تنقید کا پہلا نقش جس کی طرف بہت کم ناقدین نے توجہ دی ہے وہ مولوی کریم الدین کا 'پیشانی' کے عنوان سے لکھا گیا ان کی تصنیف ''خط تقدیر'' کا دیباچہ ہے۔ عمومی طور پر ناقدین نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے دیباچوں کو اردو ناول کی تنقید کا آغاز قرار دیا ہے۔ جب کہ ان سے کچھ عرصہ قبل مولوی کریم الدین نے اپنے تحریر کردہ قصے ''خط تقدیر (1862)'' کے دیباچے (پیشانی) میں جدید کہانی (ناول) کے بارے میں جدید تنقیدی نظریات بیان کیے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ قصہ پہلا ناول ہے یا نہیں لیکن اس قصے کا دیباچہ اردو ناول کی تنقید کا نقش اولیں ضرور ہے۔ مولوی کریم الدین نے اس دیباچے میں پرانے لکھنے والوں پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ جدید قصے کے متعلق اس وقت کے لحاظ سے دو بنیادی اور اہم باتوں کو پیش کیا، اول داستان کے برعکس جدید کہانی میں مافوق الفطرت عناصر کو قصے سے خارج کیا جائے، دوسرا کہانی کی اثر پذیری کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے اس سے مفید کام لینے کا مشورہ دیا۔ ان کے نزدیک ہر پڑھنے یا سننے والا ذہن لاشعوری طور پر کہانی سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔

''ہر قصہ نویسی کے نتیجہ اہم اور غرضِ اعظم کی طرف ان کا ذہن نہ گیا، وہ یہ تھا کہ جس طرح ہر قصہ خوانی سے دل بہلتا ہے اور آدمی کا غم ٹلتا ہے اسی طرح طبائع انسانی پر اثر بھی اس قصہ کا اسی طرح پر ہو جایا کرتا ہے جس روش کی باتیں اس کہانی میں درج ہوتی ہیں یا ان کے مطابق پڑھنے اور سننے والوں میں ایسی عادات بد یا نیک پیدا ہو جاتی ہیں کہ ان کو خبر بھی ہرگز نہیں ہوتی کہ ہم میں عادات بد یا نیک پیدا ہوگئی ہیں''۔[1]

وہ کہانی کی دوسری فنی خوبیوں کے متعلق مزید رقم طراز ہیں:

''کہانی ایسے طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سنے اس کو خیال ہو کہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے۔ اور زبان اس قصہ کی اردو خالص اور سلیس، اور محاورات دلچسپ، روزمرہ ٹھیک، اشعار حسب موقع قابل یاد رکھنے کے ہوں تاکہ اس زمانہ کے طلبا کو شوق نئی تصنیف کرنے اور مضامین حقیقہ لکھنے کی ترغیب ہو''۔[2]

مولوی کریم الدین کے یہ پیش کردہ نظریات وبیانات جدید تنقیدی نقطہ نظر کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔مولانا حالی کی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' مولوی کریم الدین کی اس تحریر سے تقریباً تیس سال بعد شائع ہوئی۔جس میں شاعری کا سماج ومعاشرے سے رشتہ جوڑنے کی بات کی گئی۔شاعری کے سابقہ موضوعات جس میں گل وبلبل، ہجر ووصال اور عشق و عاشقی کے قصے نمایاں تھے۔ان کی جگہ مشورہ دیا گیا کہ گل وبلبل اور ہجر ووصال کی باتیں بہت ہوچکیں ہیں اب شاعری کو زندگی کی حقیقتوں سے جوڑا جانا چاہیے۔اس طرح کے خیالات کا اظہار مولوی کریم الدین 1862 میں کر رہے ہیں جو جدید تنقیدی نقطہ نظر سے اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔وہ قصے کی تاثیر کے ساتھ ساتھ محیرالعقول واقعات اور مافوق الفطرت عناصر کو کہانی سے خارج کرنے کے حق میں ہیں اور زور دے رہے ہیں کہ کہانی میں مضامین حقیقی بیان ہونے چاہییں۔انھوں نے نئے انداز کی کہانی کے خدوخال واضح کرتے ہوئے جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ان کا خلاصہ درج ہے۔

(الف) ایشیائی قصوں کی پرانی روش اور طرز چھوڑ کر نئے طریقے سے کہانی لکھنا۔

(ب) قصے کا پیرایہ ایسا ہو جس کا اثر انسان کی طبع پر ہو۔

(ج) جو شخص پڑھے، اسے اپنے حسب حال معلوم ہو یعنی واقعتاً کہانی زمین پر بسنے والے انسانوں کی ہو۔

(د) قصہ خوانی انسان کو مسرت وانبساط کے علاوہ بصیرت وبصارت بھی عطا کرے۔

(ر) نئے لکھنے والوں کو حقیقی مضامین کی ترغیب ہو۔

مذکورہ بالا نکات سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مولوی کریم الدین نہ صرف ناول کی تنقید کے نقش اولیں ہیں بلکہ اردو ادب کی تاریخ کے پہلے جدید نقاد بھی ہیں۔مزید حقیقت نگاری کی روایت میں بھی ان کی اولیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

بہت سے ناقدین نے نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' (1869) کے دیباچے میں لکھے گئے ان الفاظ کو اردو ناول کی تنقید کا ابتدائی نقش مانا ہے جس میں نذیر احمد ناول کے صرف مقصدی پہلوؤں کو ہی اجاگر کر رہے ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اردو ناول کی بنیاد کو مضبوط کیا۔اردو ناول کی تاریخ میں ان کے ناول ''فسانہ آزاد'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔یہ ناول پہلی مرتبہ 1880 میں نول کشور پریس لکھنو سے شائع ہوا جس کے دیباچے میں مصنف نے تین اہم باتوں کا ذکر کیا ہے۔

الف۔ناول کی اصطلاح پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کی گئی ہے۔

ب۔ یہ کہ فسانہ آزاد انگریزی ناولوں کے ڈھنگ پر لکھا گیا ہے۔

ج۔ یہ کہ فسانہ آزاد کا کوئی واقعہ بعید از قیاس نہیں بلکہ تمام واقعات حد ممکنات میں ہیں۔3

سرشار کے بارے میں احسن فاروقی کی رائے ہے:

''ناول سے سچا ذوق حاصل کرنے والے کے لیے اور سچے مذاق کی ناول لکھنے والے کے لیے پہلے سرشار کے پیر چھولینا ضروری ہے''۔4

عبدالحلیم شرر نے معاشرتی اور تاریخی ناول لکھ کر اردو ناول کی روایت کو مستحکم کیا۔انھوں نے ہی اردو میں پہلی بار اپنی تصنیفات کے لیے ناول کا لفظ استعمال کیا اور ناول کے متعلق مضامین بھی لکھے۔ رسالہ دل گداز میں چھپنے والے ناول کے حوالے سے شرر کے مضامین بھی اردو ناول کی تنقید کے ابتدائی نقوش ہے۔ جس میں انھوں نے ناول کے آغاز اور اس کے فن پر سرسری انداز میں بات کی ہے۔

ناول کی تنقید کے ابتدائی نقوش کے سلسلے میں ایک اور اہم حوالہ مرزا ہادی رسوا کے تنقیدی نظریات ہیں۔انھوں نے اپنے ناول ''افشائے راز'' (1894) اور اس کے بعد ''ذات شریف'' (1900) کے دیباچوں میں ناول نگاری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان دیباچوں کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین میں بھی فن ناول نگاری کے متعلق بعض آرا مل جاتی ہیں، یہ مضامین ناول کی تنقید میں ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔مرزا رسوا کی یہ تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ ناول کا کس قدر جدید شعور رکھتے تھے:

''نظم ایک طرف، نثر میں بھی جہاں تک میں نے خیال کیا ہے یہی نقص پایا جاتا ہے۔اکثر ناول جو اس زمانہ میں لکھے گئے ان سب میں ایک ہی طرح کے منظر ہوتے ہیں، اور وہی ہر پھر کے آتے ہیں۔جیسے اس شہر میں ایک غریب تھیٹر تھا جسے لوگ مذاق سے چھیڑا کمپنی کہتے تھے، اس میں چند پردے تھے خواہ مخواہ تماشہ میں وہی پردے بار بار دکھائے جاتے تھے خواہ ان کا محل ہو یا نہ ہو۔اکثر تقلید پیشہ ناول نویسوں نے رینالڈ کے ناول انگریزی میں پڑھے ہیں، اس کے مضامین جس قدر یاد رہ گئے ہیں اس کو اپنے ناولوں میں صرف کرتے ہیں۔ قصہ میں بھی کوئی جدت نہیں ہوتی۔ میں نے کسی انگریزی کتاب میں انگلستان کے ناول نویسوں کے پلاٹ (قصہ) کی یک عام صورت پڑھی تھی۔اس کا ذکر اس موقعہ پر لطف سے خالی نہیں۔واقعی ناولوں میں اس کے سوا ہوتا ہی کیا ہے''۔5

واضح رہے کہ ابتدائی ناول نگاروں نے ناولوں کے دیباچوں میں کہانی کی وضاحت اور مقصد کو بیان کرنے کی حد تک ہی اکتفا کیا ہے۔ان ابتدائی تنقیدی نقوش میں تنقید کی گہری بصیرت موجود نہیں جو ناول کے موضوع اور فن کو گرفت میں لے سکے۔اسی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ 1973 میں منظر عام پر آنے والی یوسف سرمست کی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' کے تعارف میں لکھتی ہیں کہ:

''اُردو میں تنقید کا وجود اقلیدس کا فرضی خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر ہو نہ ہو ناول کی تنقید کا جہاں تک تعلق ہے یہ بیان حقیقت بن جاتا ہے۔اُردو میں ناول پر تحقیق تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔تحقیق کی کم مائیگی نے تنقید کی راہیں بھی ناہموار کردیں۔ایک عرصہ تک تو اس جدید صنف یعنی ناول کو جو بجائے خود ایک ''وحدت'' ہے داستان اور قصص کی کثرت میں گم کردیا گیا۔یعنی اسے داستان اور قصے ہی کے مماثل قرار دے دیا گیا اور ممیّز نہیں کیا گیا۔ بالآخر اس کی سمت متعین ہوئی۔اور تکنیک کے اعتبار سے اس کو علاحدہ صنف مانا گیا''۔6

اردو ناول کی ابتدائی تنقید کے ضمن میں جو مضامین منظر عام پر آئے ان میں لاہور سے چھپنے والے رسالہ ''اوراق'' میں ذکاء الدین شایان کا مضمون ''ناول کی زبان'' اور پرویز پروازی کا مضمون ''ناول کے عناصر ترکیبی'' کو ایک اہم اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ یہ دونوں پہلے ایسے مضامین ہیں جن میں ناول کے فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ذکاءالدین شایان کا مضمون ''ناول کی زبان'' پہلا ایسا مضمون ہے جس میں ناول کے ایک اہم جز'زبان' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔اس مضمون میں ذکا الدین شایان نے اردو ناول میں استعمال کی جانے والی زبان اور دیگر نثری اصناف کی زبان کے مماثل اور امتیاز پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔وہ ناول کے لیے

شاعرانہ زبان کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سیدھی سادی زبان بغیر تشبیہات و استعارات کے داستان کی زبان ہوسکتی ہے مگر ناول کی نہیں۔ ناول نگار کو کسی واقعے، جذبے یا احساس میں شدت پیدا کرنے لیے شعری لوازمات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ ناول کے مقصد کا تعین کرتے ہوئے ناول کی زبان کو نثر اور شاعری کے درمیان کی زبان قرار دیتے ہیں:

''ناول کی زبان کا تعین اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اس صنف اور اس کے مقصد کا تعین نہ کرلیا جائے ناول اپنی ہیئت کے اعتبار سے نثر کی صنف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے جملوں کی ساخت اور تراکیب میں ہی اصول کارفرما ہوتے ہیں جو نثر کے لیے ضروری قرار دیے جاتے ہیں۔ ناول نگار خواہ قصہ بیان کرے، خواہ کرداروں کے اعمال اور نفسیات کی تشریح کرے یا ماحول کا خاکہ کھینچے، اسے نثر ہی کا میڈیم اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ناول کی نثر کا انداز کیسا ہونا چاہیے عام نثر اور ناول کی نثر میں کیا فرق ہے؟ تخلیقی نثر اور علمی نثر کے کیا حدود ہیں؟ اور پھر نثر یہ شاعری اور شاعرانہ نثر کہاں کہاں اور کس کس طرح مختلف ہوتے ہوئے بھی تخلیقی عمل کے دوران ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں، ان سب باتوں کو ذہن میں رکھے بغیر ناول کی زبان پر کوئی فیصلہ صادر کردینا بے سود ہوگا۔

ناول کی زبان کے بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اسے صرف نثر کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ نثر کا خیال آتے ہی ہمارے دماغ سے وہ شعری لوازم یک لخت غائب ہو جاتے ہیں جو شاعری کے لیے نہ صرف ضروری ہیں بلکہ اس کا حسن اور زیور ہیں اور جو نثر کے لیے بے کار سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی رموز و علائم، اشارات، تشبیہات اور استعارات وغیرہ، فنکار جب کوئی بات نثر میں کہتا ہے تو وہ صنائع شعری کا التزام نہیں کرتا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے مافی الضمیر کو آسان اور عام فہم زبان میں قاری تک پہنچا دے۔ نثر کا قاری بھی فنکار سے اتنا ہی مطالبہ کرتا ہے۔ اگر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنف اپنی بات کے بیان میں بے جا لفاظی حالانکہ اس کا بھی تعین کرنا پڑے گا کہ بے جا لفاظی کیا ہوتی ہے، سے کام لے رہا ہے یا اپنے خیال کو خواہ مخواہ استعاروں میں الجھا رہا ہے تو اسے کوفت ہونے لگتی ہے اور وہ ایسی نثر اور ایسے نثر نگار کو

ناول کی زبان کا تعین اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اس صنف اور اس کے مقصد کا تعین نہ کرلیا جائے ناول اپنی ہیئت کے اعتبار سے نثر کی صنف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے جملوں کی ساخت اور تراکیب میں ہی اصول کارفرما ہوتے ہیں جو نثر کے لیے ضروری قرار دیے جاتے ہیں۔

اچھا نہیں سمجھتا۔ اس میں شک نہیں کہ ناول نگار ایک حیثیت سے نثر نگار ہی ہوتا ہے۔ اس کی نثر اگر نثر کے مروجہ اصولوں سے انحراف کرتی ہے تو غلط ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناول کی نثر کیا محض نثر ہوتی ہے یا اس کے دائرے میں شاعری کا بھی دخل ہے۔''[7]

پرویز پروازی نے اپنے مضمون ''ناول کے عناصر ترکیبی'' میں ناول کے تمام فنی اجزا کہانی، پلاٹ، کردار نگاری، زمان و مکاں، محاکات، فلسفہ حیات، نظریہ حیات اور مکالمہ پر وضاحت سے گفتگو کرتے ہوئے اردو ناول میں ان فنی لوازمات کے برتاؤ اور استعمال کے طریقہ کار پر روشنی ڈالی ہے۔ نظریہ حیات پر بات کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں کہ:

''ناول میں نظریہ حیات کا وجود ضروری ہے۔ اس کی تبلیغ ضروری نہیں۔ ناول نگار کھلم کھلا تبلیغ پر اتر آئے تو ناول اپنے فن کی بلندیوں کو نہیں چھوسکتا۔ زندگی کا انقلاب سبک رو ہے۔ فرد کا انقلاب دھیما اور قدم قدم ہوتا ہے۔ اس لیے نظریۂ حیات کا ارتقا پذیر ہونا ضروری ہے۔ نظریہ آہستہ آہستہ تشکیل اور ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ اس فطری طریق انقلاب کو ناول میں بھی قائم رہنا چاہیے۔ نظریاتی اور مقصدی ناولوں میں اس عنصر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ آغاز کار میں ہی یہ جتا دینا کہ اس ناول میں فلاں امر کی تبلیغ کی جائے گی تنافر (REPULSION) پیدا کرتا ہے۔ ناول میں فلسفہ حیات پر بات پیش کرنے کے دو طریق ہیں۔ اول یہ کہ ناول نگار کسی ایسے مسئلہ پر اظہار رائے کرے جو اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہو۔ اخلاقیات کا تصور چونکہ اضافی ہے۔ اس لیے قاری کو اس سے صرف اس حد تک دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ مصنف کے نظریات ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے مسائل پر رائے دیتے وقت ناول نگار بڑا محتاط ہو- بلکہ حد سے زیادہ محتاط ہو۔ کردار چوں کہ مصنف کا آلہ کار ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی حرکات و سکنات میں سے کسی ایک حرکت یا سکون پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس طرح اپنے نقطۂ نظر کو اجاگر کرلیتا ہے۔ یا پلاٹ میں ایسی گنجائشیں پیدا کرلیتا ہے کہ تنافر کی صورت پیدا نہ ہو۔''[8]

اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری پر متعدد تنقیدی مضامین علی گڑھ سے نکلنے والے سہ ماہی رسالہ ''فکر و نظر'' 1994 (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) میں چھپے۔

ان تنقیدی مضامین میں ڈپٹی نذیر احمد جو کہ اردو کے پہلے ناول نگار تسلیم کیے گئے ہیں، کی ناول پر مبنی تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ اور ان کے فن کو ناول نگاری کے متعین کردہ اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ اردو ناول کی تنقید کے وہ ابتدائی نمونے ہیں جو کسی مخصوص ناول نگار کی تخلیقات اور اس کے فن پر دلالت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر خورشید احمد کے مذکورہ بالا مضمون بعنوان ''نذیر احمد کا فکشن، فکری و فنی تناظر'' کا یہ اقتباس دیکھیے جس میں وہ نذیر احمد کے ناولوں کی کردار نگاری کے متعلق آل احمد سرور کی رائے کی تردید کرتے ہوئے دلائل کے ساتھ نذیر احمد کے ناولوں کے کرداروں کو حالات و وقتی تقاضوں کے بموجب اور تابع بتاتے ہیں۔

نذیر احمد کے ناولوں کی حقیقت اور غایت کو نظر انداز کرنے کے سبب مختلف قسم کی فنی غلط فہمیاں ہماری تنقید میں راہ پاگئی ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر آل احمد سرور کو اس امر کا احساس تو ہے کہ نذیر احمد کی کہانیاں تعلیمی اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ یہ شروع سے مقصدی تھیں اور اصلاحی، لیکن اس کے باوصف وہ نذیر احمد کی کردار نگاری سے مطمئن نہیں۔ ان کا خیال ہے اور اس خیال کو اردو میں بہت شہرت ملی کہ نذیر احمد کردار نگاری کے گر سے پوری طرح واقف نہیں۔

ان کے کردار فرشتے ہوتے ہیں یا شیطان اگر افسانوی کرداروں سے بحث کرنے کے لیے حقیقی زندگی کے کرداروں کو معیار تسلیم کر لیں تو سرور صاحب کی شکایت بجا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بیانیہ کے جدید نظریہ ساز اس طریقہ تعبیر کو درست نہیں سمجھتے۔ وہ افسانوی اشخاص اور حقیقی زندگی کے اشخاص کو الگ الگ تصور کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ فکشن میں کردار تفاعلی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اُن کی تشکیل کسی خاص مقصد کے لیے ہوتی ہے جب کہ حقیقی افراد اپنی انفرادی خود مختاری کے حامل ہوتے ہیں۔ اسے ثابت کرنے کے لیے جدید نظریہ ساز کئی طرح کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حقیقی اشخاص اپنے ماحول کے پیداوار ہوتے ہوئے بھی اُس سے ماورا جا سکتے ہیں لیکن فکشن کے کرداروں کو ان کے ماحول سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم سوال کریں کہ حقیقی زندگی میں زید اگر کسی صورت حال سے دوچار ہو تو اس کا طرز عمل کیا ہوگا؟ اس سوال کے جواب میں معقول حد تک قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ توبتہ النصوح کا کلیم ابن الوقت کی صورت حال میں کیسا برتاؤ کرے گا تو اس کا نتیجہ ناقابل توثیق قیاس آرائیوں کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ افسانوی کردار کے تجزیے سے متعلق معمولی سے معمولی تفصیل بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور اُسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مگر حقیقی افراد کے بارے میں کوئی فیصلہ دیتے وقت ہم کئی باتوں کو غیر ضروری اور اتفاقی سمجھ کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی حقیقی شخص کے نام کے بارے میں ہم یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ نام اُس شخص کی سیرت پر کوئی روشنی ڈالے گا لیکن افسانوی فرد کے نام سے ہم بجا طور پر یہ توقع کرتے ہیں کہ یہ نام اس افسانوی شخص کے کسی مخصوص وصف کا اشاریہ ہوگا۔

ڈاکٹر اشفاق محمد خان کی کتاب ''نذیر احمد کے ناول (1979)'' میں شامل تین مضامین ''نذیر احمد کے ناول اور ان کے موضوعات''، ''بحیثیت ناول نگار نذیر احمد کی خامیاں'' اور ''اردو ناول میں نذیر احمد کی اولیت'' کو ناول کی تنقید کے ابتدائی مضامین کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں انھوں نے نذیر احمد کے فن اور ان کے ناولوں کے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انھوں نے نذیر احمد کے ابتدائی زمانہ ناولوں میں واقعات، پلاٹ اور کرداروں میں پائی جانے والی خامیوں کی نشان دہی کو اس طرح بیان کیا ہے:

''نذیر احمد کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے۔ یہ ناول انھوں نے بچیوں کے لیے لکھا تھا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں اکبری کا قصہ ہے اور دوسرے میں اس کی چھوٹی بہن اصغری کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ دونوں قصے الگ ہیں جن میں اکبری اور اصغری ہی مرکزی کردار ہیں۔ نذیر احمد نے ان دونوں آزاد قصوں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تکنیک ہمیں داستانوں کے قصوں میں جا بجا ملتی ہے۔ اس طرح اس کا پلاٹ نہایت سادہ ہے۔ جدید ناول کی طرح ہمیں اس میں منازل حیات اور احساس تناسب نہیں ملتا۔ قصے کے درمیانی حصے میں ایک حکایت اور دور اندیش خان کے دو نصیحت آمیز خطوط پورے قصے کا جز نہیں بن سکے۔ دوسرے خط پر قصے کا خاتمہ غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔

''نذیر احمد کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے۔ یہ ناول انھوں نے بچیوں کے لیے لکھا تھا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں اکبری کا قصہ ہے اور دوسرے میں اس کی چھوٹی بہن اصغری کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ دونوں قصے الگ ہیں جن میں اکبری اور اصغری ہی مرکزی کردار ہیں۔

دوسرا ناول ''توبتہ النصوح'' ہے اس میں پہلے ناموں کی بہ نسبت فنی نزاکتوں کا قدرے اہتمام ملتا ہے لیکن واقعات کی تنظیم میں ناول کی طرح ربط نہیں ہے۔ داستانوں سے مشابہ اس قصے کی بنیاد ایک طویل خواب پر رکھی گئی ہے۔ داستان نویس بھی اکثر اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہیرو کو خواب دکھا کر محبوب کے گھر کی طرف سفر کراتے تھے۔''[10]

ان متذکرہ مضامین کے علاوہ اردو زبان وادب کے دیگر ممتاز رسائل وجرائد میں ناول کے فن اور ناول نگاروں کی تخلیقات پر چیدہ چیدہ تنقیدی مضامین چھپتے رہے ہیں جن کی اہمیت وافادیت مسلم ہے اور جنھیں بعد کی تنقید کا پیش خیمہ کہا گیا ہے۔ جن میں صلاح الدین احمد کا مضمون ''اردو ناولوں میں طوائف کا کردار، (ادبی دنیا لاہور، مارچ 1947)''، سوہن راہی کا مضمون ''کرشن چندر (ماہنامہ قومی آواز کراچی، 1977)'' اس مضمون میں سوہن راہی نے کرشن چندر کے افسانوں اور ناولوں کے موضوعات پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صادق اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا مشترکہ مضمون ''عصمت چغتائی عصر حاضر کی ایک بے مثال تخلیقی فنکار (ماہنامہ قومی زبان اگست 1981)''، ڈاکٹر قمر رئیس کا مضمون ''عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر (ماہنامہ قومی زبان ،اگست 1981)'' وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

ان تنقیدی مضامین سے قطع نظر کسی ناول نگار کی خدمات پر لکھی جانے والی پہلی کتاب سید افتخار عالم بیگد امی ثم المارہروی کی ''حیات النذیر'' (1912) ہے۔

حوالہ جات

1۔ محمود الٰہی۔ اردو کا پہلا ناول خط تقدیر دانش محل لکھنو 1965 ص 38
2۔ محمود الٰہی۔ اردو کا پہلا ناول خط تقدر دانش محل لکھنو 1965 ص 37
3۔ اسلم آزاد۔ اردو ناول آزادی کے بعد سیمانت پرکاش نئی دہلی 1990 ص 26
4۔ احسن فاروقی۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ (دوسرا ایڈیشن)۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ص 99
5۔ مرزا ہادی رسوا۔ مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات، دیباچہ و تعلیقات، ڈاکٹر محمد حسن، ادارہ تصنیف علی گڑھ 1961
6۔ ڈاکٹر یوسف سرمست بیسویں صدی میں اردو ناول (تعارف) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 2000 ص 9
7۔ رسالہ اوراق لاہور، شمارہ خاص 1968 مضمون نگار ذکا الدین شایاں، مضمون ''ناول کی زبان'' ص 97
8۔ رسالہ اوراق لاہور، سالنامہ جنوری 1967 مضمون نگار پرویز پروازی مضمون ''ناول کے عناصر ترکیبی'' ص 168
9۔ رسالہ فکر و نظر (سہ ماہی) علی گڑھ خصوصی شمارہ، ڈپٹی نذیر احمد نمبر 1994 ص 51
10۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خان ''نذیر احمد کے ناول'' جمال پریس، دہلی 1979 ص 192-193

■

Dr. Ajaz Hussain Shah
Assistant Professor
Govt. PG College Rajouri-185133
Mob. 7051773278
Email: ajazh9004@gmail.com

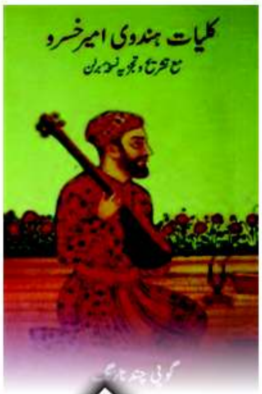

آمینہ بیگم

امیر خسرو

قوالی اور قومی یکجہتی کے علمبردار

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان زمانۂ قدیم ہی سے علم وفن کا گہوارہ رہا ہے۔ مسلم حکمرانوں نے ہمیشہ ماہرینِ فن کی سرپرستی کی۔ بعض لوگ مسلمانوں کی اس بیش بہا تہذیبی دین کا اعتراف نہیں کرتے، حالانکہ مسلمانوں نے نہ صرف ہندوستانیوں کی طرزِ فکر کو متاثر کیا بلکہ ان کے بھگتی مارگ، طرزِ معاشرت، آدابِ محفل، لباس، فنِ تعمیر، مصوری، ادبیات اور موسیقی پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو اُس نزاکت، لطافت اور سلیقے سے روشناس کرایا جو ایرانی تمدن کا خاصہ ہے۔

ہندوستان کے رسم و رواج، گھریلو زندگی، لباس، خانہ داری کے اطوار، شادی بیاہ کی رسومات، موسیقی، گنبد اور مینار کا رواج ترکوں کے ذریعے ہندوستان میں آیا۔1 ایرانی تمدن نے اس انداز سے آرائش و زیبائش کو فروغ دیا اس کے نتیجے میں ہندوستانی معاشرے میں تہذیب وتمدن اور فنونِ لطیفہ مذید تنوع حاصل ہو۔ ہندوستانی موسیقی مشترکہ قومیت، قومی و سماجی روایات اور قومی یکجہتی کی روشن علامت ہے۔ اگر قومی یکجہتی کو فروغ دینا ہے تو یہ صرف اتحاد و اتفاق کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

امیر خسرو کے اسلاف

یہاں امیر خسرو کے اسلاف کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک نے دہلی میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ ایبک کے بعد اس کا ترک غلام شمس الدین التمش دہلی کا سلطان بنا۔ اس نے منگلوں کے حملوں کو روکا اور پناہ گزینوں کے لیے دہلی کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے۔ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا گیا اور انھیں مناسب عہدے عطا کیے گئے۔ التمش کی دریا دلی اور فراخ دلی کے باعث کثیر تعداد میں لوگ دہلی کا رخ کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی کو ''عروس البلاد'' کہا جانے لگا۔ امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود بھی انہی پناہ گزینوں میں شامل تھے۔2

امیر خسرو کے والد لاچین قبیلے کے ترک تھے۔ اُس زمانے میں سپاہیوں کو ہزار، پانچ ہزار اور دس ہزار جیسے عہدے دیے جاتے تھے۔ ایک ہزار سپاہیوں کے دستے یا لشکر کو جس علاقے سے تعلق ہوتا، وہی اس قبیلے کی شناخت بن جاتا اور وہ علاقہ ''ہزارہ'' کہلاتا تھا۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک علاقہ ''ہزارہ'' کے نام سے معروف تھا۔ جب چنگیز خان نے جلال الدین خوارزم شاہ کا تعاقب کرتے ہوئے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی تو ہزارہ قبیلے کے کچھ ترک یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ انہی ہزارہ ترکوں میں خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود بھی شامل تھے۔ ان کے قبیلے کا نام ''ہزارہ لاچین'' تھا۔3

امیر خسرو نے اپنی کئی تصانیف اور خود نوشت تحریروں میں خود کو ''لاچین'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ ''لاچین'' ایک ترکی لفظ ہے، جس کے معنی باز یا شاہین کے ہیں۔ ان کے آباو اجداد سلطان شمس الدین التمش کے دربار سے وابستہ تھے۔ ضیاء الدین برنی کی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد کو بارہ ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر تھا اور مومن پورہ، پٹیالی، ضلع ایٹہ کی جاگیر عطا کی گئی تھی، جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی۔ محمد سیف الدین محمود کی شادی عماد الملک کی بیٹی دولت ناز سے ہوئی، جن کے بطن سے چار اولادیں پیدا ہوئیں4: تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ لڑکوں کے نام اعزاز الدین علی شاہ، ابوالحسن یمین الدین خسرو اور حسام الدین تھے۔

امیر خسرو کی پیدائش 1252 میں پٹیالی میں ہوئی۔ اصل نام ابوالحسن یمین الدین۔ ''خسرو'' ان کا تخلص اور ''امیر'' خطاب تھا۔ بعد میں وہ اپنے والد کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔ محمد سیف الدین محمود پچاسی برس کی عمر میں ایک جنگ میں شہید ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد امیر خسرو کی تعلیم و تربیت ان کے نانا عماد الملک نے کی۔ امیر خسرو فارسی، ترکی اور عربی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ میدانِ جنگ کے بھی شہسوار تھے اور فنِ حرب میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ اگر ہم درویشوں سے ان کی محبت کا جائزہ لیں تو وہ اس میدان میں بھی صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ شاہی دربار میں ان کا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ شاعری اور موسیقی میں ان کی اختراعات اور ایجادات ایسی تھیں کہ بعد کے لوگ بھی ان میں ترمیم کی ہمت نہ کر سکے۔ امیر خسرو کو یہ ذوق بچپن ہی میں اپنے نانا عماد الملک کی مجالس میں شرکت سے حاصل ہوا۔ ان محفلوں میں شعرا، ادبا اور علما شریک ہوتے تھے۔ بارہ برس کی عمر تک ان میں غیر معمولی صلاحیتیں پیدا ہو چکی تھیں۔

امیر خسرو نے اپنے عہد کے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت بھی کی۔ ان کی تصانیف تیرہویں اور چودہویں صدی کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مناظر پیش کرتی ہیں۔ امیر خسرو ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہترین شاعر، انشاپرداز، تاریخ نویس، زبان دان، معاملہ فہم، موسیقار اور ظاہری

و باطنی علوم کے ماہر تھے۔ تہذیبی و قومی یکجہتی اور حب الوطنی جیسے اوصاف میں بھی وہ نمایاں مقام رکھتے تھے۔

امیر خسرو کو دنیا بھر میں مقبول بنانے والی سب سے بڑی چیز ان کا جذبہ حب الوطنی تھا۔ انھیں ہندوستان سے والہانہ محبت تھی۔ یہاں کے رسم و رواج، طور طریقے، تہذیب، قوم، موسیقی اور ہندوستان کی سرزمین کے ذرے ذرے سے انھیں عشق تھا، جس کا ذکر انھوں نے اپنی تصانیف میں جا بجا کیا ہے۔ ان کی وطن دوستی کے بارے میں مختلف محققین نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ''خسرو شناسی'' کے مصنف ڈاکٹر منیر الحق لکھتے ہیں کہ امیر خسرو نے اپنی ایجادات، افکار، نظریات، تصانیف اور کردار کے ذریعے ہندوستانیوں میں قومی شعور کو پروان چڑھایا۔ امیر خسرو کی وطن سے محبت منطقی حدود سے بھی آگے بڑھ جاتی تھی۔ اسی جذبے کے تحت امیر خسرو نے اپنی مشہور تصنیف ''نہ سپہر'' میں ہندوستان کی عظمت اور اس سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے۔

امیر خسرو پہلے ایسے شخص تھے جنھوں نے حب الوطنی کے نغمے گائے۔ انھوں نے اپنی ایجادات، تصانیف، خیالات اور نظریات کے ذریعے ہندوستانیوں میں قومی جذبے کو فروغ دیا۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے موسیقی، قوالی، تصوف اور شاعری کو وسیلہ بنایا۔ امیر خسرو نے قومی یکجہتی، رواداری، انسان دوستی، محبت اور اخوت کا پیغام عام کیا۔

ایرانی اور عربی موسیقی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان آئی۔ اس تعلق سے انور عنایت اللہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ جب مسلمان عرب اور ایران سے ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ ایک نئی اور ترقی یافتہ تہذیب لائے، جس میں موسیقی بھی شامل تھی۔ امیر خسرو کو موسیقی سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ فارسی زبان میں ''موسیقی'' کا لفظ ایک پرندے ''ققنس'' سے ماخوذ بتایا جاتا ہے، جس کی چونچ سے راگ راگنیاں نکلتی ہیں۔ عبرانی زبان میں یہ لفظ دو الفاظ ''موسا'' اور ''قی'' سے مرکب ہے۔ ''موسا'' کے معنی ''ہوا'' اور ''قی'' کے معنی ''گرہ'' کے ہیں، یعنی ''ہوا میں گرہ لگانا''۔ عربی زبان میں اسے ''موسیقی'' یا ''غنا'' کہا جاتا ہے، جس کے معنی نغمہ، سرور یا خوشی میں گانا کے ہیں۔ امیر خسرو نے ایرانی موسیقی میں نئی نئی راگیں ایجاد کیں۔ بڑے بڑے صاحبِ کمال موسیقار اور گویے آپ کی شاگردی کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کا ایک مشہور موسیقار گرو گوپال نایک تھا، جس کے تقریباً بارہ سو شاگرد تھے۔ اس کے شاگرد استاد کا تخت اٹھا کر چلتے تھے۔ جب اس کی شہرت کا چرچا علاؤالدین خلجی تک پہنچا تو اسے دربار میں طلب کیا گیا۔ اس محفل میں امیر خسرو بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ موجود تھے۔

امیر خسرو پہلے ایسے شخص تھے جنھوں نے حب الوطنی کے نغمے گائے۔ انھوں نے اپنی ایجادات، تصانیف، خیالات اور نظریات کے ذریعے ہندوستانیوں میں قومی جذبے کو فروغ دیا۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے موسیقی، قوالی، تصوف اور شاعری کو وسیلہ بنایا۔ امیر خسرو نے قومی یکجہتی، رواداری، انسان دوستی، محبت اور اخوت کا پیغام عام کیا۔

گوپال نایک پہلے ہی امیر خسرو کی شہرت سن چکا تھا، اس لیے اس نے امیر خسرو سے راگ سنانے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر امیر خسرو نے انکساری سے کہا کہ وہ ہندوستانی موسیقی کے بارے میں کم علم رکھتے ہیں، اس لیے پہلے گوپال نایک اپنی راگ پیش کرے۔ گوپال نایک نے کئی راگ سنائے، جنھیں سن کر امیر خسرو نے فرمایا کہ یہ راگ دراصل میرے ایجاد کردہ ہیں، اور ساتھ ہی ان کی چند غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی اصلاح بھی کی۔ یہ سن کر گوپال نایک حیران رہ گیا۔ امیر خسرو ہندی اور فارسی دونوں موسیقیوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے، اسی لیے انھوں نے راگ اور موسیقی کی دنیا میں ایک نئی ہلچل پیدا کردی۔ گوپال نایک بھی امیر خسرو کے علم و کمال سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آپ کی شاگردی اختیار کرلی۔5

امیر خسرو عالم، فاضل اور بلند پایہ شاعر تھے، بلکہ ایک ماہر موسیقار بھی تھے۔ انھیں ہندوستانی اور ایرانی موسیقی دونوں میں کمال مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی موسیقی امیر خسرو کی مرہونِ منت ہے۔ امیر خسرو بے نظیر محبِ وطن تھے۔ یہاں کے رسم و رواج، طور طریقے، تہذیب، قوم، موسیقی، الغرض ہندوستان کے ذرے ذرے سے ان کو عشق تھا، جس کا ذکر انھوں نے اپنی تصانیف میں جا بجا کیا ہے۔ انھوں نے کئی راگ اور راگنیاں ایجاد کیں۔ قوالی کے بھی موجد مانے جاتے ہیں۔ قوالی کے ذریعے امیر خسرو نے قومی یکجہتی کا پیغام عام کیا۔ وہ عالمی بھائی چارے کے علمبردار تھے۔ قومی یکجہتی دراصل وحدتِ انسانیت کی مضبوط کڑی ہے۔ اگر قوالی کو وحدتِ انسانیت کی ایک اہم ضرورت تصور کیا جائے تو قوالی کی حقیقت کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ قوالی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اپنے آغاز سے لے کر آج تک یہ قومی اتحاد اور باہمی محبت کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

قومی یکجہتی کو سمجھنے سے پہلے لفظ ''قوم'' کو سمجھنا ضروری ہے۔ ''قوم'' اردو میں عربی زبان سے ماخوذ ہے، جس کے معنی انسانوں کے ایک گروہ کے ہیں۔ سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے ایک مخصوص خطۂ ارض، جو ملک کہلاتا ہے، وہاں مختلف رنگ، نسل، فرقے، طبقے، زبانیں اور مذاہب رکھنے والے تمام باشندوں کے مجموعے کو قوم کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا تمام جماعتیں اجزائے قوم کہلاتی ہیں، اور ان اجزا کے درمیان ہم آہنگی ہی کو قومی یکجہتی کہا جاتا ہے۔ ملک کی ترقی کا دارومدار قومی یکجہتی پر منحصر ہوتا ہے۔ آج دنیا کا ہر ملک قومی یکجہتی کے تصور کو تسلیم کرچکا ہے اور قومی شعور کی بیداری اور قومیت کے استحکام کے لیے کوشاں ہے۔ قومی یکجہتی کے جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے سب سے پہلے فرد کی اصلاح ضروری ہے، اور اصلاح کا کام مذہب سے بہتر کوئی اور ذریعہ انجام نہیں دے سکتا۔ اس مقصد کے لیے فرد کو اپنے مذہب کا سچا پیرو کار بنانا اور مذہبی تعلیمات کے ذریعے یہ شعور دینا ضروری ہے کہ انسان کا انسان سے کیا تعلق ہے۔ جب یہ شعور بیدار ہوجائے تو انسان سچا قوم پرست بن جاتا ہے۔

فرد کو قوم سے جوڑنے کے لیے مذہبی تعلیمات کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ بھی نہایت موثر ذریعہ ہیں۔ قوالی کی محفلیں اپنے آغاز سے لے کر آج تک قومی اتحاد کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ قوالی کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی، اُس وقت ہندوستان مختلف صوبوں اور ریاستوں میں تقسیم تھا۔ اگر دہلی ہی کی مثال لی جائے تو وہاں ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر قوموں کی مختلف تہذیبیں، عقائد اور زبانیں موجود تھیں۔ یہ لوگ جنگ، جشن، عیدین اور تہواروں کے مواقع پر ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے ایک ساتھ فتوحات اور شکستیں دیکھیں، ماتم بھی منایا اور خوشیاں بھی بانٹیں۔ ان تمام

اختلافات کے باوجود معاشی، تہذیبی اور سماجی ضروریات کے پیشِ نظر لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر قومی یکجہتی کے خواہاں تھے۔ اس مقصد کے لیے ملک کا دانشور طبقہ ایسے مواقع تلاش کرتا رہتا تھا جہاں ہر رنگ، نسل، ذات پات اور فرقے سے بالاتر ہوکر لوگ ایک جگہ جمع ہو سکیں۔ اس کا سب سے مؤثر ذریعہ فنونِ لطیفہ تھا، کیونکہ فن پرستوں کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے، نہ کوئی ملک اور نہ کوئی قوم۔ فن میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ پوری دنیا اس کی جانب کھنچی چلی آتی ہے۔ اسی لیے موسیقی کو فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ مؤثر مانا گیا ہے۔

چونکہ قوالی کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی اور اس کے سننے والے بھی ہندوستانی تھے، اس لیے اس زبان کا انتخاب کیا گیا جو سب کے لیے قابلِ فہم ہو۔ اس زمانے میں فارسی، ہندی اور سنسکرت زبانیں رائج تھیں، لیکن موسیقی کے لیے رسم الخط کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر اردو ایک موزوں زبان ثابت ہوئی۔ اگرچہ اُس وقت تک اردو کو ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں نے اسے مکمل ادبی زبان کے طور پر قبول کیا تھا، اس کے باوجود امیر خسرو نے قوالی کی ابتدا عربی نثر سے کی اور بعد میں اسے فارسی تک وسعت دی۔ چونکہ عوام عربی کے مقابلے میں فارسی سے زیادہ آشنا تھے، اس لیے فارسی کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

امیر خسرو پہلے شخص تھے جنھوں نے اردو کو ایک ادبی زبان کے طور پر استعمال کیا، اسی لیے انھیں اردو کے اولین مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے قوالی میں اردو کے چند دوہے بھی شامل کیے۔ اردو ایسی زبان تھی جسے ہر طبقے کے لوگ سمجھتے تھے۔ قوالی کے موجد امیر خسرو اور اس کے اولین سرپرست نظام الدین اولیا کے نمایاں کارناموں میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی سرفہرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوالی کا اثر ہر مذہب اور ہر ملت کے افراد پر یکساں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ آج بھی قوالی کی محفلوں میں بلاتفریقِ مذہب وملت ہر طبقے کے لوگ جوق در جوق شریک ہوتے ہیں۔

قوالی امیر خسرو کی ایجاد مانی جاتی ہے۔ امیر خسرو خود کہتے ہیں کہ ''ہندوستان میرا مولد اور میرا وطن ہے''، اسی لیے قوالی کا مقامِ ایجاد بھی ہندوستان ہی قرار پاتا ہے۔ صوفیائے کرام کے عقائد اور تعلیمات نے ہندوستان کی تہذیب میں قابلِ قدر تبدیلیاں پیدا کیں، جن کے

قوالی کے موجد امیر خسرو اور اس کے اولین سرپرست نظام الدین اولیا کے نمایاں کارناموں میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی سرفہرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوالی کا اثر ہر مذہب اور ہر ملت کے افراد پر یکساں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ آج بھی قوالی کی محفلوں میں بلا تفریقِ مذہب وملت ہر طبقے کے لوگ جوق در جوق شریک ہوتے ہیں۔

مذہبی اور سماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ صوفیا نے انسانوں کی مساوات، انفرادیت کی عظمت اور نظامِ عالم میں الوہیت کے تصور کا درس دیا۔ قوالی دراصل قومی یکجہتی اور عوامی بھائی چارے کی علمبردار ہے۔ قوالی کی ایجاد امیر خسرو کے عہدِ حیات کے درمیانی دور، خلجی عہدِ حکومت میں ہوئی۔ امیر خسرو نے صوفیانہ طریقۂ سماع میں بہت سی نئی باتیں اور اصول شامل کرکے اسے ''قوالی'' کے نام سے موسوم کیا۔

قوالی کو سمجھنے سے پہلے ''سَماع'' اور ''سِماع'' کے فرق کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ''سَماع'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ''سننا'' کے ہیں۔ اسی مناسبت سے لفظ ''سِماع'' تشکیل پایا، جس کے مجازی معنی راگ سننے کے لیے جاتے ہیں۔ اصطلاحی طور پر ''سِماع'' کے معنی قرآنِ مجید کی آیات سننے کے ہیں، لیکن صوفیاء کے نزدیک ''سِماع'' ایک مخصوص طرزِ عبادت کا نام ہے، جس میں راگ اور نغمات کا سننا بھی شامل ہوتا ہے۔ 6

دراصل قوالی کی بنیاد صرف موسیقی پر نہیں بلکہ اس کے مضامین اور پیغام پر ہے۔ قوالی میں سر کے مقابلے میں تال کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قوالی ایک فن ہے، یعنی موسیقی کی ایک مخصوص صنف، جس میں چند خوش آواز افراد مشترکہ طور پر راگ، راگنی اور تالیوں کی ہم آہنگی کے ساتھ کلام پیش کرتے ہیں۔ تالی کے ساتھ دف، ستار، طبلہ اور ڈھولک کی آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

''مَن کُنتُ مَولاہُ فَعَلیٌ مَولاہُ''

ترجمہ: ''میں جس کا مولا ہوں، علیؓ بھی اس کے مولا ہیں۔''

صوفیائے کرام ہمیشہ محبت اور اخوت کا پیغام عوام تک پہنچاتے رہے۔ وہ بلا تفریقِ مذہب و ملت تمام انسانوں کو بھائی چارے اور محبت کی تعلیم دیتے تھے۔ امیر خسرو چونکہ نظام الدین اولیا کے مرید و شاگرد تھے، اس لیے انھوں نے قوالی کے ذریعے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک ساتھ بیٹھنے اور محبت و رواداری کے ماحول میں شریک ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ اس کے ذریعے وہ بزرگانِ چشت اور قرآنِ مجید کے ان احکامات پر عمل پیرا ہو سکتے تھے جن میں انسانوں کے درمیان میل جول اور عوامی بھائی چارے کی تاکید کی گئی ہے۔ صوفیا کے نزدیک عبادت دو قسم کی ہے: ایک وہ عبادت جس کا فائدہ صرف عبادت کرنے والے کو پہنچے، اور دوسری وہ جس کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچے، جیسے حسنِ سلوک، صلح کرانا اور انسانوں کے درمیان محبت پیدا کرنا۔ قوالی اسی دوسری قسم کی عبادت کا ایک مؤثر ذریعہ تھی، کیونکہ اس کی محفلوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔

چنانچہ امیر خسرو نے قوالی کو مختلف مذاہب کے لوگوں کو جوڑنے کا وسیلہ بنایا۔ حضرت نظام الدین اولیا کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان محبت اور اتحاد پیدا کرنا عبادت ہے۔ اسی مقصد کے تحت قوالی کو دو مذاہب کے درمیان رابطے اور ہم آہنگی کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قوالی کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ امیر خسرو نے ہندوؤں کے بھجنوں کے بعض اثرات کو بھی قوالی میں شامل کیا۔ ان کا مقصد قوالی کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کی راہیں ہموار کرنا اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا کرنا تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت قوالی کی بنیاد رکھی گئی۔

صفدر علی بیگ اپنی تصنیف ''صوفیا کی تعلیم اور امیر خسرو کا نظریۂ حیات'' میں لکھتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیا نے کبھی قوالی کو محض یادِ الٰہی کا درجہ نہیں دیا، بلکہ اس کی ایک اہم خصوصیت مذہبی ہم آہنگی بھی تھی۔ الغرض، امیر خسرو قوالی کے ذریعے قومی اتحاد کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ 7 آبِ حیات میں مولانا آزاد نے امیر خسرو کی تصانیف کے حوالے سے لکھا ہے کہ قوالی

بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے اور آج بھی اسی طرز سے گائی جاتی ہے۔ اسی لیے سلطان المشائخ نے انھیں ''مفتاح السماع'' کا خطاب عطا کیا۔8 اگر امیر خسرو قوالی کو صرف مذہبی فریضہ قرار دیتے تو وہ مسجد کا رخ کرتے، جہاں صرف مسلمان جمع ہوتے، مگر انھوں نے خانقاہوں کا انتخاب کیا، جہاں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خسرو کے خیالات اپنے پیر و مرشد اور بزرگانِ چشت کے مذہبی رواداری کے نظریے کا حصہ تھے۔

قوالی چونکہ ایک فن ہے، اس لیے امیر خسرو نے اس فن کے ذریعے حب الوطنی، مذہبی ہم آہنگی اور اپنے عہد کے سماجی و سیاسی تقاضوں کو عملی شکل دی۔ قوالی کی ابتدا خانقاہ سے ہوئی، مگر وہیں محدود نہ رہی۔ خانقاہ سے نکل کر یہ شاہی درباروں تک پہنچی اور پھر عوام میں مقبول ہوگئی۔ یوں قوالی قومی یکجہتی کو فروغ دینے کا ایک مؤثر ذریعہ بن گئی۔ مذہبی اجارہ داروں کی ہزارہا کوششوں کے باوجود قوالی خانقاہوں تک محدود نہ رہ سکی، کیونکہ اس کا بنیادی مقصد خدمتِ خلق اور انسانوں کو محبت و اخوت کے رشتے میں جوڑنا تھا۔ قوالی دراصل راگ، راگنی، خیال، قول اور ترانے کا مجموعہ ہے۔ قوالی کی ابتدائی زبان عربی تھی اور اس کا انداز نثری تھا۔ ستار کو بھی امیر خسرو کی ایجاد قرار دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں عبدالحلیم جعفر خاں اپنی تصنیف ''امیر خسرو اور ہندوستانی موسیقی'' میں لکھتے ہیں کہ ستار کی ایجاد حضرت نظام الدین اولیا کے دربار میں ہوئی اور امیر خسرو اپنے کلام کی پیش کش میں ستار کا استعمال کیا کرتے تھے۔

قوالی میں ڈھولک کی ایجاد بھی امیر خسرو سے منسوب کی جاتی ہے۔ ڈھولک قوالی کا ایک اہم جز ہے۔ ''قوالی ڈھولک کے بغیر ادھوری ہے۔''9

اسی طرح طبلہ بھی قول اور ترانے کی ضرورت کے تحت ایجاد کیا گیا اور اسے خاص طور پر قوالی کے لیے موزوں سمجھا گیا۔ قوالی میں تال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ اسلامی روایت میں مردوں کے تالی بجانے کے حوالے سے مختلف آرا پائی جاتی ہیں، لیکن قوالی میں تالی ایک فنی حیثیت رکھتی ہے اور یہی اس کی شناخت بن چکی ہے۔ بعض محققین کے مطابق قوالی میں تال اور تالی کے بعض انداز ہندو بھجنوں سے اخذ کیے گئے۔ اسی طرح ایرانی ساز ''تنبور'' سے ''بینا'' کی ایجاد کا ذکر بھی ملتا ہے۔ امیر خسرو نے قوالی میں ترانے کے بول شامل کیے تاکہ راگنی کی اصل صورت برقرار رہے۔ قوالی کے ابتدائی مضامین اقوالِ رسولؐ پر مشتمل تھے، یعنی حضور اکرمؐ کے وہ مبارک ارشادات جو عربی نثر میں منقول ہیں۔ ان اقوال میں خصوصاً حضرت علیؓ کے ارشادات کو بھی شامل کیا گیا۔

قوالی میں کلمۂ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' اور ''اللہ ہو'' جیسے اذکار شامل کیے گئے، جس کے باعث قوالی مسلمانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ حضور اکرمؐ کے اقوال اور کلمۂ طیبہ کے بعد امیر خسرو نے اپنے عربی اقوال بھی قوالی میں شامل کیے۔ امیر خسرو نے عوام و خواص کی زبان، یعنی اردو یا ہندوی، کو بھی قوالی کا حصہ بنایا، کیونکہ یہ زبان قومی یکجہتی کے فروغ کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ انھوں نے اپنے اردو اور ہندی دوہے، جو حمد، نعتِ رسولؐ اور نظام الدین اولیا کی مدح پر مشتمل تھے، قوالی میں پیش کیے۔ یہی نہیں بلکہ امیر خسرو نے تصوف کے مضامین کو بھی قوالی میں شامل کیا، جن کے ذریعے تمام مخلوق کو خالقِ حقیقی کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیا گیا۔ تصوف کی اسی خصوصیت نے قوالی کو ہر مذہب میں مقبولیت عطا کی، یہاں تک کہ بے شمار غیر مسلم بھی قوالی میں دلچسپی لینے لگے۔

امیر خسرو نے سب سے پہلے قوالی کو حضرت نظام الدین اولیا کے دربار میں پیش کیا اور یہیں سے قوالی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ صوفیائے کرام کی دلچسپی کے پیشِ نظر قوالی میں صوفیانہ کلام بھی شامل کرلیا گیا۔ اس طرح قوالی نے قومی یکجہتی اور بھائی چارے کے جذبات کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بعد میں مزاروں پر بھی قوالی کی محفلیں سجنے لگیں، جن میں تمام مذاہب کے ماننے والے شریک ہوتے تھے۔

قوالی مزاروں سے نکل کر مختلف میلوں، عرسوں اور اجتماعی تقریبات تک پہنچ گئی۔ خواجہ معین الدین چشتی کے عرس پر بھی قوالی کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ مزاروں پر سماع کی طرح قوالی کا سلسلہ جاری ہوا اور اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ خانقاہوں اور مزاروں سے نکل کر گھروں تک جا پہنچی۔ گیارہویں شریف، فاتحہ، نیاز اور شادی بیاہ کے مواقع پر بھی قوالی کی محفلیں سجائی جانے لگیں۔ ان محفلوں کا بنیادی مقصد بھائی چارہ، اتحاد اور قومی یکجہتی کو فروغ دینا تھا۔ الغرض، امیر خسرو نے قوالی کے ذریعے مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگوں کو جوڑنے کا کام کیا۔ قوالی کا فن قومی یکجہتی کا علمبردار ہے اور اپنی ایجاد سے لے کر آج تک قومی اتحاد کا مرکز بنا ہوا ہے۔ موجدِ قوالی امیر خسرو اور اس کے اولین سرپرست نظام الدین اولیا کے نمایاں کارناموں میں قومی یکجہتی کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلاتفریق مذہب و ملت، قوالی کا اثر ہر فرد پر یکساں طور پر ہوتا ہے، اور آج بھی اس کی محفلوں میں ہر مذہب کے لوگ جوق در جوق شریک ہوتے ہیں۔

امیر خسرو نے اپنے ہم وطنوں کو نہ صرف قومی یکجہتی کی ترغیب دی بلکہ رواداری، بے تعصبی، حب الوطنی، وسیع النظری، اخوت، محبت اور انسان دوستی کا درس بھی دیا۔ عصرِ حاضر میں بھی امیر خسرو کا پیغام ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون کو تحریر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کو قوالی کی اس خصوصیت، یعنی قومی یکجہتی، سے روشناس کرایا جائے اور اہلِ قلم کو اس موضوع پر غور و فکر کی دعوت دی جائے۔

اے شیخ و برہمن! مل بیٹھو، فطرت کو دوئی منظور نہیں
قرآن سے گیتا دور سہی، انسان سے انسان دور نہیں

حوالہ جات

1. Edwards,AHistory ofIndia, 1961, p.129
2۔ محی الدین اظہر، "امیر خسرو اور علی گڑھ" نسرین پبلیکشن، علی گڑھ ,1981, صفحہ نمبر۔4
3۔ کے۔ کے۔ کھلر، امیر خسرو، سمنت پرکاشن، نئی دہلی، 1983 صفحہ نمبر۔23
4. lifeTimes & words of Amir Khusrou Dehalavi, Idara-e-Adbiyat Urdu, Hyderabad, p.4
5۔ امیر خسرو اور موسیقی، نیشنل کمیٹی برائے سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو، پاکستان، 1975 صفحہ نمبر۔2
6۔ سید عابد علی، "موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ" صفحہ نمبر۔5
7۔ سید صباح الدین عبدالرحمن، "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" معارف پریس اعظم گڑھ 1686
8۔ ڈاکٹر وحید میرزہ 'امیر خسرو 2006، ایجوکیشنل پبلیکیشن ہوز، نئی دہلی۔
9۔ سید صباح الدین عبدالرحمن، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، معارف پریس، اعظم گڑھ، 1966۔

Dr. Amena Begum
Assistant Professor History u/m
NTR Govt. Degree and PG College for
Women [A], Mahabub Nagar, Telangana-509001
Mob: 8919414213
Email:amenabegum.s777@gmail.com

کلامِ غالب میں لفظ ''ناخن'' کی انفرادیت

غزالہ فاطمہ

کلام غالب میں لفظ 'ناخن' کا استعمال مختلف مقامات پر ملتا ہے اسے عام طور سے تشبیہ، استعارہ یا علامت کے طور پر لایا گیا ہے۔ مرزا غالب کے یہاں 'ناخن' ایک استعارہ ہے جو مختلف جذبات اور کیفیات کو ظاہر کرتا ہے۔ بے قراری، زخموں کو کریدنے، لاچاری مایوسی اور محبوب کے ظلم و ستم کی ایک علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مثلاً

دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

مذکورہ شعر میں ناخن کو اس کے حقیقی معنی میں برتا گیا ہے۔ یعنی شاعر استفہام انکاری کے طور پر کہتا ہے کہ میں غم میں مبتلا ہو کر اپنے ناخن سے اپنے وجود کو زخمی کیے جا رہا ہوں اور میرے دوست میری غمخواری کرتے ہوئے میرے ناخن کاٹ رہے ہیں یہ کتنی عجیب بات ہے۔ کیا میرے دل کے زخم بھرنے سے پہلے ناخن پھر نہ بڑھ جائیں گے کیا اور جب بڑھ جائیں گے تو میں پھر سے اپنے وجود کو زخمی کروں گا، تو اس غمخواری سے کیا فائدہ۔

اس شعر میں ''ناخن نہایت بلیغ اور گہری معنویت کا حامل ہے۔ ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا'' میں وقت کے گزرنے کا ذکر بھی ہے۔ جب تک دوست کچھ کریں گے، تب تک ناخن بڑھ جائیں گے۔ یہ ایک پہلوئے طنز بھی رکھتا ہے کہ ان کے وعدے صرف زبانی ہیں، عمل میں تبدیل ہونے تک وقت گزر چکا ہوگا۔ یہ شعر محض محبوب یا دوستوں کے وعدوں پر طنز ہی نہیں، بلکہ انسانی فطرت پر ایک گہرا تبصرہ بھی ہے۔ لوگ غم خواری کے دعوے تو بہت کرتے ہیں، مگر جب تک وہ عمل میں آتے ہیں، زخم یا تو بھر چکے ہوتے ہیں یا درد سہنے والا خود اس کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔

غالب نے اپنے کلام میں ناخن کا استعمال اضطراب، بے بسی، غم اور دل کی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے کیا ہے۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اس گرہ نیم باز کا

یہ معرفت الٰہی کا شعر ہے جس میں شاعر نے سالک کی اس کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہ وہ معرفت الٰہی یعنی حقیقت مطلق سے آشنائی کے قریب تر پہنچ گیا ہو۔ سالک کی زبان میں شاعر کہتا ہے کہ میرا دل ایک گانٹھ کی صورت بندھا ہوا تھا جس کو میں نے غم فراق یار کے ناخن سے کرید کر نیم باز یعنی ادھ کھلا کر دیا ہے۔ اب بھی پورا نہیں کھلا ہے چنانچہ ناخن کے ذمہ گرہ کو پوری طرح کھولنے کا قرض باقی ہے۔ لہٰذا دل ناخن سے تقاضہ کرتا ہے کہ اس گرہ کو مکمل طور پر کھول دے اور اپنا قرض ادا کرے تاکہ مجھے کھلے دل سے معرفت الٰہی کا حصول ہو جائے۔

کچھ شارحین غالب نے دل کی شکل کی گرہ سے مشابہت کو سامنے رکھ کر اس شعر سے معنی اخذ کیے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارا دل گانٹھ کی صورت بندھا ہوا تھا ہم نے غم کے ناخنوں سے کرید کرید کر اسے کافی حد تک کھول دیا ہے۔ بس تھوڑی سی کسر باقی ہے گرہ اب نیم باز ہو گئی ہے۔ ناخن کے ذمے تھا دل کو کھولنا گویا ناخن دل کا مقروض تھا۔ سو اب دل تقاضا کرتا ہے کہ ناخن گرہ کو پوری طرح کھولے اور یوں اپنا باقی کا قرض بھی ادا کرے۔

دیگر شارحین نے گرہ نیم باز کو یار کے ادھ کھلے بند قبا سے ملا دیا ہے۔ ناخن پر قرض تھا یار کے بند قبا کھولنا اور حسن یار کو آنکھوں پر پوری طرح آشکار کرنا۔ شاعر کا دل ناخن سے متقاضی ہے کہ بند قبا جو اب نیم کھلا ہے اسے پورا کھول دے۔ غالب یہاں 'ناخن' کو قرض چکانے کے استعارے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ عام طور پر ناخن کو کاٹنا یا چبانا اضطراب، بے چینی، یا فکر کی علامت ہوتا ہے۔ مگر یہاں 'ناخن پر قرض' کہہ کر شاعر نے قرض کی شدت اور تکلیف کو غیر روایتی انداز میں بیان کیا ہے۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

کہتے ہیں جب کسی کے حالات خراب ہوں تو اس کی عقل کام کرنا بند کر دیتی ہے۔

پہلے مصرعے میں غالب کہتے ہیں کہ اگر میں مشکلات اور بے بسی کے عالم میں کچھ کر سکوں، تب ہی میری اصل صلاحیت کا اندازہ ہوگا۔ ''درماندگی کا مطلب ہے لاچاری، یا ایسی صورت حال جس میں انسان کے پاس کوئی راستہ نہ بچے۔ اس میں یہ حقیقت بھی اجاگر ہو رہی ہے کہ کامیابی تب ہی معنی رکھتی ہے جب حالات سازگار نہ ہوں۔

یہ شعر انسانی عزم اور قوت ارادی کی آزمائش پر زور دیتا ہے۔ اصل کامیابی وہی ہوتی ہے جو مشکلات

کے باوجود حاصل کی جائے۔

دوسرا مصرع: جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا رشتہ بے گرہ کا مطلب ہے کہ جب کوئی معاملہ بالکل سیدھا اور واضح تھا، یعنی اس میں کوئی پیچیدگی یا الجھن نہیں تھی۔ ناخن گرہ کشا کا مطلب ہے وہ ناخن جو گرہ کھولنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ چیز یا صلاحیت جو مشکل کو حل کرنے میں مدد دے۔

یعنی جب کوئی پیچیدگی یا گرہ ہی نہیں تھی، جب تو میرے ناخن میں گرہ کھولنے کی صلاحیت تھی، لیکن جب واقعی مشکل آن پڑی تو وہ صلاحیت کارآمد نہ رہی۔

اس شعر میں استعاراتی اور طنزیہ بیان بھی نمایاں ہے کہ بعض لوگ صرف آسان مواقع پر اپنی قابلیت و صلاحیت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جب اصل مشکل پیش آتی ہے، تو ان کی صلاحیت بے اثر ہو جاتی ہے۔

غالب کا انداز بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ 'ناخن' ایک عام لفظ ہوتے ہوئے بھی ایک گہری معنویت اور وسیع استعاراتی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ کلام غالب ہی نہیں بلکہ اردو شاعری میں لفظ 'ناخن' ایک علامتی استعاراتی اور صنائع بدائع کا مظہر ہے۔

واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسد
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

مذکورہ شعر میں غالب نے ناخن کو مضراب کی تشبیہ بلیغ بنا کر پیش کیا ہے۔ یعنی وہ مضراب جس سے ساز کے تار کو چھیڑ کر نغمے کے سر پیدا کیے جاتے ہیں وہ ہمارے غم کا ناخن ہے جو سانسوں کے تار کو چھیڑ کر غم ناک نغمے چھیڑ رہا ہے۔ جب کہ میرے محبوب کو اس کی کوئی پرواہ نہیں اس کی محفلوں میں تو عیش و عشرت کے نغمے چھیڑے جا رہے ہیں۔

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

مذکورہ شعر میں کاوش ناخن سے مراد غم کی کشمکش ہے اور ناخن کو غم کا استعارہ بنا کر برتا گیا ہے اور خوں نابہ کا معنی خون خالص اور اس سے مراد غزل کے دوسرے اشعار کا وجود میں آنا۔ خون ناب یا خون خالص یہاں کنایہ ہے اشعار دردناک سے۔ اب شعر کا مطلب ہوا کہ دل میں جب غم نے ہلچل مچائی تو اشعار کی آمد شروع ہوئی جیسے، ناگہاں ٹپکنے لگے یہاں تک ہوتے ہوتے غزل مکمل ہو گئی۔

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر، یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

مذکورہ شعر میں ناخن کا محتاج حنا ہونا سے مراد سوگ میں مبتلا ہونا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ میرا دل خاک میں یعنی قبر میں خون ہو رہا ہے یعنی یہ دیکھ کر پریشان ہو رہا ہے کہ میرے مر جانے کے بعد حسیناؤں نے مہندی لگانا چھوڑ دیا ہے اور میرے مرنے کا غم منا رہی ہیں اور میرے سوگ میں مبتلا ہیں۔

اردو شاعری میں ناخن کا استعمال پامسٹری کی تعبیرات سے کافی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں ناخن کو غم، صبر، محبت، اضطراب اور محنت کے علامتی اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو پامسٹری میں ناخنوں سے جڑے مختلف مزاج اور جسمانی پہلوؤں سے ہم آہنگ ہے۔ پامسٹری میں لمبے اور چمکدار ناخن محبت اور حساسیت کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ غالب نے بھی ناخن کے حوالے سے شعر کہے ہیں۔

اردو شاعری میں ناخن کا استعمال پامسٹری کی تعبیرات سے کافی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں ناخن کو غم، صبر، محبت، اضطراب اور محنت کے علامتی اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو پامسٹری میں ناخنوں سے جڑے مختلف مزاج اور جسمانی پہلوؤں سے ہم آہنگ ہے۔ پامسٹری میں لمبے اور چمکدار ناخن محبت اور حساسیت کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ غالب نے بھی ناخن کے حوالے سے شعر کہے ہیں۔

کلام غالب کی طرح یہ ایک مستقل شعبہ ہے، جو زبان کے آغاز و ارتقا کا سائنسی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ شاید مضمون نگار کا مقصد 'بول چال' ہے۔ ناخن محاوروں، استعاروں اور علامتوں میں استعمال ہوتا ہے جو عمومی طور پر سخت محنت، چالاکی، تکلیف یا پریشانی کی علامت بنتے ہیں۔ جیسے اردو میں 'ناخن چبانا'، 'ناخن سے گوشت جدا ہونا' وغیرہ۔ مثال کے طور پر،

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اس شعر میں ناخن کا گوشت سے جدا ہو جانے کو مشبہ بہ بنایا گیا ہے اور مشبہ کے طور پر مصرع اولی کو استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی محبوب کی حنائی انگلیوں کا خیال دل سے مٹ جانا ویسا ہی ہے جیسے ناخن گوشت سے الگ ہو جائے اور ایسی صورت میں ناخن یا تو مرجاتا ہے یا درد بہت ہوتا ہے۔ اسی طرح جب دل سے تیری حنائی انگلیوں کا خیال مٹنے لگے گا تو دل، دل ہی نہیں رہے گا یا بے پناہ درد ہوگا۔

اس میں ''ناخن کا لسانیاتی پہلو کئی جہات رکھتا ہے۔ غالب نے 'ناخن' کو ایک عام جسمانی عضو سے بڑھا کر ایک استعاراتی اور جذباتی علامت میں تبدیل کر دیا ہے، جو ان کے شعری اسلوب کی گہرائی کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ لفظ لسانی، صوتی، اور معنوی سطح پر شعر میں ایک گہرا اثر چھوڑتا ہے، اور یہی کلام غالب کی خصوصیت ہے کہ وہ عام الفاظ کو غیر معمولی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

مذکورہ اشعار کے علاوہ بھی کلام غالب میں بہت سے اشعار مل جاتے ہیں جن میں لفظ ناخن کو مختلف معنوں میں برتا گیا ہے۔

بسکہ حیرت سے ز پا افتادۂ زنہار ہے
ناخنِ انگشت تبخالِ لبِ بیمار ہے

یعنی حیرت اتنی شدید ہے کہ وہ گویا زمین پر گرنے کے قریب ہے، یعنی حیرت نے اسے بالکل بے بس اور لاچار کر دیا ہے۔ ز پا افتادۂ زنہار کا مطلب ہے کہ حیرت کی شدت سے قدموں میں لرزش آ گئی ہے اور سنبھلنا مشکل ہو گیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر نے تشبیہ دی ہے کہ انگلی کا ناخن ایسے نازک اور کمزور ہو چکا ہے جیسے کسی بیمار کے لب پر پڑا ہوا تبخال (چھالا) تبخال عام طور پر بیماری کی حالت میں ہونٹوں پر آ جاتا ہے اور بہت حساس اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہاں ناخن انگشت سے تشبیہ دے کر شاعر نے بے بسی، ناتوانی اور کمزوری کو انتہائی بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔

غالب نے غزل کے علاوہ اپنے قصیدے منقبت حیدری میں لفظ 'ناخن' کا استعمال بطور تشبیہ کیا ہے۔

کاٹ کر پھینکیے ناخن جو بانداز ہلال
قوت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

دوسرے قصیدے 'مدح شاہ' صبح دم دروازہ خاور کھلا، میں کہتے ہیں۔

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے
عقدہ احکام پیغمبر کھلا

■

Ghazala Fatma
Asst. Professor
Dept.of Education in Language, NCERT
New Delhi- 110016
Mob.:7530972798
Email: ghazalaamuu@gmail.com

سیدہ نازیہ فاطمہ

ادب میں سائنسی تصورات کی پیش کش

ادب اور سائنس بظاہر دو متضاد دنیائیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن گہرائی میں جائیں تو یہ دونوں انسانی شعور کی ہی دو تکمیلیں ہیں۔ادب جذبات واحساسات کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ سائنس عقل، تجربے اور مشاہدے سے۔ دونوں کا مقصد دراصل حقیقت کی کھوج ہے،ادب انسانی وجود کی اندرونی سچائی تلاش کرتا ہے اور سائنس خارجی کائنات کی۔ انیسویں صدی کے اواخر سے جب سائنسی انقلاب نے انسانی سوچ کو بدلنا شروع کیا،تو ادب نے بھی اپنی تعبیرات میں سائنسی فکر کی جھلک دکھانی شروع کر دی۔ ڈارون، نیوٹن، گلیلیو، آئن اسٹائن، میکس پلانک جیسے سائنس دانوں کی دریافتیں صرف تجربہ گاہوں تک محدود نہ رہیں؛ ان کے اثرات انسانی ذہن اور تخلیقی رویوں تک پہنچے۔انسانی علوم وفنون کے درمیان فاصلے کم ہونا شروع ہوئے اور ادب نے سائنس کو موضوع، علامت، مزاج اور اسلوب کے طور پر اپنانا شروع کر دیا۔ اسی نکتے سے ایک نئے ادبی رجحان کی ابتدا ہوئی جس نے آگے چل کر اردو ادب سمیت دنیا کی تمام ادبیات کو متاثر کیا۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''ادب کی اساس ''تخیل'' ہے جس میں احساس و جذبہ اثر و تاثیر کے رنگ بکھرتے ہیں۔سائنس کی بنیاد ''تجربہ'' ہے۔تخیل سے ''خیال'' وجود میں آتا ہے جس پر سائنس اپنے تجربے کی بنیاد رکھتی ہے اور دریافت کی منزل سر کرتی ہے۔اگر خیال نہ ہو تو ''تجربہ'' بھی عمل کی روشنی نہ دیکھے۔ پرندوں کی طرح اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔ اس خواہش نے تخیل کے پروں پر اڑ کر تخت سلیمانی، اڑن کھٹولا اور مثنوی سحر البیان کا ''کل کا گھوڑا'' تلاش کیا۔ دیو پریاں بھی اسی خواہش اور اسی خیال کا ایک روپ ہیں۔سائنس نے قدم قدم پر تجربے کے عمل سے گزر کر کل کے گھوڑے کے تصور سے ہوائی جہاز ایجاد کیا۔ یاد آیا امریکہ کے ایک سائنس دان ہیں جو ادب بالخصوص فکشن، بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ان سے کسی نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ ادب پڑھنے سے بہت سے ایسے نئے خیالات ہاتھ آتے ہیں جن پر سائنسی تجربات کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔یہی وہ نکتہ ہے جسے اگر سمجھ لیا جائے تو ادب اور سائنس کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے۔''

(بحوالہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ: ادب اور سائنس، مرتب جمال نقوی، سنہ 1998، ص:9)

سائنس نے انسان کو کائنات میں اپنی حیثیت سے آگاہ کیا۔ جہاں پہلے عقائد اور مابعد الطبیعی تصورات غالب تھے، وہاں اب تجربہ اور دلیل کو ترجیح دی جانے لگی۔ اس تبدیلی نے انسان کے اندازِ فکر کو بدل ڈالا۔ جب انسان نے زمین کو کائنات کے مرکز کی حیثیت سے ہٹ کر ایک معمولی سی گردش کرتے ہوئے سیارے کے طور پر دیکھا، تو اس کی خودی کا مفہوم بھی بدلنے لگا۔ ادب چونکہ انسانی شعور کی آئینہ داری کرتا ہے، اس لیے اس تبدیلی نے اس پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ شعر و نثر دونوں میں محسوسات کے ساتھ ساتھ منطقی سوچ اور مشاہداتی وضاحت کی جھلک ابھرنے لگی۔ادب میں اب صرف تقدیر اور احساس نہیں بلکہ تلاش، سوال، تجسس اور دریافت کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سائنسی طرزِ فکر اور ادبی تخلیقیت کا سنگم وجود میں آیا۔قاسم پیرزادہ اپنے مضمون ''ادب اور سائنس کی مشترک قدریں'' میں لکھتے ہیں:

''نہ سائنس ادب ہے اور نہ ادب سائنس مگر ان میں جو قدر مشترک ہے وہ انسان ہے کیونکہ اس کائنات میں جتنے بھی مظاہر ہیں ان کا تعلق سائنس اور انسان سے ہے اور یہی تعلق ادب کا بھی ہے جبکہ ایک روایت ادب کی ہے اور ایک سائنس کی۔ ان کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں، سائنس جذبات سے عاری ہے جبکہ ادب سارے کا سارا جذبات سے تعلق رکھتا ہے۔ادب میں الفاظ کی رنگینی ہے جبکہ سائنس میں مناسب الفاظ کا استعمال ہے۔ ہاں سائنس اور ادب میں کوئی تصادم نہیں ہے بلکہ سائنسی شعور رکھنے والا بہت گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ اگر ادب کی طرف توجہ کرے تو اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ ادب چونکہ زندگی سے زیادہ قریب ہے اس لیے اس نے سائنس کو سینے سے لگایا ہے۔موضوعات کے اعتبار سے اس کا استعمال سائنس میں کیا جاسکتا ہے۔''

(بحوالہ: قاسم پیرزادہ، مشمولہ: ادب اور سائنس، مرتب جمال نقوی، سنہ 1998، ص:16)

اردو ادب کی تاریخ میں سائنسی تصور سب سے نمایاں طور پر سرسید احمد خاں کی تحریکِ علی گڑھ سے وابستہ ہے۔ انھوں نے مذہب، عقل اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ سرسید نے یہ باور کرایا کہ جدید دنیا کو سمجھنے کے لیے سائنس کی معرفت لازمی ہے۔ ان کے مضامین اور بیانات میں سائنسی مشاہدے اور عقلی استدلال کا رنگ نمایاں ہے۔ اسی تحریک کے زیرِ اثر اردو ادب میں ایک نئی فکری سمت پیدا ہوئی جہاں شاعری اور نثر دونوں میں انسان، فطرت اور علم کے باہمی رشتے پر بحث ہونے لگی۔ حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور بعد میں اقبال، جوش ملیح آبادی جیسے مفکرین نے سائنسی حس کو اپنی تخلیقات میں جذب کیا۔ اقبال کی شاعری میں محض فلسفہ نہیں بلکہ طبیعیات، فلکیات اور حیاتیاتی اشارے بھی ملتے ہیں۔ ان کے ہاں کائنات جامد نہیں بلکہ حرکت پذیر اور توانائی سے لبریز دکھائی دیتی ہے۔

جب بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ترقی پسند تحریک ابھری، تو ادب میں سائنس اور عقل پسندی کا رجحان مزید گہرا ہوگیا۔ ترقی پسند ادب نے سماج، سیاست اور معیشت کو سائنسی نتائج کی بنیاد پر سمجھنے اور بدلنے کی کوشش کی۔ فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اور احمد ندیم قاسمی جیسے ادیب اس فکر کے نمائندہ ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ ادب کو جذباتی یا خوابناک دائرے سے نکال کر حقیقت پسندانہ اور سائنسی بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے۔ ان کہانیوں اور شاعری میں انسان کو حالات کا محکوم نہیں بلکہ بدلنے والا عامل تصور کیا گیا۔ یہ تصور دراصل سائنسی منطق، یعنی علّت و معلول کے رشتے کو انسانی زندگی پر منطبق کرنے کی ایک ادبی صورت تھی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو نہ صرف سماجی ادارے کے طور پر مضبوط کیا بلکہ اس میں استدلال، تجزیہ اور مشاہدے کی زبان کو بھی شامل کیا۔

جدیدیت کے دور میں سائنس محض مظاہرِ قدرت کے بیان تک محدود نہ رہی بلکہ انسانی وجود اور شعور کے اندر تک پہنچ گئی۔ مابعد جدیدیت نے اس فکری رشتے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ اب سائنس کے ذریعے پیدا ہونے والی غیر یقینی، لامرکزیت اور تجریدی حقائق نے ادب کو نئے ابعاد عطا کیے۔ غالب، اقبال، ن م راشد، فیض، انتظار حسین، شمس الرحمٰن فاروقی اور وزیر آغا جیسے شعرا و نقادوں نے اس فکری تغیر کو ادب میں دریافت کی نئی جہت دی۔ سائنسی تصورات مثلاً ''وقت کا نسبتی ہونا''، ''عالمِ ذرات کی غیر یقینی حرکت''، اور ''انسانی شعور کی نفسیاتی پرتیں'' ادب کے علامتی اور فکری پیکروں میں شامل ہوگئیں۔ اس طرح علمِ سائنس نے ادب کی زبان اور اس کے تاثر کو محض خارجی مظاہر سے نکال کر باطنی تجربات اور فکری گہرائیوں تک پھیلایا۔

آج جب پوری دنیا گلوبلائزیشن اور ڈیجیٹل علم کے دور میں داخل ہے، اردو زبان بھی اپنے تاریخی دائرے سے باہر نکل کر ایک عالمی زبان بن رہی ہے۔ جنوبی ایشیا کے علاوہ خلیجی ممالک، یورپ، امریکہ، کینیڈا، اور وسطی ایشیائی ریاستوں میں اردو پڑھائی اور سمجھی جا رہی ہے۔ آن لائن یونیورسٹیاں، یوٹیوب چینلز، اور جدید تحقیقاتی جرائد اردو زبان میں سائنسی مباحث کو عام کر رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، برطانیہ اور خلیج کے اردو ادبا اب سائنسی اصطلاحات، مصنوعی ذہانت، ماحولیات اور بایو ایتھکس جیسے موضوعات پر تخلیق کر رہے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ادب میں جمود نہیں، بلکہ علم و سائنس کی حرکت کے ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اردو میں سائنس کی زبان ابھی ارتقائی مرحلے میں ہے، مگر کوششیں جاری ہیں کہ علمی مضامین، ناول، شاعری اور تنقید میں سائنسی زاویوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے۔

ادب ہمیشہ استعارات، علامتوں اور تمثیلات کے ذریعے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب سائنس نے انسانی فہم کو بدل دیا، تو ان علامتوں کی ساخت بھی بدل گئی۔ پرانے وقتوں میں شاعر آفتاب، مہتاب، طوفان اور بجلی کو محض فطری مظاہر کے طور پر استعمال کرتے تھے، مگر جدید شاعر کے لیے یہ مظاہر توانائی، حرکت اور ارتقا کی علامت بن گئے۔ مثلاً روشنی اب صرف حسن کی دلیل نہیں بلکہ بصیرت اور دریافت کی علامت بھی ہے۔ اسی طرح ''ایٹم'' یا ''ذرہ'' جدید شاعری میں محض مادی اکائی نہیں بلکہ کائناتی وحدت کی تمثیل بن جاتا ہے۔ اقبال کے یہاں ذرہ اور کائنات کا تعلق ایک سائنسی اور روحانی فلسفے کے امتزاج کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، جہاں کائنات مسلسل ''حرکت'' میں ہے۔ ن م راشد کی نظموں میں روشنی، توانائی اور زمان و مکاں کے تصورات سائنسی اور علامتی دونوں سطحوں پر کام کرتے ہیں۔ یوں علمِ سائنس نے ادبی اظہار کی علامتی ساخت کو نہ صرف وسعت دی بلکہ اسے فکری گہرائی بھی عطا کی۔

ادب اور سائنس کا تعلق محض عقل و احساس کے درمیان فاصلہ مٹانے کا نہیں بلکہ ایک توازن پیدا کرنے کا ہے۔ سائنس انسان کو کائنات کے قوانین سمجھنے میں مدد دیتی ہے، جبکہ ادب ان قوانین کے درمیان انسانی تجربے کی معنویت تلاش کرتا ہے۔ سائنس میں حقائق جامد نہیں بلکہ تجرباتی ہوتے ہیں، اور ادب انھیں انسانی احساس کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کا اشتراک انسانی تمدن کی روح ہے۔ اردو ادب میں یہ توازن سرسید، اقبال، حالی، اور فیض جیسے ادیبوں کے ہاں جاندار شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ سائنس کو محض آلات اور تجربے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے اخلاقی اور جمالیاتی قدر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ آج بھی ادب کو سائنس کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہے، مگر اپنی جمالیاتی خودمختاری برقرار رکھتے ہوئے؛ یہی وہ نقطہ ہے جہاں ادب اپنا کردار ادا کرتا ہے اور سائنس اپنا۔

سائنس نے فلسفے اور ادب کو یہ سکھایا کہ انسانی شعور جامد نہیں بلکہ ارتقائی ہے۔ آج علمِ حیاتیات سے لے کر نفسیات تک، ہر شاخ یہ اشارہ دیتی ہے کہ انسان اپنے رویوں، احساسات اور فکر میں مسلسل تغیر کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ادب اسی تغیر کی تخلیقی زبان ہے۔ مثلاً جہاں سائنس انسان کے دماغ کو ایک حیاتیاتی نظام کے طور پر دیکھتی ہے، ادب اس شعور سے پیدا ہونے والے تصورات کو معنی دیتا ہے۔ اردو ادب نے اس تجربے کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا ہے۔ فیض، اقبال، اور راشد جیسے شعرا نے انسانی شعور کو مادی دنیا کے ساتھ باندھ کر ایک ایسا فہم پیدا کیا جو نہ صرف فکری بلکہ روحانی توازن رکھتا ہے۔ یہ فہم آج کے دور میں احیائے انسانیت کے لیے ناگزیر ہے، کیونکہ جدید سائنس نے اگرچہ ترقی دی ہے مگر انسان کے اندر پھیلتی خالی جگہ کو ادب ہی بھر سکتا ہے۔

سائنس کی تیزی سے بڑھتی ترقی نے اخلاقی سوالات کو جنم دیا ہے۔ ایٹم بم کی تخلیق، مصنوعی ذہانت کی خودمختاری، جینیاتی ترمیم، اور ڈیجیٹل نگرانی جیسے مسائل نے انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ علم اگر ضمیر کے بغیر ہو تو تباہی بھی لا سکتا ہے۔ اس پس منظر

میں ادب کا کردار ایک اخلاقی رہنما کا ہے۔ اردو ادب نے ہمیشہ سماجی انصاف، انسان دوستی، مساوات اور انسانی قدروں کی پاسداری کا درس دیا ہے۔ اب یہی قدریں سائنسی ترقی کے لیے بھی ضروری ہیں۔ ادب سائنس سے یہ سوال پوچھنے کی جرأت رکھتا ہے کہ ''کیا علم انسان کے حق میں ہے؟''، اور یہی سوال علم کی سمت متعین کرتا ہے۔ جب سائنس اخلاق کے تابع ہوگی اور ادب عقل کے ساتھ شریکِ گفتگو، تب ایک متوازن انسانی تہذیب ممکن ہوگی۔ اردو ادب اس فکری ہم آہنگی کا بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ اس کی بنیاد ہی انسانی مساوات اور روحانیت پر ہے۔

اردو زبان کی وسعت اور تاریخ اسے ایک زندہ علمی زبان بناتی ہے۔ یہ زبان فارسی اور عربی فلسفے، ہندی تہذیب اور مغربی سائنسی شعور کے تجربات کو یکجا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آج جب دنیا ایک کثیر لسانی اور بین الثقافتی علم کے دور میں داخل ہو چکی ہے، اردو کا کردار اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، خلیج، برطانیہ اور امریکہ میں اردو بولنے والوں کے علمی و ادبی ادارے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اردو محض ماضی کی زبان نہیں، بلکہ مستقبل کی بھی زبان ہے۔ سائنسی محفلوں، کانفرنسوں اور تعلیمی نصاب میں اردو کی موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ یہ زبان علم کو جذب کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ ترجمہ، تدریس اور ڈیجیٹل ٹولز کے ذریعے اردو میں سائنسی اصطلاحات کا فروغ تیزی سے جاری ہے۔ اس عمل نے ادب اور سائنس دونوں کو ایک دوسرے کا ہم نوا بنا دیا ہے۔

آنے والے زمانے میں ادب اور سائنس کا اتحاد محض خیال نہیں بلکہ ضرورت بن جائے گا۔ دنیا ایک ایسے دور میں داخل ہو رہی ہے جہاں مصنوعی ذہانت، خودکار نظام، اور بایو سائنس انسانی وجود کے سوالات بدل رہے ہیں۔ اردو ادب اس تغیر کے ساتھ چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے، بشرطیکہ ہم اپنے تخلیقی شعور کو سائنسی بصیرت کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔ مستقبل کے ادیب کو لیبارٹری کے سائنس دان کی طرح دنیا کے رازوں کی کھوج میں مصروف ہونا ہوگا، اور سائنس دان کو شاعر کی طرح اپنے علم کی اخلاقی و انسانی معنویت پر غور کرنا ہوگا۔ اس میل جول سے ہی ایک ایسا فکری نظام وجود میں آئے گا جس میں دلیل، تخیل، اخلاق اور تخلیق سب ایک ساتھ سانس لیتے ہوں گے۔ اردو زبان چونکہ جذب و اظہار دونوں کی استعداد رکھتی ہے، اس لیے یہ نئے انسانی تہذیبی دور کی نمائندہ زبان بن سکتی ہے۔

اردو زبان آج دنیا کے مختلف حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ، یورپ، امریکہ، افریقہ، اور وسطی ایشیا میں اردو زبان کے ادارے، ریڈیو اسٹیشن، اور تحقیقی مراکز قائم ہیں۔ ان اداروں میں سائنسی مباحث کے ساتھ اردو ادب کو پڑھایا جا رہا ہے۔ برطانیہ اور کینیڈا کی جامعات میں ''اردو لسانیات اور سائنسی ترجمہ'' کے کورسز متعارف کرائے گئے ہیں۔ یہ رجحان ثابت کرتا ہے کہ اردو اب محض تہذیبی روایت نہیں بلکہ عالمی علمی گفتگو کا حصہ ہے۔ سوشل میڈیا اور اردو ویب سائٹس نے علم و ادب کے درمیان حائل فاصلوں کو کم کر دیا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اردو بولنے والی کمیونٹیاں سائنسی مکالمہ اردو میں کر رہی ہیں گویا اردو زبان علمِ سائنس کے لیے ایک قابلِ عمل اظہار بن چکی ہے۔ یہ ادبی و سائنسی میل جول ثقافتی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک کثیر لسانی دنیا کی تشکیل میں معاون ہے۔

اردو زبان کی وسعت اور تاریخ اسے ایک زندہ علمی زبان بناتی ہے۔یہ زبان فارسی اور عربی فلسفے، ہندی تہذیب اور مغربی سائنسی شعور کے تجربات کو یکجا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آج جب دنیا ایک کثیر لسانی اور بین الثقافتی علم کے دور میں داخل ہو چکی ہے، اردو کا کردار اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔

مستقبل میں اردو ادب کے لیے سائنس صرف ایک موضوع نہیں رہے گی، بلکہ اظہار اور تخلیق کا ایک نیا زاویہ بنے گی۔ مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل انسان، بایو اخلاقیات، اور ماحولیات کی بحرانی صورتیں اردو کے ادیب کے لیے نئے علامتی ذرائع فراہم کر سکتی ہیں۔ ادب کا مقصد ہمیشہ انسان کو خود اس کے آئینے میں دیکھنا رہا ہے، اور اب سائنس نے یہ آئینہ ٹیکنالوجی کی صورت میں مزید واضح کر دیا ہے۔ اردو شاعر اور افسانہ نگار اب ''علمی تخیل'' کے ذریعے سائنس کو انسانی قدروں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مستقبل کا اردو ادب شاید لیبارٹری اور تخلیق کے سنگم پر کھڑا ہوگا، جہاں ''شاعر'' اور ''سائنس دان'' دونوں ایک ہی سوال کے دو زاویے ہوں گے: انسان آخر ہے کیا؟ اردو کی لچک دار ساخت اور فلسفیانہ روایت اسے اس گفتگو کے لیے نہایت موزوں بناتی ہے۔

آخر میں یہ کہنا بجا ہے کہ ادب اور سائنس ایک ہی انسانی ذہن کی دو متوازن جہتیں ہیں ۔ ایک مشاہدے کی قوت دیتی ہے، دوسری معنی کی۔ اگر سائنس انسانی بدن کو سمجھنے کا علم ہے تو ادب اس بدن میں روح کے معنی تلاش کرتا ہے۔ اردو ادب نے ہمیشہ علم و دانش، احساس و وجدان، اور عقل و تخیل کے درمیان پل کا کردار ادا کیا ہے۔ آج جب دنیا تیز رفتاری، مشینی ترقی اور مادی ترجیحات میں الجھ چکی ہے، اردو ادب اپنی فکری وسعت اور جذباتی صداقت کے ذریعے انسان کو پھر یاد دلا سکتا ہے کہ علم کا اصل مقصد انسان کی فلاح ہے، تباہی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ادب اور سائنس ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں۔ چنانچہ اردو ادب میں سائنسی تصورات کی پیشکش محض ایک ادبی رجحان نہیں بلکہ ایک فکری جہت ہے جو آنے والے زمانوں میں انسانی شعور کی نئی منزلوں کی سمت رہنمائی کرے گی۔

ماخذ و مصادر

☆ ادب اور سائنس، مرتب جمال نقوی، سنہ 1998

☆ اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب، محمد شکیل خاں، سنہ 1988

☆ اردو میں سائنس ادب قدیم ترین کارنامے، خواجہ حمید الدین شاہد، سنہ 1957

☆ اردو میں بچوں کا سائنسی ادب ایک مطالعہ، محمد رضا، مشمولہ: اردو ریسرچ جرنل، شمارہ مارچ 2017

☆ اردو میں سائنسی ادب اور عصری تقاضے: محمد افروز عالم، مشمولہ اردو دنیا، ستمبر 2022

☆ سائنس اور ادب کے باہمی روابط و اشتراکات، ڈاکٹر قاضی عابد، عمران اختر، مشمولہ: ششماہی خیابان، سنہ 2010

Dr. Syed Naziya Fatema
Dr. Babasaheb Ambedkar Marathwada University
Bhasha Bhawan, Department of Urdu
Aurangabad, Maharashtra-431001
Mob.: 7385664697
Email: naziyafatema789@gmail.com

فرحین شکیل

مثنویاتِ شوق کی تحقیق و تدوین اور رشید حسن خاں

رشید حسن خاں اردو ادب کے مایہ ناز محقق اور بے پایاں مدون ہیں۔ گیان چند جین نے انھیں خدائے تدوین کہا ہے۔ رشید حسن خاں کی ولادت شاہ جہاں پور (یو پی) میں 1925 کو ہوئی (تعلیمی اور ملازمتی رکارڈ میں تاریخِ ولادت 30 جنوری 1930 درج ہے جسے خود انھوں نے غلط قرار دیا ہے۔)

''تعلیمی کاغذات میں تاریخِ ولادت 30 جنوری 1930 لکھی ہوئی ہے یہ تاریخ کس نے لکھائی تھی، مجھے نہیں معلوم۔ صحیح سالِ ولادت 1925 ہے، دسمبر کا مہینا، تاریخ کا علم نہیں۔''[1]

تحقیق و تدوین کے میدان میں رشید حسن خاں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ باغ و بہار، فسانہ عجائب، سحر البیان، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق، مصطلحات ٹھگی وغیرہ کی تدوین و ترتیب ان کے ایسے مایہ ناز کارنامے ہیں جو انھیں تحقیق و تدوین کی دنیا میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رکھیں گے اور ہر عہد کے محقق و مدون کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی اپنے مضمون ''رشید حسن خان: ایک معتبر نام'' میں رقم طراز ہیں۔

''قحط الرجال کے اس دور میں جناب رشید حسن خاں کی ذاتِ گرامی مغتنماتِ روزگار میں ہے۔ وہ مولانا امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود کی صالح روایت کے امین ہیں۔ دراصل تحقیق ان کے یہاں پیشہ ورانہ مجبوری نہیں، بلکہ روحانی تسکین اور مسرت و بصیرت کا سامان ہے۔ اس لیے پیشہ ور اور بالجبر محققوں سے ان کا اندازِ تحقیق بھی مختلف ہے۔''[2]

اسی طرح ابنِ کنول رشید حسن خاں کے جوہرِ تحقیق کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''موجودہ عہد میں بعض محققین ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں ان میں رشید حسن خاں کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے انتہائی محنت اور لگن سے نہ صرف قدیم متون کو ترتیب دیا ہے بلکہ اردو املا، قواعد زبان اور لغت کے بارے میں بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔''[3]

مثنویاتِ شوق کو رشید حسن خاں نے کو تحقیق و تدوین کے اصول و ضوابط کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق سیریز 4 اور سلسلہ مطبوعاتِ انجمن ترقی اردو ہند (اردو گھر) 1474 کے زیرِ اہتمام انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سے سن 1998 میں شائع کی گئی۔ اس وقت اس کتاب کی قیمت 130 روپے تھی اور اس کی طباعت کا اہتمام اختر الزماں کے زیرِ نگرانی ثمر آفسٹ پرنٹرز نئی دہلی سے کیا گیا۔ رشید حسن خاں نے مثنویاتِ شوق کی فہرست کو 7 خاص اور مختلف ذیلی عنوانات کے تحت تیار کیا ہے۔ جس سے محض فہرست کو دیکھ کر ہی پوری کتاب کا خاکہ بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر خلیق انجم کا لکھا پیش لفظ شاملِ کتاب ہے پھر پہلا عنوان ''مقدمہ مرتب'' کے عنوان سے درج ہے جس میں 13 ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جس کے گیارہویں عنوان میں مزید دو ذیلی عنوان شامل ہیں۔ کتاب کا دوسرا عنوان ''متنِ مثنویات'' ہے جس میں مرزا شوق کی تینوں مثنویوں کا متن پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد چار عنوان چار ضمیموں کی صورت میں شامل کتاب کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد کتاب کا ساتواں اور آخری عنوان ''فرہنگ'' کے نام سے شامل ہے۔

414 صفحات پر مشتمل مثنویاتِ شوق میں رشید حسن خاں نے پہلے عنوان ''مقدمہ مرتب'' کے تحت جو 13 ذیلی عنوان قائم کیے ہیں ان میں پہلا ذیلی عنوان ''تمہید'' کے نام سے شامل کیا ہے جسے ہم مثنویاتِ شوق اور معاشرتِ لکھنؤ کی تمہیدی گفتگو کا باب کہہ سکتے ہیں۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ کے قدیم معاشرے، نوابوں کی عیش پرستی، مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس دور کے لکھنؤ کی بدعنوانیوں کا ذکر مختلف دلائل کی روشنی میں کیا ہے۔ اس تمہیدی گفتگو میں لکھنؤ کی تاریخ کا مختصر خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے جس کے آیئنے میں مثنویاتِ شوق کا مطالعہ کیا جائے تو قاری کے لیے اس کے مقصدِ تحریر اور اندازِ تحریر سے واقفیت حاصل کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ مرتب نے عبدالحلیم شرر کی کتاب ''گزشتہ لکھنؤ'' کے مختلف اقتباسات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھنؤ کی زبوں حالی اور نوابینِ لکھنؤ بالخصوص شجاع الدولہ، آصف الدولہ، نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ وغیرہ کی عیش پرستی اور بے راہ روی پر روشنی ڈالی ہے۔

مرزا شوق کی مثنویاں لکھنؤ کے اسی معاشرے کا آئینہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا شوق کی مثنویوں پر لگائے جانے والے فحاشی کے الزامات کی نفی کرتے ہوئے ان کو ادب کا حصہ اور اپنے معاشرے کا ترجمان مانتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

"معاشرہ جیسا ہوگا ترجمانی بھی ویسی ہی ہوگی اورتصویربھی ویسی ہی بنے گی۔" 4

اس ضمن میں مرتب مولانا جامی کی "یوسف زلیخا"، خواجہ میر اثر کی "خواب وخیال" اور مومن کی مثنویوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کو مرزا شوق کی مثنویوں سے زیادہ مبتذل اور فحش بتاتے ہیں۔ان کے نزدیک مرزا شوق کی مثنویاں عشق ومحبت اور وصل وفراق کی داستان سے زیادہ لکھنؤ کی زبان، تہذیب وتمدن، امرا وسلاطین اور طرزِ معاشرت کی عکاس ہیں۔

مقدمے کا دوسرا ذیلی عنوان "حالاتِ زندگی" ہے جس میں مرزا شوق کے اصل نام، تخلص، تاریخ ولادت، تاریخ وفات اور ان کی زندگی کے مختصر حالات مع حوالوں کے قلم بند کیے گئے ہیں۔ ولادت اور وفات کے تحقیقی شواہد مرتب کو بہ مشکل حاصل ہو سکے اور ان کی حقیقت پر انھیں خود بھی شبہ ہے، لیکن جو کچھ حاصل ہو سکا اسے جانچ پرکھ کے بعد انھوں نے بیان کیا ہے اور اس سے متعلق جو ان کے شبہات ہیں ان کا مفصل ذکر صفحے کے آخر میں لکیر کھینچ کر حوالے کو طور پر کر دیا ہے جس سے قاری حاصل شدہ شواہد اور مرتب کی ان پر رائے سے بخوبی واقف ہو سکے۔مرتب نے مختلف مقامات پر شوق کے پہلے سوانح نگار عطاء اللہ پالوی کی کتاب "تذکرہ شوق" اور ڈاکٹر سید محمد حیدر کے تحقیقی مقالے "حیاتِ شوق" سے حوالے اخذ کیے ہیں۔لیکن جہاں جہاں وہ پالوی صاحب اور حیدر صاحب سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں اس کا ذکر نیچے حوالے میں ساتھ ہی ساتھ کر دیتے ہیں۔مرتب کے تحقیقی مزاج کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھیں جن روایات پر شبہ ہے ان کا ذکر تو حوالے میں کیا ہی ہے لیکن جن کی صداقت پر انھیں ذرا سا بھی اعتبار نہیں ان کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے مثلاً مرزا شوق کے مدفن سے متعلق مختلف روایات "تذکرہ شوق" اور "حیاتِ شوق" میں درج ہیں لیکن تحقیق کی نظر سے وہ قابلِ اعتبار نہیں سو انھوں نے ان کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور محض اس پر اکتفا کیا ہے کہ شوق کا مدفن لکھنؤ میں ہی کہیں واقع ہے لیکن اصل جگہ نامعلوم ہے۔

تیسرا ذیلی عنوان "مثنویاتِ شوق کی تعداد" کے نام سے شامل ہے۔جس میں مرتب نے مثنویاتِ شوق کی تعداد پر مفصل بحث کی ہے اور اس عمومی خیال کی تردید کی ہے کہ مرزا شوق کی چار مثنویاں ہیں جن میں

مرتب کے تحقیقی مزاج کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھیں جن روایات پر شبہ ہے ان کا ذکر تو حوالے میں کیا ہی ہے لیکن جن کی صداقت پر انھیں ذرا سا بھی اعتبار نہیں ان کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے مثلاً مرزا شوق کے مدفن سے متعلق مختلف روایات "تذکرہ شوق" اور "حیاتِ شوق" میں درج ہیں لیکن تحقیق کی نظر سے وہ قابلِ اعتبار نہیں سو انھوں نے ان کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور محض اس پر اکتفا کیا ہے کہ شوق کا مدفن لکھنؤ میں ہی کہیں واقع ہے لیکن اصل جگہ نامعلوم ہے۔

فریبِ عشق ، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کے ساتھ ساتھ لذتِ عشق کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔انھوں نے دلائل اور شواہد کی بنیاد پر لذتِ عشق کو اس فہرست سے خارج کر دیا ہے۔کیونکہ یہ مثنوی مرزا شوق کی نہیں بلکہ ان کے بھانجے آغا حسن نظم کی ہے جس کا مقطع مثنوی کے آخر میں "نظم"، تخلص کے ساتھ شامل ہے۔ان سب کے ساتھ مرتب نے اس غلط فہمی کی مختلف وجوہات پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کے تحت لذتِ عشق کو مرزا شوق کی مثنوی سمجھا جاتا رہا ہے۔جس میں خصوص طور پر نول کشور پریس کا چھپا ہوا مجموعہ مثنویات ہے۔جس میں 1869 مثنویاتِ شوق کا مجموعہ پہلی بار شائع ہوا تھا۔اس میں شوق کے نام سے مندرجہ بالا چاروں مثنویاں شامل ہیں۔ بقول مرتب یہیں سے اس غلط فہمی کی ابتدا ہوتی ہے کہ لذتِ عشق بھی مرزا شوق کی مثنوی ہے لیکن یہ محض ایک غلط فہمی ہے اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

چوتھا ذیلی عنوان "مثنویات کا زمانہ تصنیف" ہے۔ اس میں تینوں مثنویوں کی تاریخ تحریر اور تاریخ اشاعت پر مفصل بحث کی گئی ہے۔مختلف مورخوں کی آرا اور دلائل کو شامل کرتے ہوئے اور تحقیقی زاویہ نظر سے ان کو رد اور قبول کیا گیا ہے۔ پانچواں ذیلی عنوان "منعِ اشاعت" کے نام سے ہے۔جس میں مرتب نے اس نقطے پر بحث کی ہے کہ مثنویاتِ شوق کی اشاعت پر پابندی عائد ہوئی تھی یا نہیں۔انھوں نے اس عنوان کے تحت مولانا حالی کی "مقدمہ شعر وشاعری" اور سرسید رضا علی کی کتاب "اعمال نامہ" کے مختلف اقتباسات نقل کیے ہیں جن میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مرزا شوق کی مثنویوں پر مخرب الاخلاق ہونے کی وجہ سے حکومت نے ان کی اشاعت پر پابندی لگا دی تھی۔لیکن ان دونوں حضرات نے کسی تحقیقی دلائل اور ثبوت کا ذکر نہیں کیا ہے جس کے سبب مرتب نے ان دونوں حضرات کے اقوال کو محض مفروضہ مانا ہے اور عدم ثبوت کی بنا پر رد کر دیا ہے۔انھوں نے یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ بعض لوگوں کے مطابق فریبِ عشق اور بہارِ عشق پر فحش نگاری کی وجہ سے پابندی عائد ہوئی اور بعض کے یہاں زہرِ عشق پر پابندی کا بیان ہے جس کا سبب اس میں بیان غم واندوہ اور آہ وبکا کے مناظر ہیں۔ان لوگوں کے مطابق جب اس مثنوی کو اسٹیج پر دکھایا گیا تو ان مناظر کو دیکھ کر ناظرین میں غم کی فضا چھا گئی اور کئی لوگوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ان حالات کو دیکھتے ہوئے حکومت نے اس مثنوی کو اسٹیج کرنے اور شائع کرنے پر بھی پابندی لگا دی۔لیکن مرتب کے نزدیک یہ تمام بیانات عدم ثبوت کی بنا پر محض مفروضے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ رشید حسن خاں بہت باریک بین اور تحقیق کے معاملے میں نہایت محتاط شخصیت کے مالک تھے وہ تنکے کی بنا پر دریا تلاش کرنے کا جوہر رکھتے تھے لہٰذا جن اصحاب نے شوق کی مثنویوں پر پابندی کی بات کہی ان میں سے کسی نے بھی کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے سوائے نظامی بدایونی کے جنھوں نے زہرِ عشق کے اپنے پاکٹ ایڈیشن کے دیباچے میں زہرِ عشق پر لگی پابندی کا ذکر کیا ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے اس آرڈر کا نمبر بھی درج کیا ہے جس میں یہ پابندی لگائی گئی تھی۔ رشید حسن

خاں کے تحقیقی مزاج نے اس نمبر کو پڑھ کر اس پر قناعت کرنے اور اسے مان لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس بیان کی مزید تحقیق کی اور شمس الرحمٰن فاروقی کی مدد سے الہ آباد کے سرکاری محافظ خانے میں منسوخی کے اس آرڈر کو تلاش کروایا جس کی نشاندہی نظامی صاحب نے کی تھی۔ بہت تلاش وجستجو کے بعد بھی اس نمبر کی کوئی فائل اس محافظ خانے سے دستیاب نہ ہو سکی جس وجہ سے نظامی کا دیا ہوا ثبوت شک وشبہ کے گھیرے میں آ گیا۔ اس بحث میں وہ ان تمام حضرات کے اقوال و آرا کو پیش کرتے ہیں جنھوں نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ شوق کی مثنویوں پر پابندی لگی تھی لیکن وہ کسی سے بھی متفق نظر نہیں آتے جس کا سبب ان کا تحقیقی مزاج اور تحقیقی وفاداری ہے جو بنا ثبوت کے محض شہرت کی بنا پر کسی بات کو قبول نہیں کرتا۔ کہتے ہیں۔

'' میرا خیال ہے کہ ممنوع الاشاعت ہونے کی روایت بہت کچھ ''شہرت'' پر رہی ہے۔ یہ عام تجربہ ہے کہ ایسی ہر ''شہرت'' بہت جلد اور بہت دور تک پھیل جایا کرتی ہے اور اس پر یقین کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔ ایسی شہرت سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ کتاب بکتی خوب ہے۔ میں اس پر بھرپور زور دینا چاہتا ہوں کہ شہرت واقعیت کی مرادف نہیں۔ شہرت غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی ایسی روایتوں کو لازمی طور پر قبولِ روایت کے آداب کے تحت ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے، محض شہرت کی بنیاد پر نہیں۔''5

چھٹا عنوان ''مطبوعہ نسخے'' کے نام سے شامل ہے۔ جس میں مرتب نے تینوں مثنویوں کے حاصل شدہ مطبوعہ نسخوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان کو فریبِ عشق کے تین مطبوعہ نسخے حاصل ہو سکے جن میں قدیم ترین نسخہ 1272ھ(1886) کا ہے۔ اسی طرح بہارِ عشق کے آٹھ اور زہرِ عشق کے چھ مطبوعہ نسخے حاصل ہو سکے۔ ان مطبوعہ نسخوں سے متعلق تمام ضروری معلومات انھوں نے نہایت محققانہ انداز میں اس عنوان کے تحت درج کر دی ہیں۔ ساتواں ذیلی عنوان '' ذیلی عنوانات'' ہے۔ اس میں انھوں نے مرزا شوق کی مثنویوں میں شامل کیے گئے ذیلی عنوانات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق مرزا شوق کی مثنویوں میں صرف بہارِ عشق کے دوسرے ایڈیشن میں جو خود مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد شائع ہوا تھا ایک ذیلی عنوان '' ترغیبِ عشقِ حقیقی'' کے تحت 123 اشعار کا اضافہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بعد کے مرتبین نے جن ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا ہے اس کا مصنف اور قدیم نسخوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نسخہ نظامی میں 6 ذیلی عنوانات، نسخہ مجنوں میں 14 اور نسخہ شاہ عبدالسلام میں 15 ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جو تحقیق کی رو سے نا قابلِ قبول ہیں۔

آٹھواں ذیلی عنوان '' ہیروئنوں کے نام'' سے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں مرتب نے شوق کی مثنویوں میں ہیروئنوں کے نام کی بحث اٹھائی ہے اور مختلف

> **شوق کی تین مثنویاں ہیں، ان کے لحاظ سے تین ہیروئنوں کے نام (ضرورتاً) تراش لیے گئے۔ ہم کو یہ بات واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اصلاً کسی مثنوی کی ہیروئن کا کوئی نام نہیں، مہ پارہ، مہ جبیں، ماہ لقا فرضی نام ہیں۔**

دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ شوق کی مثنویوں میں مرتبین نے ہیروئنوں کے جو نام رکھ دیے ہیں محض مفروضے ہیں اور مرتبین کی کم فہمی کی طرف اشارہ کرتے ہیں الغرض حقیقت سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ قابل محققین مجنوں گورکھپوری، سید محمد حیدر اور آل احمد سرور نے محض کلمہ صفت کے طور پر استعمال کیے گئے تعریفی الفاظ کو مثنوی کی ہیروئن کا نام مان لیا ہے جو کہ سراسر غلط بیانی ہے۔ ان سب کی تردید کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

''شوق کی تین مثنویاں ہیں، ان کے لحاظ سے تین ہیروئنوں کے نام (ضرورتاً) تراش لیے گئے۔ ہم کو یہ بات واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اصلاً کسی مثنوی کی ہیروئن کا کوئی نام نہیں، مہ پارہ، مہ جبیں، ماہ لقا فرضی نام ہیں۔'' 6

نواں ذیلی عنوان '' اشعار کی کمی بیشی'' کے نام سے شامل ہے۔ اس میں مرتب نے تینوں مثنویوں کے مختلف نسخوں میں اختلافِ شعر پر روشنی ڈالی ہے اور جس ایڈیشن میں جس جس شعر کا اضافہ کیا گیا ہے ان کی نشاندہی کی ہے۔ بلاشبہ یہ ان کے تحقیقی مزاج کی ہی دین ہے کہ اس قدر باریک بینی سے مطالعہ کر کے ایک ایک شعر کی ترمیم واضافے کی وضاحت کر دی ہے۔ دسواں ذیلی عنوان '' تکرار'' ہے جس میں شوق کی تینوں مثنویوں میں اشعار کی جو تکرار پائی جاتی ہے اس کی نشاندہی ملتی ہے۔ ایک ہی مضمون ایک ہی خیال اور ایک ہی رنگ کے اشعار تینوں مثنویوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں جس سے تینوں مثنویوں میں تکرار کا پہلو نکلتا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے جو اشعار پیش کیے ہیں درج ذیل ہیں۔

1۔ گو مجھی پر نہیں ہے یہ افتاد
سب کے ماں باپ ہوتے ہیں جلاد (بہارِ عشق)
کچھ تمھیں پر نہیں یہ افتاد
سب کے ماں باپ ہوتے ہیں جلاد (زہرِ عشق)

2۔ کیا چرایا تھا دم معاذ اللہ
میرے تو ہوش اڑ گئے واللہ (فریبِ عشق)
بل بے فقرہ ترا معاذ اللہ
میرے تو ہوش اڑ گئے واللہ (بہارِ عشق) 7

گیارہواں ذیلی عنوان ''مثنویاتِ شوق کے ماخذ'' کے نام سے شامل ہے۔ اس عنوان کے تحت مرزا شوق کی مثنویوں کے ماخذ پر بحث کی گئی ہے کہ ان مثنویوں کے اشعار و مضامین کا ماخذ کیا ہے۔ بعض محققین مثلاً مولانا حالی اور مجنوں گورکھپوری کے نزدیک ان کا ماخذ میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' ہے۔ جس کی وجہ فریبِ عشق اور بہارِ عشق کے بیشتر اشعار کی خواب وخیال کے اشعار سے مماثلت ہے۔ لیکن مرتب اس دلیل سے اتفاق نہیں رکھتے ان کے نزدیک شوق نے اپنی مثنوی لکھتے وقت خواب وخیال کو سامنے ضرور رکھا ہو گا لیکن کلی طور پر خواب وخیال کو اس کا ماخذ نہیں کہا جا سکتا۔ اس بحث میں وہ گیان چند جین کی اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں کہ مرزا شوق نے اپنی مثنویاں تحریر کرتے وقت میر، اثر، مومن اور شاید قلق کی مثنویوں سے استفادہ کیا۔ لیکن اس میں بھی وہ

آخرالذکر سے متفق نہیں کیونکہ قلق کی مثنوی ''طلسمِ الفت'' کا زمانہ تحریر وطباعت متعین نہیں جس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شوق نے قلق سے استفادہ کیا ہے یا قلق نے شوق سے۔ اس عنوان کے تحت دو مزید ذیلی عنوانات کو شامل کیا گیا ہے۔ الف: ''کیا مثنویاں شوق کی سرگزشت ہیں۔''، ب: ''وجہِ تصنیف''۔ ان عنوانات کے تحت انھوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے کہ ان مثنویوں کے ہیرو مرزا شوق ہیں یا نہیں۔ مرزا حالی، مجنوں گورکھپوری اور پالوی صاحب کے نقل کردہ اقتباسات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کے ہیرو خود مرزا شوق ہی ہیں لیکن ان حضرات کے بیان خود شک وشبہ کا شکار اور قطعیت سے عاری ہیں سو مرتب ان پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مختلف تحقیقی دلائل کی بنا پر یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ یہ محض شوق صاحب کا اندازِ بیان تھا جس نے واقعات کو حقیقی اور مثنویوں کو ان کی آپ بیتی بنا دیا ہے اس میں حقیقت کی کوئی گنجائش نہیں۔ بقول مرتب۔

''بہارِ عشق، فریبِ عشق اور زہرِ عشق تینوں مثنویوں میں شوق نے ایک ہی پیرایہ اظہار اختیار کیا ہے کہ اپنے آپ کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے اور پوری کہانی سنائی اس طرح جیسے آپ بیتی ہو، یہ بیان کا ایک خاص انداز ہے۔ اس طرح کہانی میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہوسکتا ہے اور سننے والوں پر زیادہ اچھا اور گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس پیرایہ بیان کو حقیقت بیانی پر محمول کرنا اور سچ مچ اسے بیان کرنے والے کی آپ بیتی سمجھ لینا اندازِ بیان کے اسرار ورموز سے ناآشنائی کا اعلان کرتا ہے۔''[8]

بارہواں ذیلی عنوان ''زبان و بیان'' ہے۔ اس میں نے مرزا شوق کی مثنویوں کی زبان اور اندازِ بیان پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ خود مرزا شوق کا یہ بیان ہے کہ انھوں نے اپنی مثنویوں میں بیگماتِ محل کی زبان اور محاوروں کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مرتب یہاں مختلف مثالوں کے ذریعے مرزا شوق کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں۔ جہاں مرزا شوق کی زبان دہلی کی یاد دلاتی ہے انھوں نے مثالوں کے ذریعے اس کی بھی نشاندہی کر دی ہے جس سے بہ آسانی ان کی زبان کی شوخی اور انداز کی رنگارنگی سے قاری کو واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مقدمہ مرتب کا تیرہواں اور آخری ذیلی عنوان ''طریقہ کار'' ہے۔ اس میں نے اپنے طریقہ کارِ تدوین پر روشنی ڈالی ہے۔ مثنویوں کے جو نسخے ان کو حاصل ہو سکے اور جہاں سے حاصل ہو سکے اور جس کے ذریعے حاصل ہوئے ان تمام صاحبان کے نام انھوں نے ان کے شکریے کے ساتھ درج کر دیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ابتدائے کتاب سے لیکر آخری حصے تک جن جن عنوانات کے زیرِ بحث کتاب کو مرتب کیا ہے ان سب کا مختصر بیان ''طریقہ کار'' عنوان کے تحت شامل کر دیا ہے۔ طریقہ کار کے ساتھ ہی مقدمہ مرتب مکمل ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ رشید حسن خان نے مرزا شوق کی مثنویوں کا متن شاملِ کتاب کیا ہے۔ تینوں مثنویوں کے متون جو قدیم نسخوں میں ان کو حاصل ہوئے ان کو اسی صورت میں نقل کیا گیا ہے۔ بعد کے مرتبین نے جو ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں انھوں نے ان عنوانات کو شامل نہیں کیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مصنف کے قائم کردہ عنوانات نہیں اور جن کے ہیں ان کے دیے گئے عنوانات کو مصنف کے متن کے ساتھ شامل کرنا ان کے نزدیک تحقیق کے اصول کے خلاف اور سخت ناپسندیدہ ہے۔ مرتب نے متون کو اسی ترتیب سے رکھا ہے جو ان کی تحریر کی ترتیب ہے یعنی پہلے فریبِ عشق پھر بہارِ عشق اور آخر میں زہرِ عشق کا متن شامل کیا ہے۔ خاں انھوں نے اشعار پر نمبر بھی درج کیے ہیں جن کی ترتیب یہ رکھی ہے کہ پہلی مثنوی کا پہلا شعر نمبر 1 سے شروع ہوتا ہے اور یہی نمبر تسلسل کے ساتھ آخر تک جاری رہتا ہے اور زہرِ عشق کے آخری شعر پر یہ نمبر ختم ہوتا ہے۔ اس میں دو طرح سے نمبروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ تینوں مثنویوں کا ایک مسلسل نمبر رکھا گیا ہے۔ مثلاً فریبِ عشق شعر 1 سے 418 تک ہے تو بہارِ عشق کے پہلے شعر کا نمبر ہوگا 419 اور بہارِ عشق کے آخری شعر کا نمبر ہے 1261 تو زہرِ عشق کے پہلے شعر کا نمبر ہے 1262 اور زہرِ عشق کے آخری شعر کا نمبر ہے 1819 جو کہ تینوں مثنویوں کا آخری شعر ہے۔ اس التزام کی وجہ مرتب نے یہ بتائی ہے کہ ضمیمہ تشریحات میں ہر شعر کا نمبر درج کر کے اس کی تشریح کی گئی ہے تا کہ پورا شعر دوبارہ نقل نہ کرنا پڑے اور قاری کو وہ شعر بہ آسانی نمبر کی مدد سے مل سکے۔ دوسرا التزام جو انھوں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مثنوی کے مسلسل نمبر کے ساتھ اس کے ہر دسویں شعر پر نیچے چھوٹی سی لکیر کھینچ کر مثنوی کا اپنا نمبر بھی درج کر دیا ہے جس سے کہ قاری ہر مثنوی کے اشعار کی تعداد بھی بہ آسانی دریافت کر سکے مثلاً بہارِ عشق کے پہلے شعر کا نمبر اس طرح درج ہے (1:419) دسواں شعر نمبر (10:428) بیسواں شعر (20:438)۔ اسی طرح زہرِ عشق کے پہلے شعر کا نمبر (1:1261) دسواں شعر (10:1270) بیسواں شعر (10:1280) اس طرح ہمیں تینوں مثنویوں کے کل اشعار کی تعداد بھی معلوم ہو جاتی ہے اور ہر مثنوی کے الگ الگ اشعار کی تعداد بھی۔ تینوں مثنویوں کے اشعار کی مجموعی تعداد 1819 ہے فریبِ عشق کے اشعار کی تعداد 418، بہارِ عشق کے اشعار کی تعداد 842، اور زہرِ عشق کے اشعار کی تعداد 559 ہے۔ مرتب نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ متن میں کوئی ترمیم نہ کی جائے جیسا اصل نسخوں میں دستیاب ہوا ہے جوں کا توں پیش کر دیا جائے۔

تینوں مثنویوں کے اشعار کی مجموعی تعداد 1819 ہے فریبِ عشق کے اشعار کی تعداد 418، بہارِ عشق کے اشعار کی تعداد 842، اور زہرِ عشق کے اشعار کی تعداد 559 ہے۔ مرتب نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ متن میں کوئی ترمیم نہ کی جائے جیسا اصل نسخوں میں دستیاب ہوا ہے جوں کا توں پیش کر دیا جائے۔

متن کے بعد نے چار ضمیمے شاملِ کتاب کیے ہیں جن میں پہلا ضمیمہ ''تشریحات'' کے عنوان سے ہے۔ اس ضمیمے میں نے تینوں مثنویوں کے مختلف اہم اشعار کی تشریح کی گئی ہے جس سے قاری کو اگر کسی شعر کو سمجھنے میں مشکل درپیش ہو تو وہ بہ آسانی اس کی تشریح پڑھ کر شعر کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔ تشریح کے ساتھ ساتھ نے مشکوک الفاظ کی تذکیر وتانیث کی بحث بھی قائم کی گئی ہے اور مختلف لغات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی وضاحت کل کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اشعار میں مستعمل تلمیحات اور محاورات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرتب نے اس میں تمام اشعار کی تشریح نہیں کی ہے بلکہ جو

اشعار ذرا مشکل اور وضاحت طلب تھے ان کی تشریح کر کے معنی واضح کیے ہیں تاکہ قاری کی مشکل آسان اور الجھن دور ہو سکے۔ دوسرا ضمیمہ ''تلفظ اور املا'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں متن میں شامل خاص خاص الفاظ کے تلفظ اور املا پر بحث کی گئی ہے۔ نے اس ضمیمے میں مختلف لغات مثلاً امیر اللغات، غیاث اللغات، سراج اللغات، نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ کا حوالہ دیتے ہوئے متعدد الفاظ کے صحیح املا اور تلفظ کی نشاندہی کی ہے۔ تیسرا ضمیمہ ''اختلافِ نسخ'' ہے جس میں مثنویاتِ شوق کے مختلف نسخوں میں جو اختلافات پائے گئے ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھا ضمیمہ ''الفاظ اور طریقِ استعمال'' کے عنوان سے ہے جس میں مثنوی میں آئے مختلف الفاظ اور ان کے استعمال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان چاروں ضمیموں کے بعد نے ایک اور عنوان ''فرہنگ'' کے نام سے قائم کیا ہے۔ یہ مثنویاتِ شوق مرتبہ رشید حسن خاں کا آخری عنوان ہے جس میں مثنویوں کے متعدد الفاظ معنیٰ کے ساتھ درج ہیں۔ گویا رشید حسن خاں نے ایک فرہنگ لکھ کر کتاب کے آخر میں شامل کر دی ہے اور اکثر الفاظ کے آگے اس شعر کا نمبر بھی لکھ دیا ہے جس شعر میں وہ لفظ استعمال ہوا ہے جس سے قاری کو بہ آسانی وہ شعر بھی مل جائے اور لفظ کے معنیٰ کی فراہمی بھی ہو جائے۔ اسی فرہنگ کے ساتھ کتاب اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

رشید حسن خاں کا طریقہ کار تحقیق کو اعلیٰ درجے پر فائز کرتا ہے۔ تحقیق و تدوین کے اصول گویا کی زندگی کے اصول تھے وہ ثبوت اور دلائل کی عدم موجودگی میں کسی بات یا مفروضے کو قابلِ قبول نہیں مانتے تھے۔ بقول پروفیسر شارب رودولوی۔

''رشید حسن خاں تحقیق کے معاملے میں قاضی عبدالودود کی طرح کسی مروت یا رعایت کے قائل نہیں ہیں اور کسی بھی سلسلے میں جب تک سارے شواہد جمع نہ کر لیں قلم نہیں اٹھاتے۔''9

علاوہ ازیں ان کے مزاج میں یہ اکڑ اور غرور بھی نہیں کہ جو بات میرے قلم سے نکل گئی گویا وہی پتھر کی لکیر ہے، وہی حتمی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ آگے آنے والے محققین کے لیے راہ ہموار کرتے ہوئے اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ ان کا یہ انداز نہیں ہوتا کہ جو تلاش انھوں نے کی ہے وہی آخری ہے کوئی اور اب اس میں

اردو ادب کے سنجیدہ قاری کو رشید حسن خاں کی تدوین کردہ مثنویاتِ شوق کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس کے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ مرزا شوق اور ان کی مثنویوں سے متعلق جو عام آرا اور غلط فہمیاں ہیں وہ تمام اس کے مطالعے سے دور ہو جائیں گی دوسرا یہ کہ قاری کو تحقیق و تدوین کے طریقہ کار اور اہمیت و افادیت سے شناسائی حاصل ہوگی۔

کچھ نہیں کر سکتا بلکہ وہ ہر بات کو بیان کرتے ہوئے ایک محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں مثال کے طور پر مثنوی فریبِ عشق کا جو بنیادی نسخہ انھیں حاصل ہو سکا اس کے متعلق کہتے ہیں۔ ''اس مثنوی کا اس سے بہتر اور اس سے قدیم نسخہ موجود نہیں، یعنی ہمارے علم میں نہیں۔''10 گویا وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ کوئی تحقیقی مزاج رکھنے والا شخص اگر اس سے بھی قدیم نسخہ ڈھونڈ لے تو یہ ممکن ہے کہ اسے کامیابی مل جائے لیکن اب تک ان کی تلاش کے مطابق اس سے قدیم نسخہ موجود نہیں۔

رشید حسن خاں نے جس محققانہ انداز میں مثنویاتِ شوق کی تدوین کی ہے وہ تحقیق کے میدان میں بت شکنی کی حیثیت رکھتی ہے۔ عرصے سے مرزا شوق کو بدنام شاعر اور ان کی مثنویوں کو مخرب الاخلاق مانا جاتا رہا ہے انھوں نے ان باتوں کی تردید بڑے محققانہ انداز میں کی ہے۔ اردو ادب کے سنجیدہ قاری کو رشید حسن خاں کی تدوین کردہ مثنویاتِ شوق کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس کے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ مرزا شوق اور ان کی مثنویوں سے متعلق جو عام آرا اور غلط فہمیاں ہیں وہ تمام اس کے مطالعے سے دور ہو جائیں گی دوسرا یہ کہ قاری کو تحقیق و تدوین کے طریقہ کار اور اہمیت و افادیت سے شناسائی حاصل ہوگی۔

جس طرح ادب تحقیق کے بغیر اور تحقیق صداقت کے بغیر نامکمل ہے اسی طرح رشید حسن خاں کے ذکر کے بغیر تحقیق کی بات ادھوری ہے۔ رشید حسن خان کا نام اردو ادب و تحقیق کا ناقابلِ فراموش جز ہے۔ اردو تحقیق کو آسمان کی بلندیوں پر پہچانے کا سہرا رشید حسن خاں کے ہی سر ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ رشید حسن خاں نے متعدد قدیم متون کی تدوین کر کے اور اردو املا اور تلفظ کے عنوان پر نادر معلوماتی کتابیں اور متعدد دوسری اہم کتابیں تحریر کر کے اردو ادب کے خزانے کو بیش قیمتی نگینوں سے سرفراز کیا ہے جس کے لیے دنیائے اردو ادب ہمیشہ خاں صاحب کی احسان مند رہے گی اور اردو ادب کے آسمان پر ان کے نام کا ستارہ غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ چمکتا رہے گا۔

حوالہ

-1 (مضمون: کچھ اپنے بارے میں: رشید حسن خاں) رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد دوم) مرتبہ: ابراہیم افسر، ایچ، ایس، آفسٹ پرنٹرس، دہلی 2019 (ص 56)

-2 (مضمون: رشید حسن خاں: ایک معتبر نام: پروفیسر ظفر احمد صدیقی) رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد دوم) مرتبہ ابراہیم افسر، ایچ، ایس، آفسٹ پرنٹرس، دہلی 2019 (ص 171)

-3 (مضمون: رشید حسن خاں: ایک منفرد محقق: پروفیسر ابنِ کنول) ایضاً (ص 188)

-4 مثنویاتِ شوق مرتبہ: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو (ہندی) نئی دہلی 1998 (ص 22)

-5 ایضاً (ص 108)

-6 ایضاً (ص 111)

-7 ایضاً (ص 117)

-8 ایضاً (ص 135)

-9 (مضمون: رشید حسن خاں اور اردو تحقیق: پروفیسر شارب رودولوی) رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد دوم) ابراہیم افسر، ایچ، ایس، آفسٹ پرنٹرس، نئی دہلی 2019 (ص 149)

-11 مثنویاتِ شوق مرتبہ: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو (ہندی) نئی دہلی 1998 (ص 157)

■

Farheen Shakeel
Urdu Scholar (Urdu)
Aligarh Muslim University, Aligarh
Address - Colony, Begum Aziz-un-Nisa Hall
Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002
Mob. 9045607628
Email: farheenshakeelf684@gmail.com

رفیع الدین ناصر

سائنسی ادب کے فروغ میں اورنگ آباد کا کردار

اردو زبان اور سائنسی تحریر کا تاریخی پس منظر

عام طور پر معترضین کی جانب سے یہ تاثر پیش کیا جاتا ہے کہ اردو صرف شاعری، داستانوں، حسن و عشق کے تذکروں اور جذباتی اظہار کی زبان ہے۔ علمی و سائنسی تاریخ اس مفروضے کی یکسر تردید کرتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اردو سائنسی تحریر کی روایت نہ صرف قدیم ہے بلکہ انتہائی مستحکم اور ثروت مند بھی رہی ہے۔ جب جدید مغربی علوم اور سائنسی ایجادات ہندوستان میں متعارف ہوئیں، تو اردو نے ان کا استقبال محض ایک مادری زبان کے طور پر نہیں، بلکہ ایک علمی و فکری واسطے (Academic Medium) کے طور پر کیا۔

برصغیر کی علمی تاریخ گواہ ہے کہ طب، ریاضی، فلکیات، کیمیا، طبیعیات، حیاتیات اور جدید ٹیکنالوجی کے پیچیدہ میدانوں میں اردو کے ذریعے ایک وسیع علمی سرمایہ تیار کیا گیا۔ برصغیر کے بدلتے ہوئے علمی منظرنامے میں اردو نے ادبی اظہار کی حدود کو توڑ کر خود کو سائنسی اور عقلی مباحث کے سانچے میں ڈھالا، جس کے نتیجے میں ایک ایسے منفرد سائنسی ادب (Scientific Literature) نے جنم لیا جس نے عوام الناس میں سائنسی شعور بیدار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

دکن اور اورنگ آباد کا تاریخی و ادبی تسلسل

سرزمینِ اورنگ آباد۔ دکن (مہاراشٹر) کو اردو ادب کا گہوارہ اور اس کی نشو و نما کا ابتدائی مرکز ہونے کا تاریخی شرف حاصل ہے۔ اورنگ آباد، دکنی اردو کی کلاسیکی روایت کا ایک درخشاں ستون رہا ہے۔ مغلیہ دورِ حکومت، خصوصاً محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں یہ شہر دکن کا دارالخلافہ بننے کے بعد علم و دانش، صوفیانہ افکار اور ادبی سرگرمیوں کا بڑا مرکز بن کر ابھرا۔

اس شہر کی مٹی نے ولی دکنی (ولی اورنگ آبادی، 1667 تا 1707) اور سراج اورنگ آبادی (سید شاہ سراج الدین، 1712 تا 1763) جیسے یگانۂ روزگار شعرا پیدا کیے، جنھوں نے دکنی اسلوب کو شمالی ہند کی زبان سے جوڑنے میں پل کا کردار ادا کیا۔ صوفیانہ اور غنائی شاعری کے اس مرکز نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے فکری دھارے کو بدلا۔ ماضی سے لے کر حال تک، اورنگ آباد نے مسلسل ایسے ادیب، نقاد، مترجم اور ماہرینِ تعلیم پیدا کیے، جنھوں نے عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی۔

اردو سائنسی شعور کا قومی ماحولیاتی نظام (Ecosystem)

اردو سائنس کے فروغ میں اورنگ آباد کا کردار محض مقامی یا علاقائی اہمیت کا حامل نہیں ہے، بلکہ قومی سطح پر اس کی حیثیت ایک مثالی نمونے (Role Model) کی ہے۔ اس شہر نے سائنسی علوم کو مادری زبان میں منتقل کرنے اور اسے عام فہم بنا کر معاشرے کے آخری فرد تک پہنچانے کے لیے ایک مکمل سائنسی 'ماحولیاتی نظام' (Ecosystem) وضع کیا۔

اس نظام کے بنیادی ستونوں میں تعلیمی ادارے، مطبوعاتی ذرائع، ریڈیو، اخبارات اور وہ مخلص قلمکار شامل ہیں جنھوں نے سائنس اور اردو کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جہاں ریڈیو نے سائنسی آواز کو گھر گھر پہنچایا، وہیں اخبارات نے اسے الفاظ دیے، تعلیمی اداروں نے اسے ذہنوں میں اتارا اور قلمکاروں نے اسے کتابی شکل میں محفوظ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج مرہٹواڑہ کا یہ خطہ اردو سائنسی ادب کا ایک اہم قلعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

تعلیمی اداروں کا کلیدی کردار اور تحریکِ عثمانیہ کے اثرات

بیسویں صدی کے اوائل میں حیدرآباد دکن کی جامعہ عثمانیہ (قائم شدہ 1918) نے اردو سائنسی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا۔ یہ دنیا کی پہلی ایسی یونیورسٹی تھی جہاں طب (Medical)، انجینئرنگ اور دیگر اعلیٰ سائنسی علوم کی تدریس کا واحد ذریعہ اردو زبان تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے 'دارالترجمہ' نے سائنسی اصطلاحات (Scientific Termonologies) کا ایک ایسا مستحکم نظام وضع کیا جس نے اردو کو جدید ترین علوم کے ہمنوا بنا دیا۔ اورنگ آباد کے بیشتر قلمکاروں اور اساتذہ کے علمی سوتے اسی عثمانیہ تحریک سے پھوٹے تھے۔

اورنگ آباد کا 'عثمانیہ کالج' حیدرآباد ریاست کے اسی تعلیمی مشن کا ایک اہم مرکز تھا، جہاں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 1920 اور 1930 کے عشروں میں بحیثیت پرنسپل خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اس

ادارے کو جدید علوم بالخصوص سائنس کی تدریس اور تراجم کا مرکز بنا دیا۔

اورنگ آباد کے تعلیمی اداروں نے اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے بارہویں جماعت (Higher Secondary) تک سائنس کے تمام بنیادی مضامین — طبیعیات (Physics)، کیمیا (Chemistry)، حیاتیات (Biology) اور ریاضی (Mathematics)— کو اردو میڈیم میں پڑھانے کا ایک نہایت مربوط اور کامیاب نظام قائم کیا۔ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ نے یہ عملی طور پر ثابت کیا کہ اردو زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بھی میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر پیشہ ورانہ (Professional) مسابقتی امتحانات میں نہ صرف 'میرٹ' حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ قومی و بین الاقوامی سطح پر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس کامیابی نے ملک میں اردو سائنسی فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے جب 'انجمن ترقی اردو' کے پلیٹ فارم سے کام شروع کیا، تو انھوں نے اورنگ آباد سے تاریخی ماہنامہ 'سائنس' (Science) کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ برصغیر میں سائنسی مضامین، جدید تراجم اور عمومی معلومات کا معتبر ترین ذریعہ بن گیا۔ مولوی عبد الحق کی سرپرستی میں ہزاروں سائنسی اصطلاحات وضع کی گئیں۔

ان کے بعد اورنگ آباد سے شائع ہونے والے مقامی اور علاقائی اخبارات نے اس مشعل کو روشن رکھا۔ یہاں کے روزناموں نے زراعت، صحت، حیاتیات، فلکیات، اور جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی پر ہفتہ وار سائنسی ایڈیشنز اور کالمز کو اپنے صفحات کا مستقل حصہ بنایا۔ اخباری صحافت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سائنسی اصطلاحات عام فہم بن کر عوامی لغت کا حصہ بن گئیں، جس نے معاشرے سے توہم پرستی کے خاتمے اور عقلی و سائنسی سوچ (Scientific Temperament) کے فروغ میں نمایاں مدد کی۔ جو ملک میں اردو میں سائنس کے فروغ کے لیے رول ماڈل بنا۔

آل انڈیا ریڈیو اورنگ آباد نے سائنسی معلومات کو تعلیمی اداروں کی چار دیواری سے نکال کر عام انسان کے ڈرائنگ روم اور کھیت کھلیان تک پہنچا دیا۔ یہاں سے نشر ہونے والا طویل المدت پروگرام 'سائنس نامہ'

> اورنگ آباد کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ یہاں اردو اور سائنس کے درمیان کبھی کوئی خلیج پیدا نہیں ہونے دی گئی۔ ریڈیو نے سائنسی شعور کو آواز بخشی، اخبارات نے اسے الفاظ کا جامہ پہنایا، تعلیمی اداروں نے اسے ذہنوں میں راسخ کیا اور قلم کاروں نے اسے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا۔ انہی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج مرہٹواڑہ کا یہ خطہ اردو سائنسی ادب اور سائنسی شعور کا ایک مضبوط اور ناقابلِ تسخیر مرکز تصور کیا جاتا ہے۔

سائنسی شعور کی بیداری کا ایک تاریخی ذریعہ ثابت ہوا۔ اس پروگرام کے تحت پیچیدہ سائنسی تھیوریز کو عام فہم اور شگفتہ اردو میں پیش کیا جاتا تھا۔ مقامی سائنس دانوں، لکچررز اور محققین کی تقاریر اور انٹرویوز اس پروگرام کا حسن تھے۔ اس اسٹیشن سے نشر ہونے والی سائنسی تقاریر کا معیار اس قدر بلند تھا کہ آل انڈیا ریڈیو کے دیگر قومی اسٹیشنز نے انھیں دوبارہ نشر (Relay) کیا، جبکہ بعد میں ان تقاریر کا پشتو اور دیگر علاقائی و غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کر کے بین الاقوامی سطح پر نشر کیا گیا، جو اورنگ آباد کے ماہرین کی علمی صلاحیتوں کا عالمی اعتراف ہے۔

اورنگ آباد کی سائنسی زرخیزی کا اندازہ یہاں کے ان نامور قلمکاروں، پروفیسروں اور اساتذہ کی انفرادی خدمات سے لگایا جا سکتا ہے، جنھوں نے مختلف سائنسی مضامین پر مشتمل تصانیف کا ورثہ چھوڑا ہے:

محمد عبدالحفیظ (مرحوم): اردو میں سائنسی درسی کتب کی تصنیف کی تاریخ محمد عبدالحفیظ (15 مارچ 1920 تا 26 جولائی 2003) کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ وہ مہاراشٹر میں بارہویں جماعت کے لیے اردو زبان میں طبیعیات (Physics) کی درسی کتاب تحریر کرنے والے پہلے مصنف بنے۔ جب اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے اعلیٰ ثانوی سطح پر کوئی مواد دستیاب نہیں تھا، تب انھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا، جسے پربھنی ایجوکیشن سوسائٹی نے شائع کیا اور اس کا مقدمہ ڈاکٹر مظہر محی الدین نے لکھا۔ یہ کتاب بعد کے پبلشرز کے لیے ایک نمونہ بن گئی اور اس کی اشاعت نے خطے کے دیگر اہل قلم کے حوصلوں کو جلا بخشی۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی پوری زندگی اردو میڈیم کے طلبہ کی رہنمائی کے لیے وقف کر دی تھی۔

ڈاکٹر مظہر محی الدین (مرحوم): علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم اور مولانا آزاد کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر مظہر محی الدین (1936 تا 2007) کا اصل مضمون ریاضی (Mathematics) تھا۔ انھوں نے بارہویں جماعت کے لیے 'Mathematics and Statistics' پر معیاری کتابیں تحریر کیں۔ انھوں نے NCERT کی پانچویں سے لے کر گیارہویں جماعت تک کی ریاضی کی کتابوں کا اردو ترجمہ کر کے ایک عظیم سائنسی و تعلیمی خدمت انجام دی۔ حکومتِ مہاراشٹر اور مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ نے انھیں 'مثالی معلم' (Ideal Teacher Award) کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کی ایڈوائزری کمیٹی کے رکن بھی تھے اور انھوں نے ڈاکٹر رفیق زکریا کی مشہور انگریزی کتاب 'Muhammad and Quran' کا بہترین اردو ترجمہ بھی کیا۔ ریاضی جیسے مضمون میں ان کی خدمات مثالی ہیں۔

ڈاکٹر مسعود احمد (مرحوم): ڈاکٹر مسعود احمد (1941 تا 2016) کا بنیادی میدان حیوانیات (Zoology) تھا، تاہم سائنسی علوم پر ان کو دسترس حاصل تھی۔ ان کی سب سے بڑی انفرادیت یہ تھی کہ انھوں نے سائنس کو ادبی چغہ پہنا کر اس انداز سے پیش کیا کہ خشک سائنسی حقائق بھی دلچسپ، رومانوی اور تجسس سے بھرپور افسانے کی طرح معلوم ہونے لگے۔ ان کے سائنسی طرزِ نگارش کو عالمی سطح پر سراہا گیا۔

کیپٹن ڈاکٹر ایم ایم شیخ: اورنگ آباد میں نئی نسل کے اندر سائنسی رجحان پیدا کرنے کا سہرا کیپٹن ڈاکٹر ایم ایم شیخ کے سر جاتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کی 100

اردو سائنس کے فروغ میں اورنگ آباد کا کردار محض مقامی یا علاقائی اہمیت کا حامل نہیں ہے، بلکہ قومی سطح پر اس کی حیثیت ایک مثالی نمونے (Role Model) کی ہے۔ اس شہر نے سائنسی علوم کو مادری زبان میں منتقل کرنے اور اسے عام فہم بنا کر معاشرے کے آخری فرد تک پہنچانے کے لیے ایک مکمل سائنسی 'ماحولیاتی نظام' (Ecosystem) وضع کیا۔

سے زائد سائنسی تقاریر نشر ہو چکی ہیں، جو بعد میں کتابی شکل میں 'سائنسی شعاعیں' کے نام سے منظرِ عام پر آئیں اور اس پر انھیں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی ملا۔ ان کی دیگر تصانیف میں 'ریشم کا کیڑا'، 'قرآن اور تخلیقِ انسان' اور حال ہی میں شائع ہونے والی 'ابتدائی مطالعہ حیوانیات' شامل ہیں۔ ان کے مضامین ریاستی، قومی اور بین الاقوامی جرائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔

محمد عرفان خان سوداگر: نوجوان نسل کے نمائندے اور سرسید کالج اورنگ آباد میں اردو کے لیکچرر محمد عرفان خان سوداگر ایک متحرک علمی شخصیت ہیں۔ مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری نے ان کی خدمات کے سبب انھیں ممبر نامزد کیا۔ 2012-13 میں انھیں 'ڈاکٹر رفیق زکریا آئیڈیل ٹیچر ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ انھوں نے بارہویں جماعت کے طلبہ کے لیے 'ماحولیاتی تعلیم' (Environmental Education) اور 'ماحولیاتی سائنس' جیسی گراں قدر کتابیں مرتب کیں، جنھیں ملک کی مختلف اکادمیوں نے انعامات سے نوازا۔ وہ عربی زبان کی تین کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور ان کی 15 سے زائد ریڈیائی تقاریر نشر ہو چکی ہیں۔ وہ 'سائنسی میلہ' اورنگ آباد کے مسلسل تین سالوں سے کوآرڈینیٹر ہیں۔ یہ سائنسی تحقیقی سرگرمی پورے ملک کے اردو میڈیم کے اداروں کے لیے مشعل راہ ہے۔

عبدالصمد شیخ: عبدالصمد شیخ مختلف زبانوں، جیسے چینی، عربی، جرمن، فارسی، اردو اور انگریزی پر عبور رکھتے ہیں۔ کمپیوٹر سائنس ان کا بنیادی میدانِ تخصص ہے، جس پر اب تک ان کی 23 کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے 12 تحقیقی مقالات بھی شائع ہو چکے ہیں۔ دنیا بھر میں ان کے 400 سے زائد لیکچرز منعقد ہو چکے ہیں، جن کے سلسلے میں انھوں نے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ انھیں چین سمیت متعدد قومی و بین الاقوامی اداروں کی جانب سے اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا۔ تحقیقی خدمات کے اعتراف میں انھیں 2019 میں ورلڈ ریسرچ کونسل، امریکہ کی جانب سے 'ریسرچ رتن ایوارڈ' بھی عطا کیا گیا۔ کمپیوٹر سائنس اور اردو زبان کے باہمی ربط پر ان کی تحقیقی خدمات کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور ان کے علمی و تحقیقی کام کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہے۔

ڈاکٹر قمر شریف: اورنگ آباد کی تعلیمی تاریخ میں ڈاکٹر قمر شریف کا نام ایک کامیاب صدر مدرس (Headmistress) کے طور پر درج ہے۔ وہ 33 برسوں تک اس منصب پر فائز رہیں اور آل انڈیا ریڈیو کی ایڈوائزری ممبر بھی رہیں۔ حکومتِ مہاراشٹر کے ادارہ 'بال بھارتی' کے تحت انھوں نے متعدد جماعتوں کے لیے سائنسی کتب کے تراجم کیے اور 'بال بھارتی اردو لغت کمیٹی' کی رکن رہیں۔ سنہ 2000 میں حکومتِ مہاراشٹر نے انھیں 'مثالی معلّمہ' کے ریاستی اعزاز سے سرفراز کیا۔ ان کی مرتب کردہ تصانیف ملک کے مختلف اداروں میں حوالوں کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

محترمہ فاطمہ زہرہ: انھوں نے اپنے 30 سالہ تدریسی سفر کے دوران مہاراشٹر بورڈ کے نصاب کے مطابق نویں اور دسویں جماعت کے لیے علمِ ہندسہ (Geometry) اور الجبرا (Algebra) کی درسی کتابیں مرتب کیں۔ وہ 'بال بھارتی' کی معاون رکن کی حیثیت سے ریاضی اور سائنس کی اصطلاحاتی لغت کی تیاری میں شامل رہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کے متعدد تعلیمی و سائنسی پروگرام نشر ہوئے۔ ان کی تعلیمی و سماجی خدمات کے اعتراف میں 2014 میں حکومتِ ایران نے انھیں بحیثیت معزز مہمان مدعو کیا تھا۔ انھیں اتر پردیش اردو اکادمی و ریاستی سطح کے اعلیٰ تعلیمی اعزازات حاصل ہو چکے ہیں۔ سائنسی ادب کے تعلق سے انکی تحریریں بہت احترام سے پڑھی جاتی ہیں۔

محترمہ رفعت النسا قادری: گورنمنٹ کالج اورنگ آباد میں حیاتیات (Biology) کی لیکچرار محترمہ رفعت النسا قادری اردو اور سائنس کے سنگم کی ایک بہترین مثال ہیں۔ ان کی اب تک 4 سائنسی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جنھیں اتر پردیش اردو اکادمی اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے انعامات سے نوازا ہے۔ وہ سائنس اور قرآن مجید کے باہمی ربط (قرآن اور سائنس) پر گہرا تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالات (Research Papers) بھوٹان اور

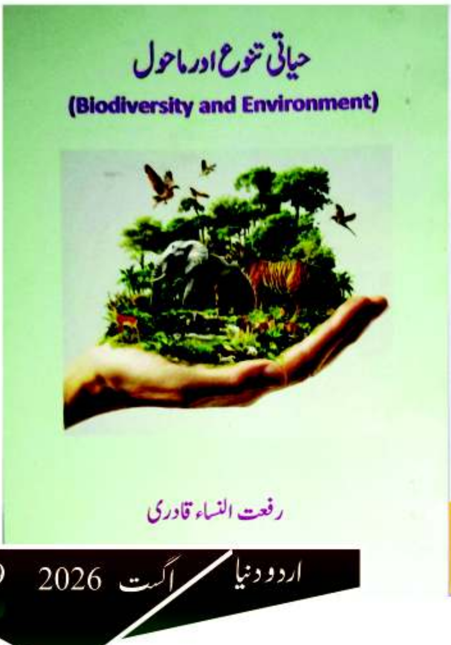

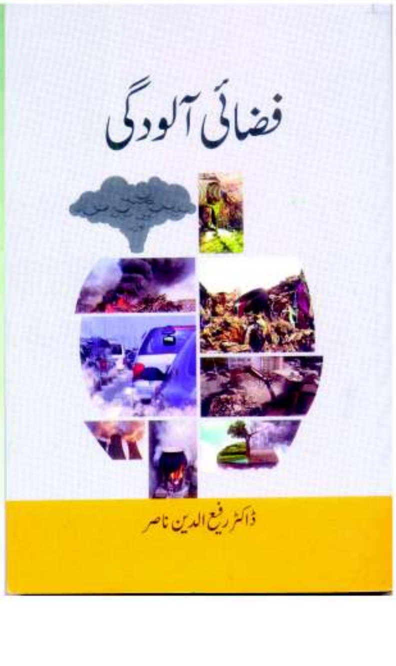

نیپال کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پیش کیے، جہاں انھیں بے حد سراہا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے وہ اردو اور مراٹھی دونوں زبانوں میں سائنسی پروگرام پیش کرتی ہیں۔

محترمہ شائستہ محمدی: ایک مقامی اسکول میں سائنس کی معلّمہ ہونے کے ناطے انھوں نے علمِ نباتات (Botany) کی پیچیدہ اور بنیادی معلومات کو انتہائی سادہ انداز میں کتابی شکل میں پیش کیا۔ ان کی اس منفرد کوشش پر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی نے انھیں اعزازات سے نوازا۔ وہ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے نباتات کی معلومات عام کرنے میں سرگرم ہیں۔

محترمہ مومن فرحت جہاں: مقامی اسکول میں کیمسٹری کی معلّمہ محترمہ مومن فرحت جہاں نے اپنی کتاب 'سائنسی انکشاف' میں علمِ کیمیا اور عمومی سائنس کے بنیادی اصولوں کو 'سوال و جواب' کے انتہائی دلچسپ اور سہل انداز میں پیش کیا، جسے اردو قارئین خصوصاً طلبہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

محترمہ مظہر سلطانہ: یہ ایک وظیفہ یافتہ (Retired) معلّمہ ہیں، جنھوں نے اپنی پوری ملازمت کے دوران اور اس کے بعد بھی طلبہ کو سائنسی نمائشوں (Science Exhibitions)، ریڈیائی پروگراموں اور سائنسی میلوں میں شریک کروا کر ان میں عملی سائنسی شعور پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر ثمرین فاروقی: مولانا آزاد کالج اورنگ آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ڈاکٹر ثمرین فاروقی کا بنیادی موضوع کیمیا (Chemistry) ہے۔ ان کے تحریر کردہ سائنسی ابواب کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) نے اپنے اعلیٰ تعلیمی نصاب میں شامل کیا ہے۔ وہ اپنے مضامین کے ذریعے جدید سائنس کو پورے ملک میں عام کرنے میں مصروف ہیں۔

ان بنیادی سائنسی مضامین کے علاوہ، اورنگ آباد کی مٹی نے نفسیات، طب اور معالجات کے میدان میں بھی اردو کو مالا مال کیا ہے: جن میں ڈاکٹر عزیز احمد قادری، ڈاکٹر غلام ربانی، ڈاکٹر لئیق الرحمٰن پروفیسر خواجہ عبدالنعیم۔ ڈاکٹر مظہر فاروقی، ڈاکٹر عارف پٹھان، حکیم محمد سلیم، جناب مسعود محی الدین، محترمہ عقیلہ بیگم، محترمہ خواجہ کوثر حیات، ڈاکٹر خان محمد عمران وغیرہ: ان جیسے کئی دیگر قلم کاروں نے بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر سائنسی شعور کو عام فہم بنانے اور معاشرے میں عقلیت پسندی کو رواج دینے میں مسلسل حصہ لیا ہے۔

> اورنگ آباد کی اردو ادبی خدمات ایک روشن تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس شہر نے نہ صرف اردو زبان کو پروان چڑھایا بلکہ اسے ایک مضبوط ادبی بنیاد بھی فراہم کی۔ شعرا، ادبا، تعلیمی اداروں اور ادبی تنظیموں کی مشترکہ کاوشوں نے اردو کو یہاں ایک زندہ اور متحرک زبان بنا دیا ہے۔

موجودہ دور میں جہاں گلوبلائزیشن اور انگریزی زبان کے غلبے کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم (Urdu Medium Education) کو ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر شدید چیلنجز کا سامنا ہے، وہیں اورنگ آباد کے علمی اور سائنسی معیار کا تسلسل ٹوٹا نہیں ہے۔ یہاں کی نئی نسل نے خود کو بدلتے ہوئے وقت کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

آج اورنگ آباد کے نوجوان قلمکار اور اساتذہ سوشل میڈیا، بلاگز، ویب سائٹس اور یوٹیوب چینلز کے ذریعے جدید سائنسی تھیوریز (جیسے کوانٹم فزکس، آرٹیفیشل انٹیلیجنس، اور بائیوٹیکنالوجی) کو اردو زبان میں آڈیو-ویژول فارمیٹ میں پیش کر رہے ہیں۔ 'سائنس بلاگ' اور مقامی ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اس کی واضح مثالیں ہیں۔

اورنگ آباد کی اردو ادبی اور سائنسی خدمات محض ایک تاریخی ملمع کاری نہیں بلکہ ایک زندہ، متحرک اور مسلسل جاری رہنے والا انقلاب ہے۔ ولی وسراج کے اس شہر نے یہ ثابت کر دکھایا کہ جس زبان میں غزل کے نازک احساسات بیان کیے جا سکتے ہیں، اسی زبان میں طبعیات کے کٹھن قوانین، ریاضی کے پیچیدہ مسائل اور کیمیا کے فارمولے بھی اتنی ہی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ پڑھائے اور لکھے جا سکتے ہیں۔

اس شہر کے اساتذہ، شعرا، ادبا، تعلیمی اداروں، ریڈیو اور اخبارات کی مشترکہ کاوشوں نے اردو کو ایک علمی، سائنسی اور معاشی زبان بنانے میں جو تاریخی کردار ادا کیا ہے، وہ تاریخ ہند کا ایک درخشاں باب ہے۔ یہ علمی کارواں آج بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں ہے، اور نئی نسل کے قلمکار اس سرمائے میں جو گراں قدر اضافہ کر رہے ہیں، وہ اس بات کی نوید ہے کہ اردو کا سائنسی مستقبل اس خطے میں ہمیشہ محفوظ اور روشن رہے گا۔

■

Dr. Rafiuddin
Principal, Shivaji College
Palsi Bakapur
Dist. Aurangabad-431008 (MS)
Mob.: 9422211634
Email: rafiuddinnaser@rediffmail.com

طالب اکرام

فروغ اردو میں

مشائخ الہ آباد کا کردار

برصغیر میں اردو زبان کا فروغ کسی ایک طبقے کی کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ مختلف تہذیبی، مذہبی اور سماجی عناصر کی مشترکہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ ان عناصر میں مشائخ عظام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ خصوصاً الہ آباد (پریاگ راج) ایک ایسا مرکز رہا جہاں علم و ادب اور تصوف نے مل کر اردو زبان کو پروان چڑھایا۔ تصوف کی تعلیمات ہمیشہ سادگی، محبت اور انسان دوستی پر مبنی رہی ہیں اور یہی خصوصیات اردو زبان میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس لیے مشائخ الہ آباد نے اردو کو اپنی تعلیمات کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔ سرزمین الہ آباد گنگا جمنی تہذیب کا سنگم قرار دیا گیا ہے۔ قدیم دور سے یہاں صوفیوں، سنتوں اور درویشوں کی آمد و رفت رہی ہے۔ کبیر، تلسی، سور، خسرو، جائسی، ابوالفضل، فیضی، ابن بطوطہ اور البیرونی سب الہ آباد کی گنگا جمنی تہذیب اور دلکشی پر فریفتہ رہے۔ دور قدیم سے ہی یہ سرزمین تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور علمی مرکز بنی رہی ہے۔ مغلیہ دور میں اس عہد کو ترقی ملی اور یہاں مختلف سلاسلِ تصوف کے بزرگوں نے قیام کیا۔ چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ سلاسل کے مشائخ نے خانقاہیں قائم کیں جو نہ صرف روحانی تربیت کا مرکز تھیں بلکہ علمی و ادبی سرگرمیوں کا بھی گہوارہ تھیں۔ ان خانقاہوں میں عوام کی رہنمائی کے لیے اردو زبان کو اختیار کیا گیا۔ یہ مشائخ اپنی خانقاہوں میں وعظ، نصیحت اور تعلیم کے لیے اردو کو ذریعہ بنایا تاکہ عوام الناس بھی ان کی باتوں کو سمجھ سکیں اور فیوض و برکات حاصل کر سکیں۔ رفتہ رفتہ یہ زبان مقبولیت حاصل کرتی گئی اور عوام و خواص کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔ ان مشائخ کے وعظ و ملفوظات اور مکتوبات کو ان کے مریدین و متوسلین اور عاشقین نے قلم بند کر کتابی شکل دی۔ جس سے اردو ادب کا فروغ ہوا۔ جس طرح سے الہ آباد گنگ و جمن کے میل سے سنگم بنا ہے، من و عن اردو زبان عربی اور فارسی کے علاوہ کئی زبانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی۔ اس ضمن میں مشائخ الہ آباد کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ جن میں شاہ محبّ اللہ فاروقی، علامہ اسحاق عباسی شاہ، سالار احمد غازی عباسی، قاضی رکن الدین عباسی حسینی میاں معروف چھیتے میاں عباسی، افضل عباسی، اجمل عباسی، سید منور علی شاہ، سید رفیع الزماں، شیخ غلام علی، شیخ زین الدین، شیخ محمد علیم، مولانا کمال الدین صدیقی، شیخ تاج الدین، صوفی عبدالخالق عباسی، صوفی اکرام الحق عباسی، مولوی عظیم الدین اور سید باسط علی قلندر وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جن سے الہ آباد اور اس کے اطراف و اکناف میں اردو زبان کی اشاعت و تبلیغ ہوئی۔ ان مشائخ کی تعلیمات نے اردو شعر و ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے، جس سے اردو نثر و نظم میں سادگی اور روانی پیدا ہوئی اور شاعری میں صوفیانہ موضوعات شامل ہوئے۔ اخلاقی اور روحانی مضامین کو فروغ حاصل ہوا جو بعد کے شعرا و ادبا کے کلام میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان مشائخ نے خانقاہوں کو محض عبادت گاہ نہیں بنایا بلکہ تعلیم اور تربیت گاہ بھی بنایا۔ ان کی تعلیمات کا بنیادی مقصد انسان کو انسان سے جوڑنا اور دلوں میں محبت پیدا کرنا تھا۔

یہ درست ہے کہ مشائخ کے افعال زیادہ تر خانقاہوں تک محدود رہے لیکن ان کی خدمات اور قربانیوں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان مشائخ عظام نے اردو کو عوامی زبان بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مشائخ الہ آباد نے اپنے پند و نصائح میں اردو زبان کو اختیار کیا جس سے یہ زبان جلد ہی عوام الناس میں مقبول ہوگئی۔ مشائخ الہ آباد نے اردو زبان کو محض ایک لسانی وسیلہ نہیں بلکہ روحانیت، اخلاقیات اور انسانی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بنایا۔ ان کی خدمات اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں مشائخ نے مختلف مقامات پر خانقاہیں قائم کیں اور اپنے پند و نصائح کے ذریعے بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے ہمہ تن گوش ہوگئے۔ اپنی روحانیت، اخلاق اور محبت کے ذریعے امن کو عام کیا اور مختلف مذاہب کے درمیان رواداری کو فروغ دیا، جس کی وجہ سے اردو زبان کو بھی ترقی نصیب ہوئی۔ ان میں علامہ اسحاق عباسی شاہ کا نام سرفہرست ہے، جو 7/ویں صدی ہجری میں پریاگ راج (الہ آباد) کے شمال مغرب ایک دیہی علاقہ 'چھیتے مئو' میں وارد ہوئے تھے۔ وہ محدث، مفسر، فقیہ، مورخ، ادیب، خطیب، اور صوفی تھے۔ عباسی خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کا سلسلہ نسب بالواسطہ 18/ویں پشت پر سیدنا عباس بن عبدالمطلب عم رسول سے جا ملتا ہے۔[1] تاریخ میں جس طرح خلافت عباسیہ کو عہد زریں کہا گیا اسی طرح ان کو اپنے عہد کا امام علم و

عمل تسلیم کیا گیا۔ علمی، روحانی اور اخلاقی رہنمائی کے حوالے سے وہ اپنے دور میں ممتاز تھے۔

ان کی خانقاہوں میں مذہب و مشرب کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک تھا۔ امیر و غریب اور رنگ و نسل کا ہرگز تفریق نہ تھا۔ ان کی بارگاہ میں آنے والا ہر شخص بلاکسی تفریق ایک ہی دسترخوان پر نیاز تناول کرتا تھا۔ گیارہویں صدی ہجری اور عہد شاہ جہانی کے معروف بزرگ شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کا نام اردو زبان کے فروغ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا سلسلہ نسب بابا فریدالدین گنج شکر سے ہوتا ہوا اکتالیس واسطوں پر فاروق اعظم سے جا ملتا ہے۔ وہ سلسلہ چشتیہ کے عظیم صوفی تھے۔ شیخ ابوسعید گنگوہی کے دست حق پر بیعت تھے۔ مرشد نے اجازت وخلافت سے سرفراز کر انھیں الہ آباد کی سرزمین کے لیے وقف کیا تھا۔ وہ بلند پایہ عالم تھے۔ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ کئی زبانوں پر مہارت رکھتے تھے۔ نظریہ وحدت الوجود کے مقلد تھے اور ابن عربی کی معرکہ الآرا تصنیف 'فصوص الحکم' کی شرح عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کی تھی، جن کے اردو ترجمے شاہ غلام مصطفےٰ مہرونڈوی اور شاہ باقر الہ آبادی نے کیے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف ترجمۃ الکتاب، حاشیہ ترجمۃ القرآن، انفاس الخواص، اخص الخواص، التسویہ، المغالطہ العامہ، عقائد الخواص، رسالہ غایۃ الغایات، عبادات الخواص، رسالہ مقدمۃ المعارف، مناظر اخص الخواص، تجلیۃ الفصوص، مراتب الوجود، سیر الٰہی، اعانۃ الاخوان، رسالہ وجود مطلق، رسالہ توحید اور امالۃ القلوب وغیرہ ہیں۔2 اس کے علاوہ ان کے ۱۸ر مکتوبات موجود ہیں۔ جو مکتوبات شاہ محبّ اللہ الہ آبادی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ 433 صفحات پر مشتمل ہے۔

اکبر الہ آبادی کے پیر بھائی سید محمد اکبر ابوالعلائی شاہ 1857 کے بعد جب داناپور سے سرزمین الہ آباد نزول اجلال کیے، تو شیخ وحیدالدین کڑہ مانک پوری (الہ آباد) سے بیعت حاصل کی۔ وہ زبردست عالم اور عظیم صوفی تھے۔ بنی نوع انسان کی خدمت شعاری ان کا مشغلہ تھا۔ شاعری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اپنی شاعری اور وعظ ونصیحت سے عوام الناس کے بہت قریب تھے۔ ان کے دو دیوان ملتے ہیں۔ تجلیات عشق اور جذبات اکبر، جو مقبول خاص وعام ہیں۔ 'تجلیات عشق' سے ایک رباعی ملاحظہ ہو

کیا جانیے کس جگہ پہ کھویا ہوں میں
اک عمر سے آپ اپنا جویا ہوں میں
کھلتی نہیں اپنی شور محشر سے بھی آنکھ
کیسی غفلت کی نیند سویا ہوں میں 3

اسی طرح 'جذبات اکبر' سے ایک رباعی ملاحظہ ہو

شاگرد وحید کے ہیں دونوں اکبر
ہم مشق بھی ہم دونوں رہے ہیں اکبر
لیکن قسمت کا صاد ان پر ہی ہوا
پتھر پتھر ہے اور جوہر جوہر 4

ان کے علاوہ متعدد کتابیں بھی ملتی ہیں۔ اشرف التواریخ تین جلدوں میں ملتی ہے۔ پہلی جلد 667 صفحات پر، دوسری جلد 800 صفحات پر اور تیسری جلد 400 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ چراغ

> **مشائخ الہ آباد نے اردو زبان کو محض ایک لسانی وسیلہ نہیں بلکہ روحانیت، اخلاقیات اور انسانی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بنایا۔ ان کی خدمات اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔**

کعبہ، ادراک، رکن رکیں اور دل در تصوف تصانیف بھی ملتی ہیں۔ شاہ محمد حسین نے جب والد محترم سید محمد اکبر ابوالعلائی سے بیعت وخلافت حاصل کی تو محلّہ چک نیا حجرہ الہ آباد میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں خلوص ومحبت اور رواداری کو عام کیا۔ ایک باعمل عالم وفاضل صوفی اور اچھے شاعر تھے۔ کئی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔ ان کی خانقاہ میں علم وعمل کے جو چراغ روشن تھے اس کی شعائیں ڈاکٹر سید شمیم گوہر ابوالعلائی کے ذریعہ آج بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ محمد حسن اشرف کا نام بھی اردو ادب کے فروغ میں قابل ذکر ہے۔ وہ اردو شاعری کے ذریعہ عوام کے بہت قریب تھے۔ عشق حقیقی میں غوطہ زن ہوکر اشعار کہتے تھے۔ سید رفیع الزماں شاہ ان کے جد اعلیٰ تھے۔ جو سلسلہ قادریہ کی اشاعت کے لیے وقف تھے۔ ان کا نعتیہ دیوان 'کلام اشرف' کے نام سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی معدن فیض، ماحریفاں اشرف اور غزلوں کا مجموعہ موجود ہے۔ غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو

چاندنی رات میں ہر شخص کو ہوتا ہو سرور
پر مزہ گھات کی راتوں کا شب تار میں ہے 5

شیخ حسن اشرف کے بعد ان کے فرزند اور جانشین شاہ فخرالدین احمد المعروف حکیم بادشاہ نے اس علمی، ادبی اور مذہبی روایت کو آگے بڑھایا۔ یوں تو ان کی متعدد تصانیف عربی اور فارسی زبان میں ہیں لیکن اردو زبان میں تقسیم میراث، مناسک حج، ستر عورت، اثبات مولد نبینا اور میلاد شریف وغیرہ تصانیف بڑی اہم ہیں۔ جن سے اردو ادب کا فروغ ہوا۔ شاہ محمد افضل عباسی بانی دائرہ شاہ اجمل کا شمار سرخیل علما میں ہوتا تھا۔ وہ سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ کے عظیم بزرگ تھے۔ حکم مرشد پر غازی پور سے الہ آباد ہجرت کی اور یہیں تاعمر خدمت خلق میں مصروف رہے۔ جس دائرہ میں وہ سکونت پذیر ہوئے علم وعمل کا خصوصی مرکز اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنا۔ یہی وجہ کہ ادبی وتمدنی تاریخ میں اس دائرہ کا منفرد مقام ہے۔ صاحب 'تاریخ مشائخ الہ آباد' ان کے علمی، ادبی اور متصوفانہ عظمت کو نمایاں کرتے ہوئے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''حضرت شاہ محمد افضل عباسی الہ آبادی اپنے وقت کے نہ صرف بہت بڑے صوفی اور بزرگ کامل گذرے ہیں بلکہ مشاغل خدمت خلق، رشد وہدایت کے بعد ان کی زندگی کا بیشتر حصہ علم وادب کی خدمت میں بسر ہوتا تھا۔ انھیں عربی وفارسی کے بلند ادیب اور شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ محقر تخلص فرماتے تھے۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے آپ کو صاحب تصانیف کثیرہ کہا ہے۔ قاموس المشاہیر کے مصنف نظامی بدایونی نے انھیں پچاس کتابوں کا مصنف بتایا ہے۔'' 6 اس کے علاوہ صوفی امین عباسی کے بیٹے اور صوفی افضل عباسی کے بھتیجے اور خلیفہ صوفی محمد یحییٰ عباسی المعروف شاہ خوب اللہ الہ آبادی نے اپنے پند ونصائح اور علمی وادبی خدمات سے اردو ادب کو تقویت بخشی۔ وہ ایک عظیم شاعر اور کامل صوفی تھے۔ اَلْخَلْقُ عَيَالُ الله (تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) پر کامل یقین رکھتے تھے زہد وتقوی کے خوگر اور عبادت و ریاضت کے پیکر تھے۔ اعتدال پسندی،

رواداری اور اخوت و محبت کے مقلد تھے۔ یحییٰ تخلص اختیار کرتے تھے۔ ان کے دیوان کا بیشتر حصہ غزلیات پر منحصر ہے۔ جن پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ان کی نثری تصانیف بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے مکتوبات چار جلدوں میں ملتے ہیں جس میں اس دور کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات کا علم ہوتا ہے۔ یہ مکتوبات ادبی، علمی، مذہبی اور ثقافتی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے بیٹے شاہ محمد طاہر طاہر، شاہ محمد فاخر زائر اور شاہ ناصر افضلی اردو شعر و ادب کو جلا بخشی۔ شاہ طاہر نے ایک دیوان اور مکتوبات یادگار چھوڑے۔ شاہ زائر بڑے علم اور فاضل تھے۔ اردو شعر و ادب سے شغف رکھتے تھے۔ فن شاعری میں کمال حاصل تھا۔ شاہ افضل عباسی سے بیعت تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں جیسے بلند پایہ صوفی شاعران سے مستفیض ہوتے تھے۔ شاہ خوب اللہ کے فرزند اصغر شاہ محمد فاخر کو بھی شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ اچھے شاعر تھے۔ تین دیوان اور متعدد تصانیف ان کے ورثہ میں آئی۔ منتخب الاعمال، جواہر نفسیہ اور رسالہ اذکار جیسی متعدد تصانیف کے مالک تھے۔ اس کے بعد یہ علمی ورثہ ان کے بیٹے شاہ غلام قطب کو نصیب ہوا۔ بڑے عابد و زاہد اور فاضل ادب تھے۔ صوفیانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ اس لیے تصوف ان کے دل و جان میں گردش کر رہا تھا۔ صوفیانہ کلام کہنے میں مہارت تامہ حاصل تھا۔ وہ مکہ معظّمہ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مزار کے دائیں جانب مدفون ہوئے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو زبان میں بیک وقت شعر کہتے تھے۔ بطور نمونہ اردو کے دوشعر ملاحظہ ہوں۔

شب فرقت میں تری او ظالم
ہوگیا خواب خواب آنکھوں میں
کون گلشن میں کہو مشک کی بو لاتی ہے
کہتے ہیں زلف کے کوچے میں صبا لاتی ہے 7

اس کے بعد شاہ افضل عباسی کے سجادہ نشین اور شاہ ناصر کے لخت جگر صوفی محمد اجمل الہ آبادی کا نام نامی اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ جنھوں نے شعر و ادب کی روایت کو بام عروج تک پہنچایا۔ وہ عوام و خواص کے اس قدر دلدادہ تھے کہ دائرہ کا نام (دائرہ شاہ اجمل) انھیں کے نام سے منسوب ہوا۔ ان کی خانقاہ میں علما و مشائخ اور صوفیا کا اژدہام ہوتا تھا۔ ملک اور بیرون ملک کے ادبا اور شعرا کا آمد و رفت رہتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی،

فروغ زبان اردو میں الہ آباد ضلع کے قصبہ مئو آئمہ اور اس کے اطراف کے عباسی صوفیا میں قاضی رکن الدین عباسی صوفی سالار احمد عباسی اور مولانا کمال صدیقی کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ 'مئو آئمہ' جس کا پرانا نام مئو بھر، مئو کمال آباد اور مئو قاضی طیب تھا۔ چوں کہ یہاں بھر قوم آباد تھی۔

مدن لکھنوی، علامہ تفضّل حسین خاں کشمیری، علامہ احمد الیمینی، عبدالعلیٰ ارکائی شیخ علی حزیں، فاخر مسکیں، انشاء اللہ خاں انشا اور نورالعین واقف وغیرہ سے اچھے مراسم تھے۔ انھوں نے جہاں فارسی زبان میں کلام کہے وہیں اردو زبان میں بھی طبع آزمائی کی۔ 'دیوان اجملی اردو' خاص و عام میں بہت مقبول ہے۔ کلام میں معرفت اور عشق حقیقی کا رنگ غالب ہوتا تھا۔ چراغ محفل فصاحت (ص52) سے محض دوشعر ملاحظہ ہوں۔

شاد تھا دل ہر طرف سے بر میں جب جانا نہ تھا
ہائے کیسی رات تھی جس رات وہ ہم خانہ تھا
ہوگیا تھا کہتے کہتے ان دنوں کچھ ہوشیار
پھر جو دیکھا کل میں اجمل کو وہی دیوانہ تھا

ناسخ لکھنوی کو یہاں سے بڑی انسیت تھی۔ اکثر و بیشتر یہاں آتے اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے۔ برسوں یہاں رہ کر فیوض برکات بھی حاصل کرتے۔ ایک جگہ عقیدت میں غوطہ زن ہو کر کہتے ہیں۔

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں 8

شاہ غلام اعظم افضل خلف شاہ ابوالمعانی تھے اور شاہ ابوالمعانی شاہ اجمل کے فرزند تھے۔ وقت کے اکابر اصفیا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اردو کے بڑے مصنف اور اچھے شاعر تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ دور دور تک ان کا شہرہ تھا۔ چار دیوان اور ایک مثنوی یادگار چھوڑے ہیں۔ منیر نے ان کے ایک مصرعہ پر طرح لگاتے ہوئے فخر کا اظہار کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

ہے یقیں نور بصارت ہو زیادہ افضل
سرمۂ خاک مدینہ لگے گر آنکھوں میں 9

اسی طرح آتش کے شاگرد اور شاہ اجمل کے نواسے شاہ محمد کبیر بھی ایک بڑے شاعر تھے۔ قدسی تخلص اختیار کرتے تھے۔ ان کے دیوان سے ایک شعر ملاحظہ ہو۔

یاد آتی ہیں کافر جو ملاقات کی راتیں
کٹتی کسی عنوان نہیں برسات کی راتیں 10

اسی خانقاہ اجملی سے وابستہ سید زاہد اجملی المعروف شاہ جی جان بھی اپنی شاعری کے ذریعہ اردو شعر و سخن کو ترقی دی۔ ان بڑے صاحب زادے اور سجادہ نشین فاخر بیخود بھی شاعری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ 20 جولائی 1920 میں آزادی ہند کے جرم میں تختہ دار پر چڑھ کے جام شہادت نوش کیے۔ اس کے علاوہ سید منور علی شاہ قادری خادم شیخ عبدالقادر جیلانی غوث الثقلین کے گدی نشین شاہ فیضان اللہ عباسی کی کتاب 'آفتاب الہ آباد' بھی قابل ذکر ہے، جسے فروغ اردو میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ صوفی سلطان میاں گدی نشین چودھوں پیراں ہائی کورٹ آف الہ آباد بھی اس ضمن میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یقیناً ان کے ملفوظات، تصنیفات اور مجموعہ کلام سے اردو شعر و ادب کو استحکام حاصل ہوا۔

فروغ زبان اردو میں الہ آباد ضلع کے قصبہ مئو آئمہ اور اس کے اطراف کے عباسی صوفیا میں قاضی رکن الدین عباسی صوفی سالار احمد عباسی اور مولانا کمال صدیقی کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ 'مئو آئمہ' جس کا پرانا نام مئو بھر، مئو کمال آباد اور مئو قاضی طیب تھا۔ چوں کہ یہاں بھر قوم آباد تھی۔ 11 اس لیے یہ قصبہ 'مئو بھر' سے معروف تھا۔ لیکن 8ویں صدی ہجری کے آغاز میں شیخ نصیر الدین فاروقی چراغ دہلوی اپنے حقیقی ماموں شیخ تقی علم بخش اودھی (جن کا مزار ایودھیا 'چھوٹی کٹیا' نامی مندر کے قریب واقع ہے 12) کے فرزند مولانا کمال الدین صدیقی کو تصوف کے اسرار و رموز سے آراستہ کیا اور نگاہ خاص سے سلوک کے مدارج طے کرائے۔ اس کے بعد خدمت دین اور فروغ اسلام کی غرض سے 'مئو بھر' بھیجا۔ آپ کے ساتھ صوفیا کی ایک جماعت تھی جو تصوف اور گھوڑ سواری میں مہارت رکھتی تھی۔ یہاں

شاہ محب اللہ الہ آبادی کی قبر

آکر اپنے مشن میں گامزن ہوگئے، لوگ جوق درجوق آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور فیوض و برکات سے مالامال ہوتے۔ حتیٰ کہ 'مئو بھر' سے اس کا نام 'مئو کمال آباد' پڑ گیا۔ جسے بھر قوم برداشت نہ کر سکی اور جنگ کے لیے آمادہ ہوگئی۔ چوں کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنے کی تلقین کی تھی۔ انھیں صلہ رحمی کا درس دیا تھا اور جنگ سے گریز کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس لیے ان کے ساتھ شفقت سے پیش آئے۔ لیکن بھر قوم جنگ کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ چناں چہ آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دہلی واپس آ گئے۔ بعد ازاں مولانا کمال الدین صدیقی کے ہمراہ 757ھ میں سالار شہاب الدین، سالار تاج الدین، سالار قاضی رکن الدین اور سالار احمد سالار غازی کو امام بنا کر صوفیا کا ایک قافلہ بھیجا۔ 13 قافلہ یہاں پہنچ کر اولاً اپنا اثر قایم کیا اور عوام و خواص کے دلوں میں جگہ بنائی۔ ایک ساتھ کئی امام کے قیام پذیر ہونے پر اس قصبے کا نام 'مئوائمہ' پڑ گیا۔ پھر اسی کے مخفف سے اس کا نام 'مئوآئمہ' ہوگیا۔ واضح ہو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے بھانجے علامہ کمال الدین فاروقی کا مزار نصیر الدین چراغ دہلوی کے مزار کے قریب واقع ہے، جب کہ ان کے یعنی نصیر الدین چراغ دہلوی کے ماموں کے بیٹے مولانا کمال الدین صدیقی کا مزار الہ آباد کے شمال جانب مئوآئمہ اسٹیشن کے لب روڈ مرجع خلائق ہے۔ مولانا کمال الدین صدیقی (ماموں زاد شیخ نصیر الدین چشتی چراغ دہلوی) ابن تقی الدین اودھی علم بخش کا سلسلہ نسب 19 ویں پشت پر بالواسطہ امیر المومنین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے اور علامہ کمال الدین فاروقی ابن محمد عرف عبدالرحمٰن کا سلسلہ نسب 22 واسطوں پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے متصل ہوجاتا ہے۔ ان دونوں کا سلسلہ نسب راقم الحروف (ڈاکٹر طالب اکرام) کے پاس محفوظ ہے۔
مولانا کمال الدین صدیقی کا شمار اکابر اولیا میں ہوتا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ سلسلہ چشتیہ کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ اپنے وعظ و نصیحت سے عوام و خواص کے قلوب کو موم کر دیتے تھے۔ لوگ جوق درجوق ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مستفیض ہوتے تھے۔ چوں کہ آپ کی گفتگو عوامی ہوتی تھی۔ سادہ اور عام الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ جس سے اردو زبان کا فروغ ہوا۔ علاوہ ازیں سالار احمد عباسی شاہ بڑے جاں باز اور نڈر تھے اور معرفت کے راز و نیاز سے بھی آشنا تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے دست حق پر سلسلہ چشتیہ میں بیعت تھے۔ خود مرشد نے اپنے زیر سایہ ان کی تربیت کی تھی۔ سلسلہ چشتیہ کے فروغ و اشاعت میں ہمہ وقت ہمہ تن گوش رہے۔

قاضی رکن الدین غوری کا مزار قضیانہ کلاں قصبہ مئوآئمہ میں مرجع خلائق ہے۔ جہاں ان کی نسل شاد و آباد ہے۔ انھیں کی نسل سے آٹھویں پشت پر قاضی طیب عباسی کا نام ملتا ہے۔ 14 جن کا مزار اقدس مصطفےٰ باد قصبہ مئوآئمہ میں واقع ہے، جہاں سے مخلوق خدا آج بھی فیضیاب ہو رہی ہے۔ ان کا شمار اکابر صوفیا میں ہوتا تھا۔ وہ بیک وقت حافظ، قاری، عالم اور عظیم مفکر تھے۔ 1934 میں جمعیت الاحناف ہند کا جب مئوآئمہ کی سرزمین پر کل ہند کانفرنس کا انعقاد ہوا تو اس کی صدارت کی ذمہ داری انھوں نے سنبھالی۔

صوفی سالار احمد غازی عباسی کے فرزند اور جانشین صوفی حسینی میاں عباسی معروف چھیتے میاں عباسی کا اگر ذکر نہ کیا جایے تو یقیناً ناانصافی ہوگی مگر طوالت کے خدشے کی بنیاد پر اختصار کو ملحوظ خاطر رکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ان کا مزار اپنے اسی حالت میں من و عن موجود ہے۔ والد کی طرح آپ نے بھی ایک مسواک زمین میں لگائی، جس نے بعد میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی اور پھر مجمع عام میں اپنے فرزند اور جانشین کو نصیحت کی کہ والد مکرم کی طرح اس خاکی بدن کو بھی اسی درخت کے چھاؤں میں دفن کرنا۔ پھر یہ روایت عام سی بن گئی۔ ملک بھر میں جہاں بھی ان کے جانشین اور نسلیں آباد ہوئیں، حسب دستور انھوں نے نیم کے درخت کی سایہ دار فضا میں اپنی آرام گاہ بنایا۔ حتیٰ کہ جب ان کی نسلوں کا قیام لکھنؤ کے کاکوری علاقہ میں ہوا تو وہاں بھی یہی سلسلہ برقرار رہا۔ ان کا شجرہ نسب 27 واسطوں سے ہوتا ہوا براہ راست عم رسولؐ سیدنا عباس ابن عبد المطلب رضی اللہ عنہما تک متصل ہوتا ہے۔ 15 اگرچہ ان کا نام ''حسینی میاں'' تھا، مگر والد بزرگوار (سالار احمد غازی میاں) نے ان کو دیگر فرزندان سے زیادہ محبت دی، اسی وجہ سے عقیدت مند آپ کو 'چھیتے میاں' کہہ کر پکارتے تھے۔ وقت کے ساتھ یہ نام مخفف اور تحریری غلطی کے باعث ''چھیتے میاں'' بن گیا اور پھر یہی لقب عام طور پر رائج ہوگیا۔ وہ بچپن سے ہی بڑے ذہین تھے۔ کم عمری میں والد بزرگوار نے آپ کو معرفت کے اسرار و رموز سے روشن کر دیا تھا اور تصوف کے گہرے معانی سے ان کو آشنا کر دیا تھا جس نے ان کے دل کو ایک نورانی چمک بخشی۔ اکابر صوفیا اور جید علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو زبان پر مہارت حاصل تھی۔ فن شعر و ادب کو وسعت دی۔ علم و عمل کی خوشبو سے فضا کو معطر کیا۔

صوفی عبد الخالق ابن عبد الحی عباسی برصغیر کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ 1905 بمطابق 1322ھ میں الہ باد کے موضع 'چھیتے مئو' میں تولد کیے۔ مزاج صوفیانہ اور گھر کا ماحول عارفانہ تھا جس کے باعث کم عمری میں ہی سید سمیع اللہ الہ آدی سے سلسلہ چشتیہ صابریہ میں بیعت ہوگیے تھے۔ اپنے مرشد گرامی سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ سید قاسم علی شاہ کلکتوی سے سلسلہ ناصریہ صابریہ چشتیہ اور ناصریہ شطار قادریہ میں خلافت عظمہ

سے آراستہ تھے۔ ان کا روحانی مرکز ضلع پریاگ راج کے چھیتے مئو میں آج بھی واقع ہے۔ جو دریائے گنگ کے شمالی حصہ کا ایک دیہی علاقہ ہے۔ بنی نوع انسان کی بندہ پروری ان کا شعار تھا۔ عربی، فارسی، ہندی، اردو، بنگالی اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کے علم و عمل اور انسان دوستی کا اثر محض الہ آباد تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کا اثر اطراف و اکناف میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ ہر مکتب فکر اور متعدد مذاہب کے لوگ ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ کلکتہ کی سرزمین پر بھی کئی انگریز حکمران ان کے دلدادہ نظر آتے تھے وہ بغیر کسی تفریق و امتیاز ہر انسان سے یکساں سلوک کرتے تھے۔ ان کے ساتھ خنداں پیشانی سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ان کا نام عقیدت سے لیا جاتا ہے۔

ان کو 'تصانیف کثیرہ' اور 'عمدۃ الشاعر' کے لقب سے بھی ملقب کیا جاتا تھا۔ متعدد موضوعات پر انھوں نے قلم فرسائی کی۔ خالق اپنا تخلص استعمال کرتے تھے۔ ان کے خلیفہ اور جانشین ماسٹر شاہ اکرام عباسی کے ذریعہ 2015 میں راقم الحروف کو ان کے کچھ کلام دستیاب ہوئے تھے۔ یہاں اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے محض ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں، ملاحظہ ہو

یا رازق العباد یا خالق النجوم
بندوں پہ ترا فضل و کرم ہو علی العموم 16

یہاں تخلص ذو معنی میں استعمال ہوا ہے جس سے کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں وہ ایک مجذوب کامل بن گئے تھے، جن کا سارا وجود عشق الٰہی کے نور میں ڈوب گیا تھا۔ بالآخر 9 ربیع الثانی 1403ھ بمطابق 14 جنوری 1948، بروز جمعہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انھوں نے ہمیشہ انسانیت اور محبت کا درس دیا۔ جس سے عوام و خواص آپ کے قریب ہوئے۔ زبان سادہ اور عوامی ہونے کے باعث اردو کا فروغ ہوا۔ اسی طرح 21ویں صدی عیسوی کے بزرگ صوفی اکرام الحق عباسی بچپن سے ہی زہد و تقویٰ اور حسن اخلاق کا نمونہ تھے، خاکساری ان کے مزاج کا جزو لاینفک تھی۔ عارفانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ سرکاری دستاویزات کے مطابق یکم جنوری 1945 (چھیتے مئو) میں تولد کیے۔ اسی بود و باش میں پلے بڑھے۔ تصوف ان کے گھر کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ تصوف میں نظریہ شہودی کے مقلد تھے لیکن وجودی نظریہ کے مخالف بھی نہیں تھے۔ وہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ سراجیہ اشرفیہ اور قادریہ جلالیہ اشرفیہ میں صوفی سید مشتاق علی حاجی پیر گجراتی کے دست اقدس پر بیعت تھے۔ خلافت ان کو اپنے والد بزرگوار صوفی عبد الخالق عباسی ابن عبد الحی عباسی شاہ سے سلسلہ ناصریہ صابریہ چشتیہ اور ناصریہ شطار قادریہ میں حاصل تھی۔ انھوں نے ہمیشہ سچائی، انصاف، عاجزی اور خدمت خلق کی تعلیم دی۔ اس سے معاشرے میں اخلاقی بہتری آئی اور لوگوں کے درمیان امن و سکون پیدا ہوا۔ ان کی تعلیمات اور خدمات سے ہندوستان کی سالمیت اور اردو زبان کو استحکام حاصل ہوا۔ ان 17 اگست 2024 بروز پیر بوقت

> **مشائخ الہ آباد نے نہ صرف اردو زبان کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا، بلکہ تہذیب، ثقافت اور فکری بیداری کے فروغ میں بھی نمایاں اثرات چھوڑے۔**

تہجد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کا مزار احاطہ درگاہ چھیتے میاں میں مرجع خلائق ہے۔ ان کو متعدد زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔ اپنے وقت کے ایم۔ اے۔ بی ٹی سی تھے۔ عربی، فارسی اردو، ہندی اور انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔ سنسکرت زبان سے بھی اچھی واقفیت تھی۔ سائنس، حساب اور پی ٹی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جونیر ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ علمی صلاحیت، خاکساری اور ایمان داری کے باعث اعلی افسران قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ضلعی سطح پر ہر مذہب و مسلک کے اساتذہ احترام کرتے تھے۔ اردو کی بنیادی تعلیم پر بہت زور دیتے تھے۔ مکتب انوار العلوم مئو آئمہ، مکتب چشم صمد مئو آئمہ، مدرسہ اسلامیہ مئو آئمہ، مکتب نور الاسلام چھیتے مئو اور مدرسہ مکتب اسلامیہ مہرونڈہ کا حقیقی وجود ان ہی کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ اور تمام مکاتب و مدارس میں ان کا تیار کردہ نصاب ہوتا تھا جس میں اردو شعر و ادب پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔

مختصر یہ کہ مشائخ الہ آباد نے نہ صرف اردو زبان کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا، بلکہ تہذیب، ثقافت اور فکری بیداری کے فروغ میں بھی نمایاں اثرات چھوڑے۔ ان کی تعلیمات میں صوفیانہ اخلاقیات، روحانی جذبے اور انسانی ہم آہنگی کا جو پیغام تھا، وہ اردو کے نازک اور نفیس لہجے کو فروغ دینے کا سبب بنا۔ ان کی مجالس اور وعظ کی محفلوں نے ایک ایسی زبان کو جنم دیا جو دلوں کو چھوتی تھی اور بعد میں اردو شاعری اور نثر میں ایک مضبوط بنیاد بنی۔ مشائخ الہ آباد (پریاگ راج) کی کاوشوں نے اردو کے فروغ کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس کی جڑیں مزید گہری کر دیں۔ آج بھی یہ تحریک زندہ ہے اور اردو کو عالمی زبان بنانے میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔

حواشی

1. رجسٹر شجرۃ الشیوخ و السادات مئو آئمہ، ظہیر الدین ثاقب عباسی، قصبانہ کلاں مئو آئمہ الہ آباد، 1939، ص13
2. تاریخ مشائخ الہ آباد، محمد نظام الدین، سرسوتی آفسیٹ پریس الہ آباد، 1999، ص65-69
3. ایضاً، ص94
4. ایضاً، ص94
5. ایضاً، ص110
6. ایضاً، ص133
7. ایضاً، ص136
8. ایضاً، ص138
9. ایضاً، ص139
10. ایضاً، ص139
11. خطبہ مجلس استقبالیہ جمیعت الاحناف ہند، شیخ طفیل احمد، اسرار کریمی پریس الہ آباد، 1943، ص4-5
12. لطایف اشرفی، ح، نظام یمنی، مخدوم اشرف اکیڈمی امبیڈکر نگر، 1962، ص569
13. رجسٹر شجرۃ الشیوخ و السادات مئو آئمہ، ظہیر الدین ثاقب عباسی، قصبانہ کلاں مئو آئمہ الہ آباد، 1939، ص5
14. ایضاً، ص13
15. خطبہ مجلس استقبالیہ جمیعت الاحناف ہند، شیخ طفیل احمد، اسرار کریمی پریس الہ آباد، 1943، ص4
16. بال جبریل، علامہ محمد اقبال، ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس دہلی، 2005، ص57
17. رجسٹر شعاع عباسیہ، اکرام الحق عباسی، گلشن فیض چھیتے مئو، مئو آئمہ، الہ آباد، 2005، ص21

■

Dr. Talib Ikram
S/O Master Ikramul Haque
Chhitay Mau, Mau Aima, Prayagraj-212507, UP
Mob. 7800812595
Email: talibikram3@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل و مجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان و ادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

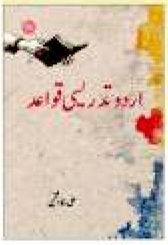

اردو تدریسی قواعد

مصنف: علی رفاد فتیحی

صفحات: 484، قیمت: 305، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محضر رضا، ریسرچ اسٹنٹ، غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب، ماتا سندری لین، دہلی۔ 110002

علی رفاد فتیحی اردو لسانیات کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ لسانیات اور اس کے ذیلی مباحث پر انھوں نے گہرائی سے سوچا اور لکھا ہے۔ نوم چامسکی پر فتیحی صاحب کی کتاب نے اردو معاشرے کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جسے لوگوں نے خوب سراہا۔

زیر تبصرہ کتاب 'اردو تدریسی قواعد' اگرچہ حال ہی میں شائع ہوئی، لیکن اس کا رشتہ فتیحی صاحب کی اولین کتابوں سے بھی ہے۔ مذکورہ کتاب تدریسی ضرورتوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اردو قواعد پر اگرچہ ضرورت کے مطابق کتابیں دستیاب ہیں؛ تاہم اردو تدریس کے مسائل اب اتنے سادہ اور مختصر نہیں کہ ان کے تدارک کے لیے دستیاب متون کو کافی گردانا جائے، بلکہ لسانیات کی ترقی پذیر دنیا روز بروز نئے زاویے کھول رہی ہے۔ روایتی تدریس کا لسانیات سے اس طرح سے براہ راست سابقہ نہیں تھا، جس طرح سے دور حاضر میں ہے۔ قواعد نگاری کے وقت جس شخص کے ذہن میں جدید لسانیات کے مباحث اور تقاضے ہوں اس کا عمل روایتی طرز پر نہیں ہو سکتا۔ چونکہ علی رفاد فتیحی لسانیات کے مباحث اور دوسری زبانوں میں تدریسی قواعد کے مسائل سے واقف ہیں، لہٰذا اردو کے قواعدی مسائل کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اردو کے حروف تہجی کے بارے میں یہ بحث پہلے سے ہے کہ اس میں ہکاری آوازوں مثلاً کھ، گھ، بھ کو بھی شامل کیا جائے یا نہیں۔ مصنف اس طرح کے حروف کو حروف تہجی میں شامل مانتے ہیں اور تدریس کے دوران ان کو حروف تہجی کے ساتھ شامل کرنے کے موید بھی ہیں، تاہم اس طرح کے حروف کی ترتیب کیا ہوگی یہ سوال تشنۂ جواب ہی رہتا ہے۔ منطق کی رو سے اس کے حق میں خواہ جو بھی دلائل ہوں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارا روایتی طریقۂ تدریس زیادہ سادہ اور آسان ہے۔ اردو میں اب تک ہائے مختفی کے استعمال میں خاصی بے احتیاطی برتی گئی ہے، اس سلسلے میں مصنف کا عندیہ وہی ہے جو عبدالستار صدیقی اور رشید حسن خاں کا تھا؛ البتہ جن لفظوں میں خلاف قاعدہ ہائے مختفی کو رواج ہو گیا ہے مثلاً نقشہ، قورمہ وغیرہ کو ہائے مختفی سے لکھنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی ان کی ترجیح منطقی استدلال سے زیادہ رواج عام کی پیروی ہے۔ اس کتاب کی ہر اکائی کے بعد چند سوالات بھی دیے گئے ہیں جن سے تدریسی عمل میں مدد ملتی ہے۔ آزادانہ مطالعے کے بعد بھی قاری بخوبی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ مذکورہ مسائل کس حد تک ذہن میں صاف ہو سکے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر اردو زبان و قواعد اور املا کے مسائل پر بھی ہے۔ وہ تلفظ کے ساتھ ساتھ لغت کے مسائل اور اس میں ترتیب اندراج جیسے معاملات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک خود مختار زبان کو ان مسائل کا سامنا ہوتا ہے اور یہ بات بھی نشان خاطر رہنی چاہیے کہ قواعد ایسے کلیات قائم کرنے سے قاصر ہے جس کے تحت پوری زبان آ جائے۔ کسی دوسری زبان کے قواعد یا اس کے حروف کی تعداد و ترتیب سے بھی یہ استنباط نہیں کرنا چاہیے کہ دوسری زبان اسی کی پیرو ہو جائے۔ حروف کے معاملے میں اردو زبان کسی کے ماتحت نہیں ہے۔

ہکاری آوازوں کا معاملہ اردو میں ہندی سے مختلف ہے ان کو اردو والے مخلوط آواز مانتے ہیں اور اس سے زبان کے معاملات میں کوئی قابل گرفت نقص بھی نہیں پیدا ہوتا بلکہ تدریس کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں قواعد کو روایتی انداز سے پیش نہیں کیا گیا۔ اب تک لسانیات کے مبادیات لسانیاتی مطالعے میں ہی زیر بحث آتے رہے ہیں، لیکن مصنف نے

ایک اعتدال قائم کر کے لسانیاتی مباحث کو اردو قواعد کے زیر بحث لانے کی بہتر کوشش کی ہے۔ فونیمیات کا تعلق لسانیات سے ہے، لیکن حروف علت اور حروف صحیح کا بیان عام طور پر قواعد نگاری کے تحت ہوتا ہے، لہٰذا ایک معنی میں یہ بحث دونوں دائروں میں رہ کر کی جاسکتی ہے۔ مصنف نے ایک توازن کے ساتھ دونوں تقاضوں کو بخوبی پورا کیا ہے، ساتھ ہی اس بحث میں الفاظ کے صحیح مخارج بھی مختصراً زیر بحث آگئے ہیں۔ صرف ونحو کی بحث کو نئے تقاضوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی ہے ،جس میں زبان کو برتنے کے اصول پر زبان کو سمجھنے کا رجحان زیادہ غالب ہے۔ مبتدی یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے واحد جمع بنانے میں اردو والے کن اصولوں کو اپناتے ہیں اور ان اصولوں کے تجزیے سے ماہرین لسانیات کن اہم نتائج تک پہنچتے ہیں۔

علی رفاد فتیحی ایک سنجیدہ لکھنے والے ہیں، انھوں نے لسانیات کے حوالے سے جو کچھ کیا ہے، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ایک اچھی کتاب صرف علم میں اضافہ نہیں کرتی بلکہ بحث کے نئے راستے بھی پیدا کرتی ہے۔ یہ کتاب اختلاف کے بھی کچھ راستے کھولتی ہے جو یقیناً کتاب کی افادیت کا پہلو ہے۔ اس نوع کی یہ منفرد کتاب ہے اور اس سے بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ اس کے ذریعے ہموار ہونے والی فضا آئندہ زیادہ شفاف ہوگی۔ امید ہے کہ قارئین اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

خواتین و اطفال سے متعلق قوانین (ایک درسی کتاب-جلد دوم)

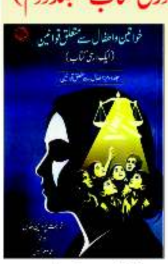

مصنفہ: نزہت پروین خان، مترجم: محمد صغیر حسین

صفحات: 318، قیمت: 210روپے

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عشرت ظہیر، مکان نمبر 546، تھرڈ فلور

گلی نمبر A-6، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

پیش نگاہ کتاب 'خواتین واطفال سے متعلق قوانین (ایک درسی کتاب) جلد دوم، اطفال سے متعلق قوانین کو محیط ہے۔ مصنفہ پروفیسر نزہت پروین خان، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ قانون سے منسلک ہیں، یہ اہم خیال انگیز اور عصری حساس موضوعات سے متعلق متعدد کتابوں کی خالق ہیں۔ ان کی تخلیق کردہ کتابیں، افراد کائنات اور ان کے گونا گوں مسائل کا نہ صرف احاطہ کرتی ہیں بلکہ ان سے متعلق وضع کردہ ملکی اور بین الاقوامی قوانین کا توضیحی اظہار بھی ہیں اور ان مسائل کے سدباب کی راہیں بھی روشن کرتی ہیں۔

'خواتین و اطفال سے متعلق قوانین' جلد دوم، جو اطفال سے متعلق حساس صورت حال اور قوانین کا احاطہ کرتی ہے، کا انگریزی زبان سے اردو ترجمہ محمد صغیر حسین نے بطریق احسن انجام دیا ہے۔ وکالت، تصنیف و تالیف اور ترجمہ نگاری سے انھیں شغف ہے، اس عمل میں ان کی ترجمہ کردہ کتابیں بطور خاص زندگی اور زندگی کے اہم وحساس موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔

کتاب ہٰذا کے پیش لفظ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کتابوں کی اشاعت اور قرأت سے متعلق بے حد اہم اور مفید گفتگو کی ہے۔

عرض مصنف کے زیر عنوان مصنفہ کتاب ہٰذا نے اس کتاب کے محور فکر و تخلیق اور اس کی موضوعی افادیت اور ضرورت کے تعلق سے کتاب کی خصوصیت کا اظہار جامع اور واضح انداز میں رقم کیا ہے:

''..... نہ صرف یہ کہ یہ کتاب حقوق اطفال سے متعلق جدید نظریات، قوانین، پالیسیوں اور رواج کا ازسر نو تنقیدی جائزہ لیتی ہے، بلکہ خواتین واطفال کے موافق عالمگیریت کے امکانات کا احاطہ بھی کرتی ہے۔''

کتاب 'خواتین و اطفال سے متعلق قوانین، جلد دوم' میں اطفال سے متعلق مسائل اور قوانین، کل چار ابواب میں منقسم ہیں جن کے تحت مصنفہ نے اطفال کو پیش آنے والی صورت حال کی حساسیت اور ان کے سدباب کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح کے اقدامات اور وضع کردہ قوانین کی تفصیل رقم کی ہے، جن سے نہ صرف اہم اور خیال انگیز حالات روشن ہوتے ہیں بلکہ حیاتِ اطفال سے جڑی نازک ترین اور تشویش ناک پہلوؤں کے سدباب کے لیے ذہن سازی کا کام بھی انجام پاتا ہے۔

باب اول میں 'بچہ اور بچوں کے حقوق کی تعریف' کے زیر عنوان نہایت باریک بیں طور پر، مختلف ذیلی عنوانات کے تحت اطفال کی تعریف اور 'بچہ پن' کی حدوں کا تعین کیا گیا ہے۔ اس باب میں اطفال کے ساتھ روا بدسلوکی، زیادتی اور ان کے استحصال کی مختلف شکلوں کی وضاحتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس زمرے میں بچوں کے حقوق، اور ان کی پامالی، والدین اور دیگر افراد کے ذریعے بچوں کی جسمانی، جذباتی، زیادتیاں بھی اجاگر ہوئی ہیں۔

اس کے بعد نہایت عرق ریزی کے ساتھ بچوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے مختلف پہلوؤں مثلاً جسمانی، جنسی، جذباتی اذیت کوشی کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں گھروں میں کام کرنے والے بچوں کے ساتھ جذباتی بدسلوکی، جسمانی اذیت رسانی، جنسی دست درازی جیسے انتہائی خوفناک معاملات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور انھیں جسم فروشی، گداگری اور دیگر سرگرمیوں میں شامل کیے جانے، بچپن کی شادی اور انھیں مختلف ذریعوں سے خوف زدہ کرنے کے عمل کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

باب دوم میں 'تحفظ حقوق اطفال کے لیے قانون سازی' موضوع بحث ہے۔ اس زمرے میں مختلف ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور ان کے توسط سے اطفال کے حقوق کو بھی نمایاں کیا گیا ہے اور ان حقوق کو بروئے کار لانے کے تعلق سے قانون سازی کی تفصیلات بھی رقم کی گئی ہے۔ اس باب میں متعدد خیال انگیز نکات کا توضیحی اظہار ہے، جن سے بچوں کو ان کے حقوق کی ان دیکھی یا پامالی سے انھیں محفوظ بھی رکھا جاسکے اور ان کے نشوونما کی راہیں مثبت اور آسان بھی ہوں۔

چونکہ بچوں کو اپنی آئندہ زندگی میں ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی میں اپنی حصہ داری نبھانی ہے، لہٰذا انھیں تعلیم سے آراستہ کرنا لازمی امر ہے، اس اعتبار سے اس باب میں نہایت تفصیل کے ساتھ 'حق تعلیم اور قانون' کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے حق تعلیم ایکٹ 2009 کے 'چھ سے چودہ سال کی عمر کے ہر بچے کو بلا معاوضہ تعلیم کی فراہمی' کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اور یہ بھی کہ ''ایکٹ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ کسی بچے کو ثبوت عمر کی کمی کے سبب اسکول میں داخلہ لینے سے منع نہیں کیا جائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی بچے کی ہمہ جہت ترقی، بچے کی علم و آگہی، استعداد اور ذہانت کے فروغ، جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما، جہاں تک

قابل عمل ہو بچے کی مادری زبان میں تعلیم اور بچے کو فہم اور اس کے اطلاق کی صلاحیت کی جامع اور متواتر جانچ کرنے کے التزام جیسے اہم پہلوؤں کو بھی نشان زد کیا گیا ہے۔

ذیلی عوانات کے تحت اہم نکتوں کی وضاحت، اس باب کی خصوصیت ہے۔ مثلاً ''کون بچہ یا کمسن ہے؟ بچے یا کمسن کی عمر کا تعین'' اور پھر اس کے ساتھ ہی بچوں سے سرزد ہونے والے جرائم کی بھی تفصیل درج کی گئی ہے، یعنی معمولی جرائم اور شدید جرائم اور ان کے تعلق سے سزاؤں کی وضاحتیں۔ اس سے متصل بچوں کے خلاف جرائم اور متبادل سزاؤں کے لیے توضیعات بھی رقم ہیں۔

اس باب میں بچہ شادی ممانعت ایکٹ 1929 اور بچہ شادی ایکٹ 2006 اور جنسی معاملات سے متعلق مختلف النوع ارتکابات کی تفصیل کے ذریعے وضع کردہ نظام قانون نافذ کیے جانے کی نہ صرف اہمیت نمایاں کی گئی ہے بلکہ اس سلسلے میں سماج کی ذہنیت کی تبدیلی کی اشد ضرورت کی جانب اشارے بھی موجود ہیں۔

باب سوم میں 'تحفظ اطفال کے تئیں بین الاقوامی فکرمندی' کی تفصیلات ضبط تحریر میں لائی گئی ہے۔ ملکی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر بھی بچوں سے متعلق تمام تر مسائل کو، دراصل بنی نوع انسان کے مسائل سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لیے بین الاقوامی سطح پر بھی بچوں کی تعمیر وتشکیل کے لحاظ سے ان کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کی جانب بہتیرے اقدام کیے گئے ہیں۔

اس باب میں ''حقوق اطفال پر اقوام متحدہ کنونشن 1989(CRC) کی تصدیق وتوثیق، ہندوستان نے 1992 میں کردی تھی، چونکہ ہندوستان سی آر سی کا دستخط کنندہ ہے، اس لیے بچوں کے حقوق سے متعلق متعدد فیصلوں میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے اس سے استفادہ کیا ہے۔''

اس باب میں تحفظ حقوق اطفال کے بین الاقوامی دستاویزات (1989) سے قبل حقوق اطفال اقوام متحدہ کا اعلامیہ 1924 اور 1959 کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جس کے تحت بچوں کی تعلیم کے حق، کھیلنے کودنے کے حق اور تفریح کے حق کا احاطہ کیا گیا ہے، مثلاً:

> ''بچے کو اپنی جسمانی اور ذہنی ناپختگی کی بنا پر مخصوص حفاظتی، تدابیر اور نگہداشت کے ساتھ ساتھ اپنی پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے بعد بھی مناسب قانونی تحفظ کی ضرورت ہے۔''

اس اعلامیہ کے اصول کی تفصیلات کے ذریعے مختلف صورت حال میں عمل کی راہیں ہموار کی گئی ہیں۔ مثلاً اصول 6 میں کہا گیا ہے:

> ''...نازک عمر کے کسی بچے کو، غیر معمولی حالات کے علاوہ کسی بھی صورت میں اس کی ماں سے علاحدہ نہیں کیا جائے گا۔''

اور اصول 9 کے مطابق ''بچے کو ہر قسم کی غفلت، بے رحمی اور استحصال سے بچانا ہوگا، اسے انسانوں کی تجارت کی کسی بھی شکل میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھنا ہوگا، بچے کو ایک مقررہ عمر سے پہلے روزگار میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔''

کم از کم عمر کنونشن (Minimum Age Convention MAC, 1973) کے ذریعے بچہ مزدوری کے خاتمہ کو یقینی بنایا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ:

> ''.....یہ کم از کم عمر اسکولی تعلیم کے مکمل کرنے کی عمر سے کم نہیں ہوگی اور ہر حال میں 15 سال سے کم نہ ہوگی۔''

اس باب میں جز1 کے تحت کل 45 آرٹیکل کی تفصیلات درج ہیں اور آخر میں خلاصے کے تحت پورے باب کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا باب چہارم 'تحفظ حقوق اطفال کے تئیں عدالتی اقدامات' کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں کل دس ذیلی عنوانات کے تحت تحفظ حقوق اطفال سے متعلق عدالتی اقدامات کو بیان کیا گیا ہے۔

اس باب کا پہلا ذیلی عنوان 'تعارف' کا ابتدائی حصہ بطور تمہید موضوع کی حساسیت اور اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

اس باب کا ایک اہم اور فکر انگیز پہلو 'انسان کی غیر قانونی تجارت اور جنسی زیادتی کے معاملات میں عدالتی ردعمل' ہے۔ اس عنوان کے تحت مختلف وقوعے سے تعلق رکھنے والے مقدموں کے حوالے اور ان کے فیصلے درج کیے گئے ہیں جن سے معاملات کی نزاکت، عدالتوں کی کارروائیوں اور مجرموں کی سزاؤں کے فیصلوں سے آئندہ کے لیے متعلقہ وحشی پن کے سدباب کی راہیں ہموار ہوں۔

اس باب میں بچہ مزدوری کے تعلق سے عدالتی ردعمل بھی رقم ہے اور بچہ مزدوری (ممانعت اور ضابطہ بندی) ایکٹ 1986 میں ترمیمات اور والدین اور سرپرستوں کی سزاؤں سے متعلق توضیعات کو قدرے نرم کرنے کا بھی ذکر مرقوم ہے۔

کم سنوں کے ساتھ عدل وانصاف ایکٹ اور عدلیہ کی تشریحات، ملکیت، نان نفقہ اور تحویل سے متعلق عدالتی تشریحات، تبنیت سے متعلق عدالتی تشریحات، ایسے عنوانات ہیں جن کی وضاحتیں، تحفظ حقوق اطفال کو بھی واضح کرتے ہیں اور ان سے متعلق عدالتی اقدامات، بچوں کے ذہنی، جسمانی، روحانی، فکری اور جذباتی احساسات کی توقیر بھی بحال کرتی ہیں اور ان میں خوداعتمادی، عزت نفس اور متوازن تصور حیات نمو پذیر ہونے کے امکانات بھی روشن ہوتے ہیں۔

اس کتاب کی موضوعی حساسیت نہ صرف بچوں سے متعلق مختلف النوع مسائل، افراد، سماج اور افراد خاندان کے بے رحمانہ اور انسانیت سوز رویہ کو ظاہر کر کے ان کے سدباب کی راہیں وا کرتی ہیں، بلکہ اس کتاب کی قرأت عوام کی ذہن سازی بھی کرتی ہے اور اطفال کے گوناگوں مسائل سے متعلق بطور شہری ذمہ داریوں کے احساس کو بھی بیدار کرتی ہے۔

کلیات ادویہ

صفحات: 226، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: وسیم اقبال، E-29، شاہین باغ لین نمبر 6، نئی دہلی

یونانی نظام علاج دنیا کے قدیم ترین طبی نظاموں میں ہے۔ یہ نظام مسلمانوں کے ذریعے ہندوستان میں متعارف ہوا۔ عہد مغلیہ میں اس نظام کو خوب فروغ حاصل ہوا اور آج بھی یہ نظام فعال ہے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے بھی اس سلسلے میں بی یو ایم ایس وغیرہ کی نصابی کتابیں تیار کرکے بہت اہم خدمات انجام دی ہیں۔

طب یونانی کا یہ امتیازی وصف ہے کہ اس کے قوانین وکلیات دوسرے طبوں

کے مقابلے میں کافی منظّم اور مربوط انداز میں طبی مصادر میں مذکور ہیں۔ ہر عہد کے اطبا نے اس موضوع کو کافی اہمیت دی ہے۔ ان اصول وضوابط کا دائرہ کم وبیش طب کے تمام مضامین کو محیط ہے۔ علم الادویہ کے اصول وقواعد کو اطبا نے 'کلیات ادویہ' کے عنوان سے قلمبند کیا ہے اور مفردات ومرکبات کی کتابوں کی ابتدا میں ان اصولوں کو مقدمہ یا دیباچہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ 'کلیات ادویہ' کے ضمن میں ادویاتی مطالعے میں مستعمل بہت سی اصطلاحات اور رہنما اصولوں کو بیان کیا جاتا ہے نیز موالید ثلاثہ کی شناخت ان کی دوائی حیثیت، طریقہ وترکیب استعمال، مرضی جسم پر دوا کی تاثیر، نوعیت عمل اور امزجہ ادویہ جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے۔

پیش نظر کتاب 'کلیات ادویہ' میں علم الادویہ سے متعلق معلومات فراہم کرائی گئی ہے۔ اس کتاب میں عام جسمانی مزاج کے علاوہ مزاج ادویہ سے بحث کی گئی ہے تاکہ دوا کے مضر اثرات سے مریض کو محفوظ رکھا جاسکے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے علم ہوتا ہے کہ عالمی ادارۂ صحت نے دوا ساز اداروں کو ہدایت دے رکھی ہے کہ غذائی یا دوائی اشیا سے تیار شدہ مرکبات بازار میں آنے سے قبل معیار بندی کی ہدایات کے مطابق جانچ کی جائے۔ علاوہ ازیں دواؤں کے استعمال کی شکلیں اور طریقے کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔

بائیس ابواب میں منقسم اس کتاب میں باب اول 'کلیات ادویہ کا تفصیلی تعارف' میں سترہ ذیلی عنوان کے تحت اہم اور مفید جانکاری پیش کی گئی ہے۔ باب دوم 'ماخذ ادویہ' میں موالد ثلاثہ، نباتات، مرتب دوائیں، غیر مرتب دوائیں، حیوانات، معدنیات وغیرہ سے متعلق تفصیل درج ہے۔ باب سوم 'دوا، غذا اور ذوالخاصہ' اپنے موضوع سے متعلق مفید اور اہم جانکاری پر مبنی ہے۔ باب چہارم 'دواؤں کے اجزائے ترکیبی' میں نباتی دواؤں کے اجزائے ترکیبیہ، حیوانی دواؤں کے اجزائے ترکیبیہ اور معدنی ادویہ کے ترکیبی اجزا، تینوں ماخذ کے اجزائے ترکیبی کے متعلق الگ الگ جانکاری دی گئی ہے۔ باب پنجم 'مزاج ادویہ' میں عام جسمانی مزاج کے علاوہ مزاج ادویہ سے بحث کی گئی ہے۔

باب ششم 'ادویہ کی طبعی خصوصیات' میں دواؤں کی وہ ذاتی خصوصیات جن کی مدد سے دواؤں کی شناخت ہوتی ہے اور ان کے ذریعے دواؤں میں پیدا ہونے والی تبدیلی اور تغیر کا حال معلوم کیا جاتا ہے، کا تفصیلی بیان ہے۔ باب ہفتم 'اعمار ادویہ' میں نباتی دواؤں کی مدت حیات، حیوانی دواؤں کی مدت حیات اور معدنی دواؤں کی مدت حیات سے متعلق اہم جانکاری دی گئی ہے۔ باب ہشتم 'نامعلوم ادویہ کی تحقیق کے ذرائع: قیاس وتجربہ' ہے۔ باب نہم 'اشکال ادویہ' میں معالجانہ ضرورت اور افادیت کے پیش نظر دواؤں کی شکلوں پر مفصل بحث کرتے ہوئے مستعملہ صورتوں کی بلحاظ تدبیر وضاحت کی گئی ہے۔ باب دہم 'مضر ومصلح' میں دواؤں کی افادیت اور مضرت دونوں پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے مصلح اور دیکھ بھال کو موضوع بحث بنایا ہے۔ باب یازدہم 'مسالک ادویہ' میں داخلی دوائیں، خارجی دوائیں اور براہ غیر طبعی منفذ دواؤں سے متعلق مفید اور اہم جانکاری پیش کی گئی ہے۔ باب دوازدہم 'تاثیرات ادویہ' میں تاثیرات ادویہ کی اقسام مع مثال بیان کی گئی ہے۔ باب سیزدہم 'ادویہ کا بدل' میں تعین بدل کے اصول اور بدل دوا کو اصل دوا سے حقیقی مناسبت وغیرہ سے متعلق اہم جانکاری پیش کی گئی ہے۔ باب چہاردہم 'تناقض ادویہ یا تناقضات' میں تناقض ادویہ کی اقسام اور تناقض فعلی وتناقض کیفی وغیرہ پر مفید جانکاری دی گئی ہے۔ باب پانزدہم 'ادویہ کی کاشت' میں ادویہ کی کاشت کی ضرورت واہمیت اور ادویہ کی کاشت سے متعلق اصول وشرائط وغیرہ سے متعلق جانکاری پیش کی گئی ہے۔ باب شانزدہم دواؤں کا حصول اور ذخیرہ اندوزی' میں دواؤں کا حصول اور ذخیرہ اندوزی سے متعلق اہم جانکاری دی گئی ہے۔

باب ہفدہم 'ادویہ مفردہ کا تحفظ' میں تحفظ ادویہ کی اہمیت، تحفظ ادویہ کے اصول اور دواؤں کا حصول اور ان کو خشک کرنے میں کن کن باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے، وغیرہ سے متعلق اہم جانکاری دی گئی ہے۔ باب ہجدہم 'مخصوص ادویہ کی نوعیت بلحاظ اجزائے موثرہ (اجزائے ترکیبی)، میں دواؤں کے اجزائے ترکیبی اور ان میں موجود جوہر فعل اور ان کی نوعیت عمل وغیرہ سے متعلق جانکاری دی گئی ہے۔ باب نوزدہم 'طبی اصطلاحات باعتبار (افعال کلیہ) نوعیت عمل' میں دواؤں کے افعال اور نوعیت عمل کے ساتھ دوا کے مزاج وغیرہ سے متعلق جانکاری دی گئی ہے۔ باب بیستم 'نگہداشت ادویہ' میں ادویہ کی نگہداشت سے متعلق مکمل جانکاری دی گئی ہے۔ باب بیست ویکم 'طب یونانی میں مقدار خوراک کا تعین' کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ دوا کی تاثیر میں کمی وبیشی مقدار خوراک کی کمی وبیشی پر منحصر ہوتی ہے۔ باب بیست ودوم 'ادویہ کی آمیزش' میں دواؤں کی آمیزش کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے جن سے ادویات کی ملاوٹ کی جاتی ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی مراحل سے تکمیل تک جن ماہرین علم طب نے اپنی خدمات پیش کیں ان میں ڈاکٹر محمد خالد صدیقی، ڈاکٹر احتشام الحق قریشی، ڈاکٹر عبدالرؤف، پروفیسر محمد آفتاب احمد، ڈاکٹر عبداللطیف، جناب فیصل اقبال، جناب عبدالودود اور حکیم شیمم ارشاد اعظمی کے نام نمایاں ہیں۔ قوی امید ہے کہ یہ کتاب علم طب کے شعبہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی نیز تصنیف وتالیف سے دلچسپی رکھنے والے اطبا وطلبا کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

ترتیب

افکارو اطوار (ڈاکٹر عطاعابدی کے متنوع مضامین کا انتخاب)

مرتب و ناشر: ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ

صفحات: 288، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2025

مبصر: ثناء اللہ ثنا دوگھروی

معرفت: بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ-4

ڈاکٹر عطا عابدی کی ادبی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ ان کی شاعری ہو یا نثری خدمات، دونوں میدان میں انھیں دسترس حاصل ہے۔موصوف کی ادبی خدمات کا عرصہ کم و بیش چار دہائیوں سے زیادہ پر محیط ہے۔تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

پیش نظر کتاب 'افکارواطوار' کے مرتب ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ ہیں۔ ان کی 'فکر تونسوی: حیات و خدمات' (2017)، 'محبّ اردو حمید انور اور بک امپوریم مطالعات و مشاہدات (2022) جیسی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ کتاب 'افکارو اطوار' جو ڈاکٹر عطا عابدی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

کتاب کی ابتدا مرتب کتاب ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ کے طویل مضمون بعنوان 'پیش لفظ' سے ہوتی ہے۔اس کتاب کو مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔'پیش لفظ' کے بعد عنوان 'لسانیات' کے تحت ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے 'اردو زبان کا دوسری زبانوں سے رشتہ'۔اس مضمون میں مضمون نگار نے ارتقائی مراحل سے شروع کر کے حال تک کے دیگر زبانوں سے اردو زبان کے رشتے کے تعلق سے بڑی معلوماتی گفتگو کی ہے جس میں دیگر زبانوں خاص کر قدیم ہند آریائی زبانیں، وسطی ہند آریائی زبانیں اور جدید ہند آریائی زبانیں اور اردو کا رشتہ کے تعلق سے معلومات ہے، اسی طرح فارسی، عربی، انگریزی، ہندی اور میتھلی زبانوں کے اردو پر کیا اثرات اور کس سطح تک اثرات مرتب ہوئے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے، اس حوالے سے تحقیقی گفتگو کی گئی ہے۔

'تحقیق و تنقید' کے تحت تین مضامین شامل ہیں جو اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ 'شعر اساس تنقید' کے تحت تین تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون 'بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں مردم شناسی کے معیارات' ہیں۔ یہ طویل مضمون ہے اور اس میں مضمون نگار نے بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا کا جائزہ لیا ہے۔اگلا مضمون 'رضا نقوی واہی کی منظوم مکتوب نگاری' ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر عطا عابدی نے رضا نقوی واہی کے مختلف اشعار پیش کر کے ان کی منظوم مکتوب نگاری کے اسرار و رموز نیز ان میں پوشیدہ عناصر کو عالمانہ، دانشورانہ اور فنکارانہ طور پر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے جس سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہونے کے ساتھ رضا نقوی واہی کی منظوم مکتوب نگاری کا اپنا منفرد رنگ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مضمون 'جگن ناتھ آزاد۔ فکر و فن کے چند اہم پہلو' بھی اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ یہ مضمون گرچہ مختصر ہے لیکن اس کے باوجود جامعیت اس کا خاصہ ہے۔

'افسانہ اساس تنقید' کے زمرے میں پانچ مضامین شامل ہیں اور پانچوں کا تعلق افسانوں کے مطالعے سے ہے۔ پہلا مضمون ہے 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی کے افسانے' اس کے بعد 'احمد یوسف کی افسانہ نگاری' پھر 'عبید قمر کے افسانے' اسی طرح 'نقطۂ نوگریز' کے افسانچے۔ایک تاثر' اور 'حسن رہبر کا نظریۂ حیات وفن اور افسانہ 'گھر کی آگ'۔ یہ تمام کے تمام مضامین قاری کو یہ باور کرانے کے لیے کافی ہیں کہ ڈاکٹر عطا عابدی کی صلاحیت صرف شعر اساس تنقید یعنی شاعری کی تنقید تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے علاوہ وہ نثری تنقید اور خاص کر افسانوں کی تنقید میں بھی اسی طرح مہارت رکھتے ہیں جس طرح شاعری کی تنقید میں رکھتے ہیں۔ وہ افسانوں کے اجزائے ترکیبی اور اس کے فن سے گہری واقفیت رکھتے ہیں جس کا ثبوت ان کی افسانہ اساس تنقید میں جا بجا نظر آتا ہے۔'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' کے افسانے' مضمون میں دراصل غیاث احمد گدی کے دوسرے افسانوی مجموعے 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' کے افسانوں کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔'احمد یوسف کی افسانہ نگاری' ('رزم ہو یا بزم ہو' کی روشنی میں' ہے۔اس مضمون میں عطا عابدی نے احمد یوسف کے افسانوی مجموعے 'رزم ہو یا بزم ہو' میں شامل افسانوں کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔'عبید قمر کے افسانے' ('ننگی آوازوں کی گونج کے حوالے سے) میں ان کے افسانوی مجموعہ 'ننگی آوازوں کی گونج' کے تعلق سے عبید قمر کے افسانوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کے افسانوں کے اختصاصی پہلوؤں کو سامنے رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مضمون 'نقطۂ نوگریز' گرچہ تبصراتی اور مختصر مضمون ہے لیکن اپنے اختصاصی طور پر بہت ہی جامع ہے۔ مضمون 'حسن رہبر کا نظریۂ حیات و فن اور افسانہ 'گھر کی آگ' ہے تنقیدی مضمون ہے جس میں عطا عابدی نے حسن رہبر کے نظریۂ حیات کے حوالے سے تو گفتگو کی ہی ہے ان کے ایک افسانہ 'گھر کی آگ' کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ پیش کر کے اس کا نچوڑ پیش کیا ہے۔'ادبی صحافت' کے عنوان سے بھی کتاب میں نیا باب بنایا گیا ہے جس میں صرف ایک مضمون ہے مگر طویل ہے۔اس مضمون کا عنوان ہے 'اردو ادبی رسائل۔ مقاصد و مسائل'۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے اردو زبان میں شائع ہونے والے ادبی رسائل کی اشاعت کے حوالے سے گفتگو کی ہے جس میں یہ باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آئی ہیں کہ ان رسائل کے کیا کیا مقاصد ہیں اور ان کے سامنے کیا کیا مسائل ہیں۔

باب 'یادنامہ' میں مختلف اہم شخصیات کو یاد کیا گیا ہے۔ اس باب میں کل 9 شخصیات کے تذکرے مثلاً 'کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ چند یادیں'، 'شاہد رام نگری۔ ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے'، 'پروفیسر وہاب اشرفی کے چند اختصاصی پہلو'، 'مجاز نوری۔ خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا'، 'ظفر عدیم۔ کچھ یادیں ہیں، کچھ باتیں ہیں'، 'ماسٹر جمیل اختر صاحب'، 'مولانا وصی احمد صدیقی قاسمی صاحب' اور 'خیال انصاری' شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین ان تمام دانشوران اردو زبان و ادب کے تعلق سے اہم حقائق پر مبنی ہیں، جن میں ان شخصیات سے وابستہ بہت ہی قیمتی یادوں کو سمیٹا گیا ہے۔

باب 'مطالعات و مشاہدات' میں دو مضامین ہیں۔ پہلا 'جامع مسجد دہلی کے اطراف چند گھنٹے' میں جامع مسجد اور اس کے چاروں طرف کے جو مناظر بڑے خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ پورے مضمون کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے ہیں اور مطالعے کے دوران قاری مطالعے کے ساتھ ان چیزوں کا مشاہدہ بھی کر رہا ہے، یہ عطا عابدی کا فن ہے۔ مضمون

’بک امپوریم‘۔ عاشقان اردو کا سنگم‘ میں بک امپوریم کی مقبولیت کے حوالے سے بھرپور اور جامع گفتگو کی گئی ہے جس سے عام قاری پر بک امپوریم کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور بک امپوریم کی اور اس کے بانی حمید انور کی مقبولیت کا راز کھل کر سامنے آتا ہے۔ کتاب کا آخری باب ’ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ کی کتابیں: اہل نظر کی نظر میں‘ ہے جس میں ان کی پیشتر دو کتابوں پر مشاہیر اردو کی آرا شامل کی گئی ہیں، جس سے ڈاکٹر ممتاز فرخ کی وہ کتابیں جن کے نام ہیں ’فکر تونسوی: حیات و خدمات‘ اور دوسری کتاب ’محبّ اردو حمید انور اور بک امپوریم‘ کی ادبی حلقے میں مقبولیت اور اہمیت و افادیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ ان آرا میں مشاہیر ادبا نے ان کی ان خدمات کو اور ان کی علمی صلاحیتوں کو بہتر طور پر سراہا ہے اور ان کی کما حقہ حوصلہ افزائی کی ہے۔

’افکار و اطوار‘ (جو ڈاکٹر عطا عابدی کے متنوع مضامین پر مشتمل ہے) کو ترتیب دینے میں ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ نے محنت شاقہ سے کام لیا ہے۔ امید کہ ادبی حلقے میں کتاب کو سراہا جائے گا اور اسے اس کا واجب حق ضرور دیا جائے گا۔

ترجمہ

اندرون کا سفر

مصنفہ: افضل سعدیہ فروہ، مترجم: ڈاکٹر محمد ریحان

قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: کریٹو اسٹار پبلی کیشن، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: شاہ عمران حسن: اے 22، شاہ ہاؤس، مکی مسجد کالونی

مدن پور کھادر ایکسٹینشن، پارٹ 3 نالہ روڈ، سریتا وہار، نئی دہلی-110076

کتاب ’اندرون کا سفر‘ ایک یورپی، بالخصوص فرانسیسی زبان سے وابستہ نوجوان مصنفہ، افضل سعدیہ فروہ کی ایک قابلِ قدر کاوش ہے، جس میں انھوں نے محبتِ ذات کے موضوع پر اپنے خیالات کو نہایت سادہ مگر دلنشین انداز میں قلم بند کیا ہے۔ اس کتاب کا اصل فرانسیسی نام Intérieure Vie de Itinéraire ہے۔ جب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو ڈاکٹر محمد ریحان نے اس کی معنوی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے اردو قالب میں ڈھالنے کا فریضہ انجام دیا۔ ان کا ترجمہ نہ صرف سلیس اور بامحاورہ ہے بلکہ اس قدر فطری اور رواں ہے کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کتاب براہِ راست اردو ہی میں تحریر کی گئی ہو۔

یہ کتاب بنیادی طور پر انسانی نفسیات کے ایک نہایت اہم پہلو ــــ یعنی محبتِ ذات ــــ (Self-love) پر مبنی ہے۔ ہمارے معاشرے میں عموماً ’خود سے محبت‘ کو خودغرضی یا انانیت کے مترادف سمجھا جاتا ہے، حالانکہ نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک مثبت، تعمیری اور ناگزیر کیفیت ہے۔ محبتِ ذات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان دوسروں کو نظر انداز کر دے یا محض اپنی خواہشات کا اسیر بن جائے، بلکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو پہچانے، اپنی قدر کرے، اپنی کمزوریوں کو قبول کرے اور اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کی شعوری کوشش کرے۔

زیرِ نظر کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا اسلوب ہے۔ نوجوان مصنفہ افضل سعدیہ فروہ نے خود کلامی (Self-talk) کے انداز میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے، جو قاری کو براہِ راست مخاطب کرتا ہے۔ یہ انداز نہایت مؤثر اور دلنشین ہے، کیونکہ اس میں قاری خود کو مصنفہ کے مکالمے کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ یوں یہ کتاب محض ایک تحریر نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ داخلی مکالمہ بن جاتی ہے، جو قاری کے شعور کو جھنجھوڑتا اور اسے غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

’’مجھے اپنی ذات سے محبت ہے، میں خود سے پیار کرتی ہوں، میرے وجود سے مجھے عشق ہے۔ یہ میرا خود سے کیا ہوا ایک عہد ہے، ایک پرخلوص وعدہ ہے، اور یہی میری سب سے بڑی خواہش ہے۔‘‘ (ص40)

مزید برآں، اس کتاب میں محبتِ ذات کو محض ایک نظری تصور کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ اسے عملی زندگی سے مربوط کیا گیا ہے۔ مصنفہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ انسان اپنی روزمرہ زندگی میں خود سے مثبت گفتگو کرے، اپنی کامیابیوں کو سراہا کرے اور اپنی ناکامیوں کو سیکھنے کا ذریعہ بنائے۔ یہ طرزِ فکر انسان کے اندر ایک مثبت توانائی پیدا کرتا ہے، جو اسے مسلسل آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ایک مقام پر افضل سعدیہ فروہ لکھتی ہیں ’’میں اپنی تمام خوبیوں کا احترام کرتی ہوں جو مجھے خوبصورت، طاقتور اور زرخیز بناتی ہیں۔‘ (ص70)

چونکہ میں فرانسیسی زبان سے ناواقف ہوں، اس لیے یہ کہنا میرے لیے ممکن نہیں کہ مترجم ڈاکٹر محمد ریحان کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، تاہم ترجمہ پڑھتے ہوئے یہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا کام نہایت ذمہ داری، دیانت داری اور مہارت کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد ریحان نے اس کتاب کے ترجمے میں ان تمام تقاضوں کو نہایت خوبی سے ملحوظ رکھا ہے۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے مہارت کے ساتھ فرانسیسی متن کے مفاہیم کو اردو زبان میں اس طرح منتقل کیا ہے کہ یہ کتاب اردو قارئین کے لیے نہ صرف قابلِ فہم بلکہ نہایت دلکش اور اثرانگیز بن گئی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ نفسیاتی موضوعات پر لکھی جانے والی کتب اکثر اوقات خشک، پیچیدہ اور ثقیل محسوس ہوتی ہیں، لیکن اس کتاب کا انداز اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں ایک فطری روانی، سادگی اور فکری لطافت پائی جاتی ہے، جو قاری کو ابتدا سے انتہا تک اپنے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا مطالعہ اکتاہٹ کا باعث نہیں بنتا بلکہ ایک لطیف فکری مسرت فراہم کرتا ہے۔

محبتِ ذات کے تصور کو اگر مزید گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ محض ایک نفسیاتی ضرورت ہی نہیں بلکہ ایک روحانی تقاضا بھی ہے۔ جب انسان اپنی ذات کو پہچان لیتا ہے تو وہ اپنے خالق کی پہچان کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ صوفیانہ روایت میں بھی ’خود شناسی‘ کو ’خدا شناسی‘ کا زینہ قرار دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں محبتِ ذات ایک مثبت، تعمیری اور ارتقائی عمل ہے، جو انسان کو نہ صرف دنیاوی کامیابیوں کی طرف گامزن کرتا ہے بلکہ اسے ایک باوقار، بامقصد اور متوازن زندگی بھی عطا کرتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ کتاب ایک فکری و نفسیاتی رہنما کی حیثیت رکھتی ہے، جو قاری کو اپنے باطن کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اصل کامیابی کا آغاز اندر سے ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی ذات سے محبت کرنا سیکھ لیتا ہے تو وہ دنیا کی ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی پیغام اس کتاب کا نچوڑ ہے اور اس کی اصل معنویت بھی ہے۔

شاعری

دوسرا چہرہ

شاعر: ظفر انصاری ظفر
صفحات: 248، قیمت: 400 روپے
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔6
مبصر : اُنزِلا فاروقی، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

دوسرا چہرہ غزلوں پر مشتمل ظفر انصاری ظفر کا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ظفر انصاری ظفر کا شمار دورِ حاضر کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد کے مسائل، اور انسان کے احساسات وجذبات کے ساتھ ساتھ اپنے داخلی جذبات کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ جو محسوس کرتے ہیں اس کو شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسان کی داخلی کشمکش اور جذباتی سچائی پوری شدت کے ساتھ سامنے آ جاتی ہے۔ یوں تو ظفر انصاری ظفر نے غزل رباعی، نعت ومنقبت وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن زیرِ نظر مجموعہ کلام دوسرا چہرہ خالص غزلوں پر مشتمل ہے۔ جس میں ۱۲ غزلیں شامل ہیں۔ مجموعے کی ابتدا حمد ونعت سے کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں ولی دکنی کی نذر عنوان سے دو غزلیں بھی شامل ہیں اور عنوان جیسا کہ مجموعے کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ دوسرا چہرہ ایک علامتی عنوان ہے اس سے مراد انسان کی وہ پوشیدہ شخصیت ہے جو ظاہری چہرے کے پیچھے چھپی ہوتی ہے اس عنوان کے متعلق ظفر انصاری ظفر یوں لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر مجموعے کا نام دوسرا چہرہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ فنکار کی شخصیت میں دورنگی پائی جاتی ہے۔ ایک رنگ کا تعلق اس کی ظاہری شخصیت سے ہوتا ہے اور دوسرے رنگ کی نسبت اس کی باطنی شخصیت سے ہوتی ہے اور شاعر عموماً اپنی شخصیت کے دوسرے رنگ کو ہی اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

ظفر انصاری ظفر کا شعری اسلوب سادہ اور اثر انگیز ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں پیچیدہ تراکیب کے بجائے سادہ و عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ جس سے قاری آسانی سے ان کی شاعری کے مفہوم تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کی کئی غزلوں میں چہرہ، آئینہ، سایہ، اندھیرا، عشق اور وحشت وغیرہ الفاظ بار بار سامنے آتے ہیں۔ اس مجموعے کی غزلوں میں شاعر نے جس طرح جذبات کی سچی عکاسی کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں احساسات جذبات اور انسانی حقیقت کو بڑی ہی خوبصورتی سے واضح کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیں۔

چہرے سے آشکار نہ ہوں کیوں نقوش غم
سنگ ستم سے شیشۂ دل چور چور ہے

سنا ہے کہ ہے عشق اک بھاری پتھر
یہ پتھر مگر ہم اٹھائے ہوئے ہیں

حقیقت میں یہ عشق کا معجزہ ہے
ظفر ہم جو محفل پہ چھائے ہوئے ہیں

اس مجموعہ کلام کی غزلیں قاری کو محض لطف اندوز نہیں کرتیں بلکہ احساس کی شدت محسوس کرنے، اسے اپنی ذات پر غور وفکر کرنے کی طرف متوجہ بھی کرتی ہیں۔ یہ ظفر انصاری ظفر کا کمال ہے کہ انھوں نے انسان کی داخلی کیفیات، جذبات واحساسات اور اس کی ذات کے پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثلاً

کیوں اپنے حسن پر تجھے اتنا غرور ہے
ایک روز تجھ کو خاک میں ملنا ضرور ہے

ثابت قدم ہے عشق و وفا کی جو راہ میں
آشفتہ سر نہیں، وہ بڑا باشعور ہے

مجھے یہ خوف ہے طوفانِ دورِ حاضر سے
بجھا نہ دے وہ ہر ایک صاحب نظر کا چراغ

تو اگر حاملِ آدابِ وفا ہو جائے
قیدِ غم سے دل بے تاب رہا ہو جائے

عزتِ نفس کا ہر حال میں تم رکھّو خیال
بت کے آگے نہ جُھکو یوں کہ خدا ہو جائے

فریب آپ نے ہر موڑ پر دیا مجھ کو
مگر ابھی بھی بھروسہ ہے آپ پر میرا

جو بھول کر بھی مری یاد آ گئی اس کو
لبوں پہ اس کے رہا نام رات بھر میرا

دوسرا چہرہ کی غزلوں میں فکری شعور، جذبات کی سچائی کی عمدہ ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہے۔ شاعر نے غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے موجودہ دور کے اہم پہلو... زندگی کے مسائل، انسانی تنہائی اور باطنی کرب کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس مجموعے میں کئی جگہ شاعر کا صوفیانہ اور قلندرانہ انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق ومحبت ہجر ووصال کے موضوعات پر بھی بہت سے اشعار شامل ہیں جو روش سے ہٹ کر موجودہ دور کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجموعے میں خراج عقیدت کے طور پر بھی کئی اشعار شامل ہیں۔ مثلاً پروفیسر عبدالکلام قاسمی کے سانحہ ارتحال سے متاثر ہو کر ظفر انصاری ظفر یہ شعر کہتے ہیں کہ۔

چھوڑ کر بزمِ جہاں، موڑ کے منہ یاروں سے
چل دیا جامِ وفا سب کو پلانے والا

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مجموعہ کلام دوسرا چہرہ روایت اور جدیدیت دونوں کا حسین امتزاج ہے۔ جو جدید غزل کے قارئین کو مایوس نہیں کرے گا۔ یہ مجموعہ کلام صرف ادبی لطف نہیں دیتا بلکہ فکری سطح پر بھی قارئین کو متاثر کرتا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت میں اردو ڈائریکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ پٹنہ (بہار) کا مالی تعاون حاصل ہے۔ کتابت و طباعت اچھی ہے۔ کہیں کہیں ٹائپنگ کی غلطیاں ہیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ درست کر لی جائیں گی۔ آخر میں مطبع اور شاعر کو مبارکباد کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس مجموعہ کلام دوسرا چہرہ کا مطالعہ ادب کے قارئین کو مایوس نہیں کرے گا۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

یوگ ایک روشنی ہے اور دنیا کے بہتر مستقبل کی ضرورت بھی: عزت مآب وزیراعظم

بین الاقوامی یوم یوگ 2026 کے موقع پر عزت مآب وزیراعظم کا خطاب

نئی دھلی: ’صحت مند بڑھاپے کے لیے یوگ‘ کی تھیم پر بین الاقوامی یوم یوگ 2026 کے موقعے پر آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں وزیراعظم عزت مآب شری نریندر مودی کا خطاب سننے اور یوگ کے مختلف آسن کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ کونسل کے عملے نے عزت مآب وزیراعظم کا خطاب توجہ سے سنا اور یوگ سے متعلق ان کے خیالات سے مستفید ہوئے۔ عزت مآب وزیراعظم نے عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک روشنی ہے، جو ہماری توانائی میں اضافہ کرتی ہے۔ یوگ دنیا کے ایک بہتر مستقبل کی ضرورت ہے۔ اسے محض ایک پروگرام یا ایک دن تک محدود رکھنا ٹھیک نہیں۔ یوگا کو اپنی زندگی، گھر، خاندان اور آنے والی نسلوں کا حصہ بنانا ضروری ہے۔ یوگ جب زندگی میں داخل ہوتا ہے تو انسانی اتحاد کا علم بردار بن جاتا ہے۔ وزیراعظم نے مختلف آسن کے ذریعہ عملی طور پر یوگ میں شرکت کی اور عوام کو بہتر صحت کا پیغام دیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کا عملہ مختلف آسنوں کے ذریعہ بین الاقوامی یوم یوگ کے جشن میں شریک رہا۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 21 جون 2026

بین الاقوامی یوم یوگ 2026 کی مناسبت سے لیکچر کا انعقاد

نئی دھلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں بین الاقوامی یوم یوگ 2026 کی مناسبت سے ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے مہمان مقرر کا استقبال کرتے ہوئے آج کے دور میں یوگا

کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور اسے انسانی زندگی کو بہتر بنانے کا ایک اہم حوالہ قرار دیا۔

پتنجلی سے وابستہ یوگ کی ماہر محترمہ اینتا کماری نے یوگا کی معنویت پر ایک اہم لیکچر دیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کی مصروف زندگی میں لوگوں کو جسمانی ورزش کا موقع کم مل پاتا ہے ایسے میں کئی قسم کی بیماریاں انھیں لاحق ہو جاتی ہیں۔ دیر تک کرسیوں پر بیٹھ کر کام کرنے والے ملازمین کی طرف سے سروائیکل اور گیس کی شکایتیں اکثر موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے میں اگر یوگ کے چند نہایت آسان لیکن اہم آسنوں کا اہتمام کیا جائے تو ان بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے سروائیکل، کمر درد، پیٹ کی چربی، ڈائبٹیز، گھبراہٹ، تھکان، گیس اور ایسیڈٹی جیسے مختلف امراض سے نپٹنے کے لیے بھجنگ آسن، اردھ ہلاسن، پرانایام، بگ آسن، منڈوک آسن، کپال بھاتی، پون مکت، سیتو بند جیسے مختلف آسن کے طریقے بھی بتائے۔ کون سا آسن کس وقت مفید ہوگا اس پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یوگ من کو شانتی عطا کرتا ہے اور جب من شانت رہتا ہے تو کام کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ انھوں نے مختلف بیماریوں اور آسنوں سے متعلق لوگوں کے سوالات کے تشفی بخش جوابات بھی دیے۔ اس موقعے پر ادارے کے اسسٹنٹ ڈائرکٹرز اور افسران کے علاوہ دیگر عملہ بھی موجود رہا۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 18 جون 2026

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

بین المذاہب مکالمہ: اردو، کشمیریت اور مشترکہ تہذیبی روایات

سری نگر/ دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور انٹر فیتھ ہارمونی فاؤنڈیشن آف انڈیا کے باہمی اشتراک سے آج ونٹر ہال، ایس کے آئی سی سی، سری نگر میں یک روزہ سمینار بعنوان 'بین المذاہب مکالمہ: اردو کشمیریت اور مشترکہ تہذیبی روایات' منعقد کیا گیا۔ اس سمینار کا افتتاح صبح گیارہ بجے ہوا جس میں مہمان خصوصی جناب منوج سنہا (عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر، جموں وکشمیر)، مہمان اعزازی ڈاکٹر کرن سنگھ (عزت مآب سابق صدر ریاست و گورنر جموں وکشمیر و سابق مرکزی وزیر، حکومت ہند) نے خاص طور پر شرکت کی۔

مہمان خصوصی جناب منوج سنہا نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں گیان کی پرمپرا بہت قدیم ہے۔ یہاں کی تہذیب میں ابتدا ہی سے ایک دوسرے کے تئیں قبولیت پائی جاتی ہے۔ یہی صحیح معنوں میں بھارتیتا ہے۔ انھوں نے زبان اور تہذیب کے رشتوں پر گفتگو کرتے ہوئے مزید کہا کہ بھارتیتا ہی ہندوستانیت اور کشمیریت ہے۔ ہندوستان کی ہر زبان اور تہذیب کو پھلنے پھولنے کا حق ہے۔ اپنی گفتگو کا اختتام انھوں نے علامہ اقبال کی مشہور نظم 'نیا شوالہ' سنا کر کیا۔

مہمان اعزازی ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہندوستان کی سرزمین لوگوں کو جوڑنے کی حیثیت سے منفرد شناخت رکھتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے مختلف مذاہب اور زبانوں کا سنگم رہی ہے اور انھیں تحفظ بھی فراہم کیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی شیرینی، قوت اظہار اور روانی پر خصوصی روشنی ڈالتے ہوئے اسے اردو کی بقا کا ایک اہم وصف قرار دیا۔ نمونے کے طور پر انھوں نے فیض احمد فیض کی ایک نظم بھی پیش کی۔

اس سے قبل استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور اس اہم موضوع پر سمینار کے انعقاد کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے قومی اردو کونسل اور کشمیر کے حوالے سے کہا کہ مختلف اسکیموں کے نفاذ سے لے کر اسکل ڈیولپمنٹ تک میں کشمیر اور اہل کشمیر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ انھوں نے کونسل کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی فطرت میں مشارکت اور رواداری پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کونسل نے بین المذاہب ہم آہنگی کو اردو زبان وادب کے ذریعے فروغ دینے کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہ سمینار بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد (صدر، انٹر فیتھ ہارمنی فاؤنڈیشن آف انڈیا) نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے بین المذاہب ہم آہنگی کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ ڈائیلاگ کو بڑھاوا ملے کیونکہ یہ واحد راستہ ہے جس سے تمام کنفلیکٹ کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر نیلوفر خان (وائس چانسلر، یونیورسٹی آف کشمیر، سری نگر) نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل اور کشمیر یونیورسٹی نے مل کر کئی اہم پروگرام منعقد کیے ہیں اور اس طرح کے پروگراموں کا انعقاد ادارہ جاتی اشتراک کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مقررین میں ڈاکٹر جیوتسنا سنگھ (بانی و ڈائرکٹر، داراشکوہ سینٹر، سری نگر)، ڈاکٹر نسرین شمع (ڈائرکٹر، آپریشنس، انٹر فیتھ ہارمنی فاؤنڈیشن آف انڈیا)، ڈاکٹر فدا فردوس (صدر، کشمیر رائٹرس ایسوسی ایشن) شامل رہے۔ افتتاحی اجلاس نوید الاسلام خان (نیشنل کوآرڈینیٹر، انٹر فیتھ ہارمنی فاؤنڈیشن آف انڈیا) کے کلمات تشکر پر اختتام پذیر ہوا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد دو تکنیکی اجلاس بھی منعقد ہوئے۔ پہلا تکنیکی اجلاس دوپہر 1 بجے تا 2.30 بجے جاری رہا۔ اس سیشن میں سردار دلبیر سنگھ سوڈھی (بارہمولہ، جموں وکشمیر)، ڈاکٹر گوتم کول (صدر، کشمیری ہندو ویلفیئر ایسوسی ایشن، ممتاز ماہر تعلیم و اسکالر)، پروفیسر راشد مقبول (شعبہ ابلاغیات وصحافت، یونیورسٹی آف کشمیر، سری

نگر)، ڈاکٹر محمد معروف شاہ (ڈپٹی ڈائرکٹر (ریسرچ)، شیپ ہسبنڈری ڈپارٹمنٹ کشمیر) اورڈاکٹر رافعہ نثار (اسسٹنٹ پروفیسر، ایس ایچ ایم گورنمنٹ ڈگری کالج ،اننت ناگ جموں وکشمیر) نے اظہارخیال کیا۔

دوسرا تکنیکی اجلاس دو پہر 3.30 بجے سے 5 بجے شام تک جاری رہا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر (ڈاکٹر) نصیر اقبال (رجسٹرار، یونیورسٹی آف کشمیر سری نگر) نے کی جب کہ پروفیسر اعجاز محمد شیخ (ڈین، اسکول آف آرٹس لنگویج اینڈ لٹریچر یونیورسٹی آف کشمیر)، پروفیسر عرفان احمد ملک (صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف کشمیر)، پروفیسر ستیش ومل (شیخ العالم سینٹر فار ملٹی ڈسپلنری اسٹڈیز، یونیورسٹی آف کشمیر) اور پروفیسر الطاف انجم (ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم، یونیورسٹی آف کشمیر) نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ سمینار ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد کے اختتامی کلمات پر اپنے اختتام کو پہنچا۔ حاضرین میں علما و دانشور کی بڑی تعداد موجود رہی اور سبھی نے نہایت دلجمعی اور سنجیدگی کے ساتھ مہمانوں کے خیالات سنے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 27 جون 2026

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی وثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی وثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درجہ ذیل ای میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دہلی

یوگا ڈے ہندوستان کے لازوال تہذیبی ورثے کا جشن

نئی دہلی: لوک سبھا کے اسپیکر اوم برلا نے 21 جون کو یوگا کے عالمی دن کے موقع پر پارلیمنٹ ہاؤس

کامپلیکس میں اراکین پارلیمنٹ کے ساتھ یوگا سیشن کی قیادت کی۔ اپنی جانب سے سب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ دن ہندوستان کے لازوال تہذیبی ورثے کا جشن ہے، جس نے انسانیت کو صحت، توازن اور قلبی سکون کا راستہ فراہم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوگا نہ صرف جسم بلکہ دماغ اور خیالات کو بھی متوازن کرتا ہے۔ پارلیمنٹ میں اختلاف رائے فطری ہے لیکن یوگا ہمیں مکالمے اور ضبط نفس کا راستہ دکھاتا ہے۔ یوگا کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مسٹر برلا نے کہا کہ ہندوستان کے باباؤں اور اسکالروں نے صدیوں سے یوگا کی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے کام کیا اور اسے ایک طرز زندگی کے طور پر قائم کیا۔ اس کا مقصد جسمانی صحت، ذہنی سکون اور انسانی شعور کی بیداری کو فروغ دینا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یوگا اب ایک عالمی عوامی تحریک بن چکا ہے جسے پوری دنیا میں قبول کیا گیا ہے، تاہم یہ ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی علمی روایت کا تحفہ ہے۔ عصری زندگی میں یوگا کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لوک سبھا اسپیکر نے کہا کہ آج کل کی زندگی تناؤ، عدم توازن اور غیر یقینی صورت حال سے گھری ہوئی ہے۔ ایسے دور میں، یوگا ذہنی سکون، صبر، جذباتی توازن، اور نظم وضبط کے طرزِ حیات کو برقرار رکھنے کے لیے ایک موثر ذریعہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ 21 ویں صدی کی سب سے بڑی چنوتیوں میں سے ایک ذہنی تناؤ ہے اور یوگا ایک قابل رسائی، سائنسی اور جامع حل پیش کرتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کی ڈیجیٹل نسل کو اسکرین ٹائم اور تناؤ کو متوازن کرنے کے لیے یوگا کو اپنے طرزِ حیات کا حصہ بنانا چاہیے۔ مسٹر برلا نے کہا کہ یوگا محض فٹنس پروگرام نہیں ہے بلکہ شخصیت، کردار اور شعور کی نشو ونما کا ایک ذریعہ ہے۔ لوک سبھا اسپیکر نے زور دیا کہ یوگا کا پیغام ملک کے کونے کونے تک پہنچانا چاہیے۔ عوامی نمائندے معاشرے کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتے ہیں اور لوگوں کو یوگا کو اپنانے اور اس کی تبدیلی کی طاقت کو سمجھنے کی ترغیب دینے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جس طرح جمہوریت کو مضبوط کرنے کے لیے مسلسل کوششیں کی جاتی ہیں، اسی طرح یوگا کو بھی ہر شہری کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بننا چاہیے۔ مسٹر برلا نے کہا کہ یوگا صرف ہندوستان کی سافٹ پاور نہیں ہے بلکہ انسانیت کے تئیں ہندوستان کی ذمے داری ہے۔ انھوں نے تمام شہریوں پر زور دیا کہ وہ یوگا کو ایک دن کے جشن کے طور پر نہیں بلکہ 365 دن کے عزم کے طور پر سمجھیں اور باقاعدہ یوگا مشق کے ذریعے صحت، ہم آہنگی اور خود ضبطی کی ثقافت کو مضبوط کریں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 جون 2026

مسلم طلبہ ونوجوان کانفرنس

نئی دہلی: مسلم راشٹریہ منچ کے طلبہ ونوجوان شعبہ کے زیر اہتمام دارالحکومت نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب کے اسپیکر ہال میں 'مسلم طلبہ ونوجوان کانفرنس' کا شاندار انعقاد عمل میں آیا۔ کانفرنس کا مرکزی موضوع پنچ پریورتن کے ذریعے ملک کی تعمیر میں طلبہ اور نوجوانوں کا کردار تھا۔ اس اہم کانفرنس میں ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ، نوجوانوں، ماہرین تعلیم، سماجی کارکنان اور دانشوروں نے شرکت کی اور قومی ترقی، سماجی ہم آہنگی اور نوجوان نسل کی ذمے داریوں پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ پروگرام کے مہمانِ خصوصی راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آرایس ایس) کی قومی مجلس عاملہ کے رکن ڈاکٹر اندریش کمار تھے۔ کانفرنس کی صدارت پروفیسر شاہد اختر ایگزیکٹو چیئرمین این سی ایم ای آئی نے کی، جب کہ پروفیسر نریندر سنگھ پرنسپل ذاکر حسین دہلی کالج نے بطور مہمانِ اعزازی شرکت کی۔ ہریانہ کے رکن اسمبلی محمد اسرائیل بھی اس موقعے پر موجود رہے اور نوجوانوں کو قومی خدمت اور سماجی ذمے داریوں کے تئیں بیدار رہنے کا پیغام دیا۔ اپنے خطابات میں مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ ملک کی ترقی، قومی یکجہتی اور سماجی استحکام میں نوجوانوں

اور طلبہ کا کردار نہایت اہم ہے۔ انھوں نے تعلیم، خود انحصاری، ماحولیاتی تحفظ، سماجی بیداری اور قومی یکجہتی جیسے موضوعات کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ کانفرنس کے دوران نوجوانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ تعلیم اور مثبت سوچ کو اپنا ہتھیار بناتے ہوئے ملک و قوم کی خدمت میں فعال کردار ادا کریں اور معاشرے میں بھائی چارے، امن و آشتی اور قومی یکجہتی کو فروغ دیں۔ اس موقعے پر مسلم راشٹریہ منچ کے طلبہ و نوجوان شعبہ کے قومی کنوینز ڈاکٹر عمران چودھری سمیت متعدد معزز شخصیات دانشوران اور سماجی کارکنان بھی موجود تھے۔ پروگرام کا اختتام ملک کی ترقی، سماجی ہم آہنگی اور نوجوانوں کے باختیار مستقبل کے عزم کے ساتھ ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 10 جون 2026

'مسلم طلبہ و نوجوان کانفرنس' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

میتھلی رنگ منچ تحریک

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی اور میتھلی لوک رنگ (میلو رنگ) کے مشترکہ زیر اہتمام نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے 'انترکش' سبھا گار میں 'میتھلی رنگ منچ تحریک' کے موضوع پر ایک اہم قومی سمینار منعقد کیا گیا، جس میں میتھلی زبان و ادب سے وابستہ ممتاز ادیبوں، ناقدین، فنکاروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ پروگرام کے کلیدی مقرر معروف ڈرامہ نگار، شاعر اور ماہر لسانیات اُدے نارائن سنگھ نچیکیتا نے کہا کہ اگرچہ میتھلی رنگ منچ کی تاریخ بہت طویل نہیں ہے، لیکن آزاد ہندوستان میں اس کی ایک مسلسل اور مضبوط روایت قائم رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح میتھلی میں بھی رنگ منچ کی ترقی کے لیے تراجم کے ساتھ ساتھ اصل ڈراموں کی تخلیق نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے یاد دلایا کہ 'گورکش وجے' اور 'دھورت سماگم' جیسے اہم اور قدیم میتھلی ڈرامے پہلے ہی اس زبان کے ادبی سرمائے کا حصہ رہے ہیں۔ ابتدائی خطبہ پیش کرتے ہوئے پردیپ بہاری نے کہا کہ مختلف تحریکوں سے گزرتے ہوئے آج میتھلی تھیٹر کا منظر نامہ کافی مستحکم اور متنوع ہو چکا ہے۔ انھوں نے شہروں سے لے کر دیہی علاقوں تک جاری تھیٹر سرگرمیوں اور رنگ کارکنوں کو درپیش چیلنجوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ میتھلا سماج کو فنکاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات اور اعزازات کا موثر نظام قائم کرنا چاہیے۔ نمونا رائن مشر نے کولکاتا میں میتھلی رنگ منچ سے وابستہ اداروں اور فنکاروں کی خدمات کا ذکر کیا، جب کہ کسلیہ کرشن نے میتھلا اور نیپال میں میتھلی تھیٹر کی سرگرمیوں پر مبنی تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ میتھلی رنگ منچ کی سینئر اداکارہ پریم لتا مشر پریم نے پٹنہ میں رنگ تحریکوں، تھیٹر اداروں اور ان کی سرگرمیوں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ابتدائی دور میں خواتین اداکاراؤں کی کمی محسوس کی جاتی تھی، لیکن سماجی بیداری کے نتیجے میں آج کثیر تعداد میں خواتین اداکارائیں اور ہدایت کار میتھلی تھیٹر سے وابستہ ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 14 جون 2026

انتخابِ خطوطِ غالب

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اردو کے ممتاز استاذ اور ناقد پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی مرتب کردہ کتاب 'انتخابِ خطوطِ غالب' پر ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا۔ یہ کتاب غالب انسٹی ٹیوٹ نے دسمبر 2025 میں شائع کی تھی۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر، شعبۂ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ غالب نے مغلیہ عہد کے زوال، انگریز اقتدار کے قیام اور 1857 کے ہنگاموں کا مشاہدہ کیا، جس کے باعث ان کی فکر میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی جو ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ خطوط میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے خطوط کے انتخاب میں بڑی باریک بینی اور فہم و ادراک کا ثبوت دیا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اس کتاب کی بدولت انھیں ایسے دوستوں سے ملاقات کا موقع ملا جن سے کم ہی ملاقات ہو پاتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مذاکرے میں پیش کیے گئے۔ نکات کی روشنی میں وہ اس انتخاب کا دوبارہ مطالعہ کریں گے۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ ہر انتخاب اپنے مرتب کے زاویۂ نظر کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لیے مختلف افراد ایک ہی متن کی مختلف تشریحات کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ انھوں نے اس انتخاب کا 'کلیاتِ خطوطِ غالب' سے تقابل کیا اور پایا کہ تکرار اور غیر ضروری طوالت والے خطوط کو شامل نہیں کیا گیا، جب کہ غالب کے خطوط کا مجموعی تاثر برقرار رکھا گیا ہے۔

پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ غالب کے خطوط تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی مطالعات کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ میر، سودا اور ذوق کے خطوط محفوظ نہیں رہ سکے، تاہم غالب کے خطوط اس کمی کی کسی حد تک تلافی کرتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے انتخاب کی تیاری کے دوران روزانہ کئی گھنٹے غالب انسٹی ٹیوٹ میں صرف کیے اور اس کام کے لیے غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 21 جون 2026

جہانِ غالب

نئی دہلی: نئی دہلی میں منعقدہ ماہانہ نثری نشست میں اردو کے معروف افسانہ نگار خورشید حیات نے کہا کہ آج کی اردو اور ہندی کہانیاں اپنے عہد کے سچ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس نشست میں اردو اور ہندی کے ادیبوں نے اپنی کہانیاں اور مضامین پیش کیے۔ بیشتر تخلیقات میں سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا، بعض کہانیاں روایتی انداز کی تھیں، جب کہ کئی تخلیقات معاشرتی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے مطابق تمام کہانیوں میں اپنے عہد کی حقیقت نمایاں تھی۔ نشست میں چشمہ فاروقی نے 'جدید رہائش گاہ' کے عنوان سے اپنا افسانہ پیش کیا، جس میں لکھنؤ کی تہذیب اور مشرقی اقدار کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کی دردناک تصویر پیش کی گئی۔ ڈاکٹر شاہد حبیب نے پروفیسر خلیل احمد بیگ کی کتاب 'مبادیاتِ لسانیات' پر تفصیلی تنقیدی مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر شارق اعجاز عباسی نے اپنا پُرتاثیر افسانچہ 'دیدہ ور' پیش کیا۔ سیما کوشک نے 'پیار، پریوار اور سماج'، احترام صدیقی نے 'چھوٹی سی بات'، معروف کہانی کار، مکالمہ نگار اور شاعر کوی کویشور نے 'وہ ٹکٹ'، راجندر یادو نے 'دادی ماں'، راج ویر سنگھ نے 'سپنے بھی سوکھ گئے'، یوگیندر سنگھ نے 'انوکھی خوشی اور پروین ویاس نے 'سنتن کو کہاں سیکری سو کام' کے عنوان سے اپنی کہانیاں سنائیں، جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ نشست کے اختتام پر ادبی رسالہ 'جہانِ غالب' کے شمارہ نمبر 42 کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 جون 2026

'یوگا' کی اہمیت پر مذاکرہ

نئی دہلی: عالمی یوم یوگا کے موقعے پر ٹی ایچ ایس اردو سینٹر کے زیرِ اہتمام حوض رانی، جنوبی دہلی میں 'یوگا'

کی اہمیت پر مذاکرے کا انعقاد ہوا جس میں مقررین نے یوگا کے ذریعے بدن کے اعضا طویل عرصے تک فعال رہنے کی تدابیر پر غور و فکر کے ساتھ عملی زندگی میں یوگا اپنانے پر زور دیا۔ صحت مند معاشرے کے لیے 'یوگا' ضروری بتاتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب نے ورزش کے نام سے ہی سہی روزانہ صبح کے اوقات میں پابندی سے کثرت کرنے کی بات کہی۔ ڈاکٹر آفتاب نے یوگا کو جسمانی و ذہنی صحت کی ضرورت، اور مثبت طرزِ زندگی پر خاص طور سے توجہ دیتے ہوئے کہا کہ عوام کی اکثریت نے جسم راحت طلب بنا لیے ہیں۔ کھانے پینے کے ساتھ جسم محنت کش نہیں رہتے، اس لیے یوگا ضروری ہے۔ مذاکرہ کے دوسرے مقرر شاہ حسن سیفی (رشین ایجوکیشن ایڈمیشن کونسلر، نئی دہلی) نے کہا کہ ذہنی دباؤ کم کرنے، بہتر صحت رکھنے اور متوازن زندگی جینے میں یوگا مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہمیں خود اپنے تن کو ریاضت میں اور فکر کو تصورِ باطن میں محور رکھنا چاہیے۔ اس لحاظ سے جسم کو توانا کرنے کے لیے یوگا انتہائی ضروری ہے۔ ڈاکٹر حبیب سیفی نے اپنی نظم 'یوگا' بھی پیش کی، جس میں یوگا کے ذریعے جسم کو توانائی، ذہن کو استحکام اور کام میں دل لگنے جیسے نکات کی طرف اشارہ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فیصل نے کہا کہ زندگی مثبت انداز میں جینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یوگا پسند بنیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 جون 2026

اترپردیش

اردو ادب اور ماحولیات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں 'اردو ادب اور ماحولیات' کے موضوع پر ایک مذاکرے

کا اہتمام کیا گیا۔ صدر شعبہ پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ماحولیات کی اصطلاح دورِ حاضر کی دین ہے اور اس کا اپنا سیاق وسباق ہے۔ اس مخصوص سیاق وسباق میں ابھی ہمارے معاصر شعر و ادب میں اس کا خاطر خواہ اظہار نہیں ہو پایا ہے۔ تاہم بطور نمونہ بعض تخلیقات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً راشد انور راشد کے شعری مجموعہ 'گیت سناتی ہے ہوا' کی تمام نظمیں ماحولیات کے حوالے سے کہی گئی نظمیں ہیں۔ ماضی میں جب ماحولیات کی اصطلاح رائج نہیں تھی تو فطرت اور مناظرِ فطرت کے حوالے سے شعرا و ادبا نے اپنے تاثرات سپردِ قلم کیے۔ ہمارا کلاسیکی سرمایہ خواہ وہ نثر میں داستانوں کی شکل میں ہو یا شعری اصناف میں مثنوی وغیرہ کی شکل میں، ان میں انسان، اس کے متعلقات، شجر و حجر، نباتات و جمادات کے باہمی رشتوں کو اس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن پر ایک حسین نقش ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جدید تھیوریز نے عہدِ حاضر میں ماحولیات کے حوالے سے بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اردو ادب کا یہ امتیاز رہا ہے کہ اس میں ہر دور میں انسان اور قدرت کے مابین رشتوں کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر ندیم احمد، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے صنعتی انقلاب اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عدم توازن کے اسباب و علل پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح ہمارے آس پاس کنکریٹ کا جنگل بڑھتا چلا جا رہا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم کم از کم ایک پودا ضرور لگائیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 جون 2026

دو فنکار

سہارنپور: 19 جون کو انجمن پروازِ ادب اور انجمن عروجِ ادب کی جانب سے ایک محفلِ سخن بعنوان 'دو فنکار'

ناز بلڈنگ آلی چوک پر آراستہ کی گئی جس کی صدارت کرتے ہوئے سینئر سماجی کارکن اور صنعت کار صابر علی خاں نے کہا کہ اردو ہماری تہذیب اور وراثت ہے اس کی حفاظت ہم سب کی ذمے داری ہے، ہم سب کو یہ تحریک چلانی چاہیے کہ ہر گھر کا ہر بچہ انگریزی ہندی تعلیم کے ساتھ اردو داں بھی ہو جب تک نئی نسل اردو رسم الخط کی جانکار نہیں ہوگی تب تک اردو کے روشن

مستقبل کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ خرم سلطان نے نظامت کرتے ہوئے اعزازی مہمان سہیل اقبال کے دونوں شعری مجموعے 'صحرا میں شام' اور 'سمندر میں دھول' کو اردو ادب میں خوبصورت اضافہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ سہیل اقبال نے آسان اور سہیل الفاظ کا استعمال کرکے بڑی شاعری تخلیق کی ہے۔ پروگرام کنوینر طاہر امین نے دوسرے مہمانِ اعزازی ندیم اختر کے تعلق سے کہا کہ ان کا شعری مجموعہ 'میں ہوں نہ' شاعر کی شاعرانہ اور فنی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے، آپ ایک فعال شخصیت ہیں، ان کی آمد کے لیے ہم ممنون و مشکور ہیں، آخر میں پروگرام کنوینر طاہر امین اور انجمن عروجِ ادب کے بانی دانش کمال نے مہمانانِ کرام کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 20 جون 2026

تلنگانہ

'طب یونانی: امکانات اور قوت'

حیدرآباد: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے ٹیکنیکل ونگ اور ستیہ یونانی گروپ آف انسٹی ٹیوشنز، حیدرآباد کے اشتراک سے تلگو یونیورسٹی، نام پلی، حیدرآباد میں دوروزہ قومی یونانی سمینار پروفیسر مشتاق احمد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سمینار میں ملک بھر سے ماہرین طب، اساتذہ، محققین اور طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ شرکا میں پروفیسر رگھوویر سنگھ، پروفیسر ایم اے فاروقی، پدم شری حکیم ایم اے وحید، ڈاکٹر وسیع الرحمٰن (آئی آر ایس)، ڈاکٹر امام الدین، ڈاکٹر عطاء اللہ شریف، ڈاکٹر ایس جی وی ستیہ، ڈاکٹر منہاج الدین خاں، ڈاکٹر ایس ایم یعقوب، حکیم حسام الدین طلعت، ڈاکٹر نیاز خاں، ڈاکٹر ندا خاں ڈاکٹر شبانہ عثمانی، ڈاکٹر ناہید خاں، ڈاکٹر حمیرہ، ڈاکٹر خالد نیازی اختر، ڈاکٹر محمد تابش، ڈاکٹر اخلاق احمد انصاری، ڈاکٹر نیاز راشد اختر، ڈاکٹر طاہر حسین، ڈاکٹر رضوان نورانی، ڈاکٹر فاروق رحمٰن، ڈاکٹر نیر اقبال، ڈاکٹر محمد سمیع الدین، ڈاکٹر عرشیہ، ڈاکٹر فائزہ شعیب، ڈاکٹر امینہ بیگم اور ڈاکٹر محمد غلام اقبال سمیت متعدد شخصیات شامل تھیں۔ سمینار میں 'طب یونانی: امکانات اور قوت' کے موضوع پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا گیا اور مختلف تحقیقی مقالات پیش کیے گئے۔ مقررین نے معیاری دواسازی کے فروغ، اکیڈمک سرگرمیوں کے استحکام اور تحقیقی کام میں مزید تیزی لانے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر مشتاق احمد نے کہا کہ طب یونانی مضبوط سائنسی بنیادوں پر قائم ایک موثر نظام علاج ہے، جو صدیوں سے عوام کو فائدہ پہنچاتا آرہا ہے، انھوں نے کہا کہ اپنی افادیت اور علمی قوت کے باعث یہ نظامِ طب آج بھی مقبول ہے۔ سمینار کے شرکا نے مطالبہ کیا کہ نیشنل کمیشن فار انڈین سسٹم آف میڈیسن (NCISM) آیوروید کی طرح طب یونانی کی اکیڈمک حیثیت اور شناخت کو بھی برقرار رکھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جون 2026

کتاب پڑھیے، تبصرہ لکھیے

حیدرآباد: انجمن ادب اطفال تلنگانہ کے زیراہتمام بچوں میں مطالعہ کا ذوق بیدار کرنے، کتاب بینی کی ثقافت کو فروغ دینے اور نئی نسل کو علم و ادب سے جوڑنے کے مقصد سے 'کتاب پڑھیے، تبصرہ لکھیے' کے عنوان سے ریڈنگ اینڈ بک ریویو مقابلہ ٹم ریز، یاقوت پورہ و بوائز نمبر 1 اسکول، مغل پورہ میں کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ مقابلہ میں جماعت ششم تا دہم اور انٹرمیڈیٹ اول و دوم سال کے طلبہ و طالبات نے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کی۔ شرکا نے اپنی پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ کرکے ان پر تحریری اور زبانی تبصرے پیش کیے، جن میں کتاب کا تعارف، مصنف کا نام، مرکزی خیال، اہم کردار اور حاصل شدہ اسباق کو موثر انداز میں بیان کیا گیا۔ اس موقعے پر محمد سلیم فاروقی (صدر اردو اکیڈمی جدہ، حیدرآباد چیپٹر) نے کہا کہ اس طرح کے علمی وادبی مقابلے طلبہ کو کتابوں سے جوڑنے اور مطالعہ کی عادت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کتاب سے بہتر کوئی دوست اور رہنما نہیں ہوسکتا۔ مطالعہ انسان کی فکر کو وسعت دیتا ہے اور شخصیت کو نکھارتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی (موظف پرنسپل، گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ) نے کتاب بینی کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مطالعہ انسان کی ذہنی، فکری اور اخلاقی تربیت کا موثر ذریعہ ہے۔ اگر بچوں کو کم عمری ہی سے پڑھنے اور لکھنے کی عادت ڈالی جائے تو ان میں اظہارِ خیال، تنقیدی سوچ اور تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ ڈاکٹر عزیز سہیل (صدر انجمن ادب اطفال تلنگانہ) نے خیر مقدمی خطاب کرتے ہوئے مقابلے کے انعقاد کے مقاصد بیان کیے۔ انھوں نے کہا کہ انجمن ادبِ اطفال تلنگانہ کا بنیادی مقصد بچوں میں مطالعہ، تخلیقی صلاحیتوں اور مثبت فکری رجحانات کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلسل جستجو، محنت اور مطالعہ ہی کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ طلبہ کو چاہیے کہ وہ کتابوں سے دوستی کریں اور علم کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ لیاقت علی (معتمد اردو اکیڈمی جدہ، حیدرآباد چیپٹر) نے کہا کہ آج کے مقابلے میں اسکول اور کالج کے طلبہ نے کتابوں کا مطالعہ کرکے تحریری اور تقریری شکل میں اپنے خیالات کا بہترین اظہار کیا، جو ان کی صلاحیتوں کا واضح ثبوت ہے۔ خلیل احمد نے والدین پر زور دیا کہ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دیں اور انھیں ادبی و علمی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دیں تاکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا مل سکے۔ محسن خان نے کہا کہ ٹیکنالوجی کے اس جدید دور میں مطالعہ کے ذرائع بدل گئے ہیں اور لوگ آن لائن کتابیں اور اخبارات بھی پڑھ رہے ہیں، تاہم مطالعہ میں سنجیدگی اور یکسوئی برقرار رکھنا ضروری ہے۔ محمد محمود (مدرس) نے کہا کہ بچوں کو ادب، تہذیب اور علمی سرگرمیوں سے جوڑنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ حافظ عبدالمعید (خازن انجمن ادب اطفال تلنگانہ) نے مقابلے کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے انعامات کا اعلان کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اول انعام 1000 روپے نقد، سند اعزاز اور کتاب، دوم انعام 500 روپے نقد، سند اعزاز اور کتاب جب کہ سوم انعام میڈل سند اعزاز اور کتاب پر مشتمل تھا۔

روزنامہ 'تاثیر'، 17 جون 2026

جھارکھنڈ

پروفیسر احمد سجاد: حیات و خدمات

رانچی: مرکز ادب وسائنس، تعلیمی وفلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ کے زیراہتمام مورخہ 21 جون 2026 بروز اتوار مولانا

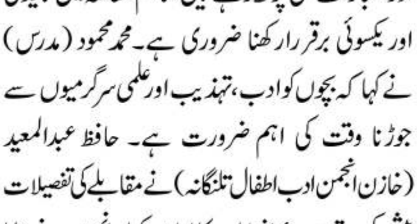

ابوالکلام آزاد ہال انجمن پلازہ مین روڈ، رانچی میں 22 واں جلسہ تقسیم اسناد (کنوکیشن) اور پھر جھارکھنڈ کے مشہور ادیب 'پروفیسر احمد سجاد حیات و خدمات' پر ایک

سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں مرحوم کی علمی، ادبی، ملی و سماجی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے فاضل دانشوروں کے ذریعہ مقالے پیش کیے گئے۔ مذکورہ سمینار میں پروفیسر منظر حسین، سابق صدر شعبۂ اردو و ڈین ہیومینٹیز رانچی یونیورسٹی نے احمد سجاد پر اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ہمایوں احمد، ایم، بی، بی، ایس، (ریٹائرڈ) ریمس، رانچی ڈاکٹر خالد سجاد، سابق صدر شعبہ اردو، کنور سنگھ کالج، متھلا یونیورسٹی دربھنگہ، جناب نورالزماں خاں، ناظم، مدرسہ جامعۃ النساء، جمشید پور، جناب محمد حذیفہ، اسسٹنٹ پروفیسر، داؤدنگر کالج داؤد نگر، اورنگ آباد (بہار) اور ڈاکٹر روبینہ نسرین، اسسٹنٹ پروفیسر، رام لکھن سنگھ یادو کالج، رانچی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر رسالہ 'اساس تہذیب' میں خصوصی گوشہ بعنوان 'پروفیسر احمد سجاد' کی رسم رونمائی موقر مہمانوں کے ذریعہ عمل میں آئی۔

اس کنوکیشن میں 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت تعلیم، حکومت ہند' اور 'نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرانکس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی حکومت ہند' کے اشتراک سے چلایا جانے والا ایک سالہ کمپیوٹر ڈپلومہ کورس میں کامیاب ہونے والے کل 117 طلبا و طالبات کو سند اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر طارق سجاد، سینٹر انچارج (CABA-MDTP)، رانچی 2 جولائی 2026

مغربی بنگال

تبصرہ نگاری و کیٹلاگنگ

کولکاتا: شعبۂ اردو، کلکتہ گرلس کالج کے زیر اہتمام اور دی مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا کے اشتراک سے سمسٹر

چہارم کی طالبات کے لیے منعقدہ آٹھ روزہ سمر انٹرن شپ برائے 'تبصرہ نگاری و کیٹلاگنگ' کا افتتاحی اجلاس ڈاکٹر ستیہ اپادھیائے (پرنسپل کلکتہ گرلس کالج) کی صدارت میں ہوا جس کا اختتامی اجلاس 24 جون 2026 کو دی مسلم انسٹی ٹیوٹ کے کمپیوٹر روم میں منعقد ہوا۔ اس تربیتی پروگرام کا مقصد طالبات میں تنقیدی شعور، مطالعے کا ذوق اور تبصرہ نگاری کی عملی مہارت پیدا کرنا تھا۔

پروگرام کا آغاز شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد امتیاز احمد کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے تمام معزز مہمانوں، اساتذۂ کرام اور طالبات کا استقبال کرتے ہوئے اس آٹھ روزہ انٹرن شپ کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ انھوں نے طالبات کی محنت، لگن اور مستقل حاضری کو سراہتے ہوئے کہا کہ تمام طالبات نے پورے انہماک اور سنجیدگی کے ساتھ تربیتی نشستوں میں شرکت کی۔

اس موقعے پر دی مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی جنرل سیکرٹری اور شعبۂ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر نعیم انیس نے خطاب کرتے ہوئے طالبات کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے کہا کہ تبصرہ نگاری محض ایک تعلیمی مشق نہیں بلکہ مطالعے اور تنقیدی فکر کو فروغ دینے کا موثر ذریعہ ہے۔ انھوں نے طالبات کو خوشخبری دی کہ انٹرن شپ کے دوران طالبات کی جانب سے کتابوں پر لکھے گئے منتخب تبصرے بزم ادب کے ادبی و فکری جریدے 'فکر و تحریر' کے آئندہ شمارے میں شائع کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر نعیم انیس نے مزید کہا کہ اردو ادب کا مقصد صرف زبان کی ترویج نہیں بلکہ قوم و ملت کی تعلیمی، سماجی اور ادبی خدمت بھی ہے، اور ایسے تربیتی پروگرام نوجوان نسل کو مستقبل کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔

دی مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اسسٹنٹ جنرل سیکرٹری جناب شیخ نذر الاسلام نے اپنے خطاب میں کہا کہ طالبات نے جس دلجمعی اور سنجیدگی کے ساتھ اس پروگرام میں حصہ لیا ہے، یقیناً وہ یہاں سے قیمتی علمی اور عملی تجربات حاصل کر کے جائیں گی۔

شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس تربیتی پروگرام میں طالبات کو رپورٹنگ، بک ریویو (تبصرۂ کتب) اور کتابوں کی خانہ بندی جیسے اہم موضوعات سے عملی طور پر روشناس کرایا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ مستقبل میں ان موضوعات سے متعلق سوالات اور عملی سرگرمیوں کے ذریعے طالبات کی استعداد کا مزید جائزہ لیا جائے گا۔ انھوں نے طالبات کو مشورہ دیا کہ وہ مطالعے اور رضاکارانہ سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تاکہ مزید علمی فوائد حاصل کر سکیں۔ اجلاس میں طالبات نے بھی اپنے تاثرات اور تجربات کا اظہار کیا۔

اختتامی اجلاس کی مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سنچیتا دے (شعبۂ تعلیم، کلکتہ گرلس کالج) نے اپنے خطاب میں طالبات کو وقت کی پابندی، موثر ترسیل و ابلاغ اور پیشہ ورانہ اخلاقیات سے متعلق اہم نکات سمجھائے۔ انھوں نے کہا کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے صرف علم کافی نہیں بلکہ نظم و ضبط، بہتر ابلاغ اور ذمہ داری کا احساس بھی ضروری ہے۔

پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر وثیق الارشاد علی القادری نے اظہارِ تشکر پیش کرتے ہوئے تمام مہمانانِ گرامی، مقررین، اساتذۂ کرام، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داران اور طالبات کا شکریہ ادا کیا۔

اعزاز و اکرام

ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ

میرٹھ: ڈاکٹر انجم جمالی میموریل فاؤنڈیشن کے بینر تلے سترہویں سالانہ ایوارڈز کی تقریب 6 جون کو ایوان

صنعت و تجارت کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ تقریب کے دوران مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ معروف فلمی اداکار رضا مراد کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر انھوں نے ادیبوں کی صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں معاشرے کے لیے مشعل راہ قرار دیا اور کہا کہ ادیب معاشرے کی قیادت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ ان شخصیات کو دیا جاتا ہے جنھوں نے ادب، ماحولیات اور صحافت کے شعبوں میں نمایاں کام کیا ہو۔ دیپکا کو ماحولیاتی فضیلت کا ایوارڈ

ملا۔ ایم وائی انصاری اور ممتاز کو بالترتیب صحافت اور میڈیا کے لیے ایوارڈ ملے جب کہ خوشبو شرما کو شاعری اور ساہتیہ پال ستیم کو شاعری کے لیے ایوارڈ ملا۔ ڈاکٹر وشال اور مزاح نگار ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی نے شمع روشن کرکے پروگرام کا آغاز کیا۔ پروگرام کوآرڈینیٹر اور فاؤنڈیشن کے سکریٹری انجینئر رفعت جمالی نے ڈاکٹر انجم جمالی کی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ غزل گلوکارہ رجنی نے ڈاکٹر انجم جمالی کی لکھی ہوئی نظم پیش کی۔ پروگرام کی صدارت چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے چیئرپرسن ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی اور خوشبو شرما نے کامیابی کے ساتھ نظامت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 جون 2026

حضرت سعدی دکنی برہان پوری ایوارڈ

برھانپور: دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی برہانپور کے دس سالہ جشنِ تکمیل کے موقعے پر ایک شاندار

اور یادگار تقریب کا انعقاد 21 جون 2026 بروز اتوار شام 8 بجے عبدالرحمٰن ہال، انصار نگر، برہانپور میں عمل میں آیا۔ اس پروقار تقریب میں شہر کی علمی، ادبی، سماجی، صحافتی اور دینی شخصیات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ دارالسرور سوسائٹی کے دس سالہ سفر کی تکمیل کے موقعے پر مختلف علمی، ادبی، ثقافتی اور فلاحی سرگرمیوں کا بھی انعقاد کیا گیا تھا۔ ان میں مضمون نگاری کا مقابلہ بھی شامل تھا۔ تمام ایکٹیویٹیز میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے شرکا طلبا و طالبات کو تقریب کے دوران اعزازات، اسناد اور انعامات سے نوازا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت شہر کی معروف سیاسی و سماجی شخصیت محترم قاضی حمیدالدین صاحب (سابق ایم ایل اے) نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ضمیر اطہر و عمران انصاری نے انجام دیے۔

تقریب میں ملک کے مختلف شہروں سے تشریف لانے والی ممتاز شخصیات میں ڈاکٹر عبدالکریم سالار صاحب (صدر اقراء ایجوکیشن سوسائٹی، جلگاؤں)، محترم فیروز کمال صاحب (مالک کمال پبلکیشن، جبلپور)، محترم مشیر احمد انصاری صاحب (مدیر ماہنامہ اردو آنگن، ممبئی)، محترم پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب (آنریری سکریٹری اے ٹی ٹی ایجوکیشنل کیمپس، صدر سی سی آئی وصدر انجمن ترقی اردو ہند شاخ مالیگاؤں)، محترم ایڈوکیٹ عبدالعظیم خان صاحب (معروف سینئر وکیل مالیگاؤں کورٹ)، محترم ڈاکٹر ایوبی معاذ احمد صاحب (رکن انتظامیہ سٹیزن ویلفیئر ایجوکیشن سوسائٹی، مالیگاؤں) کو ان کی تعلیمی، ادبی، سماجی اور فلاحی خدمات کے اعتراف میں سوسائٹی کی جانب سے 'حضرت سعدی دکنی برہانپوری ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ اردو کے اولین شاعر اور ریختہ کے موجد حضرت سعدی دکنی برہان پوری کے نام سے منسوب تھا۔

اس موقعے پر پروانہ برہانپوری کے ادبِ اطفال سے متعلق ناول 'پراسرار حویلی اور چار کمسن جاسوس' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ تقریب کے اختتام پر سوسائٹی کے ذمہ داران نے تمام مہمانوں، شرکا، معاونین اور میڈیا نمائندگان کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: تنویر رضا برکاتی، برہانپور، 4 جولائی 2026

سہیل اقبال

سہارنپور: مقامی بلاسم گروپ آف فرینڈس سہارنپور کے زیر اہتمام دو روز قبل ایک پروقار ادبی شعری تقریب

میں سہارنپور کے کہنہ مشق استاد شاعر مرحوم کوثر تسنیمی کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اس ادبی اور شعری محفل کی صدارت سابق پرنسپل اسلامیہ انٹر کالج سہارنپور پروفیسر جلال عمر نے فرمائی جب کہ نظامت خرم سلطان نے کی۔

اس موقعے پر اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر جلال عمر نے کہا کوثر تسنیمی کی شاعری معاصر اردو ادب میں اپنی فکری گہرائی، سادہ بیانی اور جذباتی تاثیر کے باعث نمایاں مقام رکھتی ہے، ان کے کلام میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی نہایت خوبصورتی سے ملتی ہے، ان کی شاعری میں عشق، انسان دوستی، اخلاقی اقدار اور روحانی احساسات کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، جو قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ کوثر تسنیمی کے اشعار میں زبان کی شگفتگی اور اسلوب کی روانی نمایاں ہے، جس کی وجہ سے ان کا کلام عام اور خاص دونوں طبقوں میں مقبول ہے۔ پروگرام کنوینر اور کوثر تسنیمی کے شاگرد اور جانشین آصف شمشی نے کہا کہ کوثر تسنیمی کی شاعری میں سادہ مگر بلیغ الفاظ کا استعمال ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہے، جس سے معنی میں وسعت اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں مذہبی اور روحانی عناصر بھی نمایاں ہیں، جو قاری کے اندر فکری اور اخلاقی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ کوثر تسنیمی کی شاعری فنی حسن، فکری وسعت اور انسانی اقدار کا حسین امتزاج ہے، جو اردو ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ شمار ہوتی ہے۔

اس موقعے پر ریاض سے تشریف لائے صاحب دیوان شاعر سہیل اقبال کو تنظیم کے عہدیداران واراکین نیز شعرائے سہارنپور کی جانب سے کوثر تسنیمی اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کو ایک شال اور بطور یادگار ایک مومنٹو پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'تاثیر'، 19 جون 2026

ڈاکٹر ظفر الاسلام

نئی دھلی: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی اور غالب

انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے مشترکہ زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار ہال میں ایک علمی و فکری مذاکرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں مجموعہ رسائل شاہ ولی اللہ جلد دہم پر تفصیلی گفتگو کے ساتھ مجموعہ ہائے رسائل شاہ ولی اللہ کا باضابطہ اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اپنا چھٹا امام شاہ ولی اللہ

ایوارڈ معروف دانشور اور سابق چیئرمین دہلی اقلیتی کمیشن ڈاکٹر ظفرالاسلام خان کو پیش کیا گیا۔تقریب کی صدارت وشرکت کرنے والی ممتاز شخصیت میں ڈاکٹر ظفرالاسلام خان، پروفیسر اخترالواسع، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، جسٹس اقبال احمد انصاری، سراج حسین اور محمد ادیب شامل تھے، جب کہ معروف صحافی وادیب معصوم مرادآبادی نے نظامت کی۔اس موقع پر سہیل انجم نے کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کا قیام اور اس کی علمی خدمات دراصل اس کے بانی مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کی مسلسل محنت،عزم اور علمی بصیرت کا نتیجہ ہیں۔انھوں نے کہا کہ مولانا قاسمی نے محدود وسائل کے باوجود ایک ایسا تحقیقی ادارہ قائم کیا ہے جو شاہ ولی اللہ دہلوی کے نادر و نایاب علمی ذخیرے کو نئی نسل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔مذاکرے کے مقررین نے اپنے تاثرات میں مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کی علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ'ہماراسماج'، دہلی 30 جون 2026

معصوم مرادآبادی

حیدرآباد: ممتاز صحافی اور کالم نگار معصوم مرادآبادی کو اردو صحافت کے میدان میں خدمات کے لیے تلنگانہ

میڈیا اکیڈمی میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔حیدرآباد کی سرکردہ تنظیم سی ای ٹی فاؤنڈیشن کی طرف سے یہ ایوارڈ جید صحافی نسیم عارفی مرحوم کی یاد میں شروع کیا گیا ہے،جس کا انتخاب ملک گیر سطح کی سرکردہ شخصیات پر مشتمل جیوری کرتی ہے۔معصوم مرادآبادی گذشتہ چالیس برسوں سے اردو صحافت سے وابستہ ہیں۔ ان کی اب تک دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔انھیں اب تک دہلی، اترپردیش اور مغربی بنگال کی اردو اکیڈمیاں صحافتی خدمات کے لیے ایوارڈ سے نواز چکی ہیں۔ وہ اب تک یورپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے متعدد شہروں کا صحافتی سفر کر چکے ہیں۔

سی ای ٹی فاؤنڈیشن نے اس موقع پر چار دیگر صحافیوں کو بھی اعزاز سے نوازا ہے۔ان میں روزنامہ 'انقلاب' (نارتھ) کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر یامین انصاری اور دہلی کی سرکردہ صحافی روہنی سنگھ کے علاوہ تلنگانہ کے دو صحافی فضل بیگ اور فوٹو گرافر محمد علیم الدین شامل ہیں۔ یہ ایوارڈ آج یہاں تلنگانہ میڈیا اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں سابق سفیر ڈاکٹر اوصاف سعید، سابق ڈی جی پی اے کے خان اور تلنگانہ میڈیا اکیڈمی کے صدر سری نواس ریڈی نے پیش کیے۔اس موقع پر سی ای ٹی فاؤنڈیشن کے روح رواں سید بشارت علی اور ایوارڈ کمیٹی کے سرکردہ رکن عامر اللہ خاں بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز: معصوم مرادآبادی، دہلی، 25 جون 2026

طالب رامپوری

نئی دہلی: اردو ادب اور شعری روایت کے فروغ کے لیے منعقد ایک شاندار اور یادگار ادبی تقریب میں

معروف شاعر و ادیب طالب رامپوری کو 'گرو سمان' سے نوازا گیا، جب کہ ممتاز شاعر برہم بھردواج 'حشمت' کی دو شعری کتابوں کی پروقار رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ اس ادبی تقریب میں ملک بھر کے معروف شعرا، ادبا، دانشوروں اور ادب نواز شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے عزم کا اظہار کیا۔تقریب کی صدارت سینئر ادیب و شاعر دکشت ڈنکوری نے کی جب کہ کتابوں کا تعارف اور خصوصی خطبہ شفیع ایوب نے پیش کیا۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر معین شاداب نے انجام دیے۔مقررین نے طالب رامپوری کی ادبی خدمات، اردو زبان و ادب کے فروغ میں ان کے نمایاں کردار اور نئی نسل کی تربیت و رہنمائی میں ان کی کوششوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسے اہل قلم کا احترام دراصل علم و ادب کا احترام ہے۔تقریب میں عقیل احمد، منیر ہمدم، ناصر عزیز اور ایڈوکیٹ رئیس فاروقی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

اس موقع پر ایڈوکیٹ رئیس فاروقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ادب ہماری مشترکہ تہذیبی وراثت ہے اور اسے محفوظ رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔انھوں نے کہا کہ نئی نسل کو اردو زبان اور ادب سے جوڑنے کے لیے ادبی تقریبات، مشاعروں اور کتابوں کی اشاعت کو فروغ دینا ناگزیر ہے۔ مقررین نے ایڈوکیٹ رئیس فاروق کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس ادبی تقریب کے انعقاد کا اور کامیابی میں ان کا اہم اور موثر کردار رہا ہے۔ اس موقع پر ممتاز شاعر برہم بھردواج 'حشمت' کی دو شعری کتابوں کی رسم اجرا انجام دی گئی۔مقررین نے کتابوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان تصانیف میں عصری شعور، انسانی جذبات، تہذیبی اقدار، سماجی مسائل اور ادبی لطافت کا حسین امتزاج موجود ہے۔

روزنامہ 'ہماراسماج' دہلی، 8 جون 2026

ادب سلسلہ

نئی دہلی: سہ ماہی 'ادب سلسلہ' کے تازہ خصوصی شمارہ 'سفرنامہ نمبر' کی رونمائی شعبہ اردو کے صدر پروفیسر کوثر مظہری کے ہاتھوں انجام پائی۔تقریب رونمائی کے دوران شرکا نے اس خصوصی اشاعت کی تحقیقی و ادبی افادیت پر

اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسے معیاری اور موضوعاتی شمارے اردو ادب کی تنقیدی و تحقیقی روایت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔مقررین نے اس امر پر بھی زور دیا کہ ادبی رسائل کسی بھی زبان کی فکری زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں اور 'ادب سلسلہ' نے اپنے سنجیدہ اور معیاری انتخاب کے ذریعے اردو صحافت و ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔اس موقع پر صدر شعبہ پروفیسر کوثر مظہری، سلیم علیگ، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر خان محمد رضوان، ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی سمیت متعدد اساتذہ کرام اور اہل علم موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جولائی 2026

رسم اجرا

آئین ہند: ایک فکری مطالعہ

نئی دھلی: قانون داں اور جمعیت علما ہند کے قانونی مشیر مولانا سید کعب اشہد رشیدی کی تصنیف 'آئین ہند:

ایک فکری مطالعہ' کی رسم اجرا کی تقریب کانسٹی ٹیوشن کلب آف انڈیا، نئی دہلی میں منعقد ہوئی، جس میں علمی، دینی، قانونی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی اور کتاب کو موجودہ دور میں آئینی شعور کی بیداری کے لیے اہم قرار دیا۔ تقریب کی صدارت جمعیت علماء ہند اتر پردیش کے صدر مولانا سید اشہد رشیدی نے کی۔ اپنے خطاب میں مولانا سید اشہد رشیدی نے کہا کہ آئین ہند وہ دستاویز ہے جو مختلف مذاہب، افکار اور نظریات رکھنے والے ملک کے عوام کو ایک دھاگے میں جوڑے ہوئے ہے۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد اور دستور سازی میں اکابرین کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی جس مٹی کو بھی سونگھا جائے اس سے بزرگوں کے خون کی خوشبو محسوس ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک کو آزاد کرانے، آئین کی تشکیل اور جمہوری نظام کو مضبوط بنانے میں مدارس اسلامیہ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں مدارس کو مختلف چیلنجوں کا سامنا ہے اور ایسے حالات میں 'آئین ہند: ایک فکری مطالعہ' اہم دستاویز کے طور پر سامنے آئی ہے۔ کتاب میں آئین ہند اور اس کی مختلف دفعات کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ عام لوگ بھی اپنے آئینی حقوق اور ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں۔ مولانا ڈاکٹر شکیب قاسمی نے کہا کہ دینی اور عصری علوم کے درمیان فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اس نوعیت کی علمی کاوشیں ضروری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب آئین ہند کے بنیادی تصورات کو سادہ انداز میں پیش کرتی ہے اور نئی نسل کو آئین کی روح سے واقف کرانے میں مددگار ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر نے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں، خصوصاً طلبہ کے لیے آئین سے واقفیت حاصل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ بابا نظر محمد خان نے کتاب کو قومی یکجہتی اور آئینی شعور کے فروغ کی جانب مثبت قدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ آئین تمام شہریوں کے حقوق کا ضامن ہے اس لیے اس کا مطالعہ ہر طبقے کے لیے ضروری ہے۔ ایڈوکیٹ ایچ آر خان نے کہا کہ مصنف نے پیچیدہ آئینی مباحث کو سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا ہے جس سے عام قاری بھی آئین کے بنیادی نکات کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ایڈوکیٹ سیماب قیوم نے کہا کہ ملک میں آئینی تعلیم اور قانونی بیداری کے فروغ کے لیے اس نوعیت کی کتابوں کی اشاعت خوش آئند ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ تصنیف علمی اور قانونی حلقوں میں اہمیت کی حامل ثابت ہوگی۔ تقریب کے دوران مقررین نے کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ تصنیف آئین فہمی اور جمہوری اقدار کے فروغ میں معاون ثابت ہوگی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جون 2026

ادبی نگارشات

حاجی پور: اصلاح ملت کمیٹی ویشالی کے زیر اہتمام ڈاکٹر ظفیر الدین انصاری سابق صدر شعبہ اردو للت

نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کی تصنیف کردہ کتاب 'ادبی نگارشات' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ مذکورہ پروگرام شہر واقع باغ ملی انجان پیر چوک کے جانب پچھم مہارانا پرتاپ میریج ہال کے وسیع احاطے میں پروفیسر فاروق احمد صدیقی صدر سابق صدر شعبہ اردو بہار یونیورسٹی مظفر پور کی صدارت اور ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کی نظامت میں انجام پزیر ہوا۔ کتاب 'ادبی نگارشات' کی رسم اجرا کی ادائیگی جناب ایس ایم پرویز عالم ایڈیشنل سکریٹری بشمول ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ کابینہ سکریٹریٹ پٹنہ کے ہاتھوں اور چند مہمانان کرام کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے ڈاکٹر ظفیر الدین میں پر انصاری کی تصنیف کردہ دوسری کتاب 'ادبی نگارشات' کے تعلق سے بیش بہا قیمتی کلمات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب سے نئی نسل کو بہت ساری جانکاریاں حاصل ہوں گی۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی جناب پروفیسر اعجاز علی ارشد (سابق وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی پٹنہ) نے پروفیسر عبد المغنی اور غلام سرور مرحوم کے ذریعے کیے گئے اردو کی خدمات کو سراہا اور کہا کہ ان کے ساتھ کئی رفقا شامل تھے۔ آپسی اتحاد قائم تھا اور اردو زبان کے حق وحقوق کے لیے مل جل کر جو خدمات انجام دیں اسے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو آبادی کو ان کی خدمات کو یاد رکھنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر عید محمد انصاری سابق پرووائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی پٹنہ نے اپنے خطاب میں ڈاکٹر ظفیر الدین انصاری کی کتاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب بہت ہی کارآمد ہے۔ اس کے مطالعے سے قاری کو اہم معلومات کی واقفیت ہوگی۔ اس موقع سے ڈاکٹر ریحان غنی چیف ایڈیٹر روزنامہ تصدیق پٹنہ، ڈاکٹر اسلم جاوداں ناظم اعلیٰ اردو کونسل ہند پٹنہ، جناب فخر الدین عارفی جنرل سکریٹری حلقہ ادب پٹنہ مولانا ڈاکٹر جناب شکیل احمد قاسمی سابق صدر شعبہ اردو اورینٹل کالج پٹنہ، جناب محمد رفیع کنوینر قومی اساتذہ تنظیم بہار اور ماسٹر محمد عظیم الدین انصاری صدر اصلاح ملت کمیٹی ویشالی نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے سے اس کتاب پر پرمغز تبصرہ سید مصباح الدین احمد حاجی پور اور مولانا نظر الہدی قاسمی رازی نے پیش کیا۔ اس موقعے پر کاروان ادب حاجی پور کے سکریٹری جناب انوار الحسن وسطوی نے تفصیلی خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ صاحب کتاب

ڈاکٹر ظفیر الدین انصاری نے تمام آئے ہوئے مہمان وشرکا حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا اور موصوف کے اظہار تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 جون 2026

تقریب رونمائی ومحفل مشاعرہ

کٹیہار: ریاست بہار کے مردم خیز خطۂ سیمانچل کے ضلع کٹیہار میں ادارہ بمقام صارم منزل 'سخن' کے زیراہتمام ایک شاندار تقریب رونمائی ومحفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں ریاست کے ممتاز ادبا، شعرا، ناقدین اور ادب نواز حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس تقریب کی صدارت معروف ادیب پروفیسر ڈاکٹر عبداللطیف حیدری نے فرمائی، اس موقعے پر معروف شعرا محمد ابراہیم سجاد تیمی کے غزلیہ مجموعہ 'تیرے لیئے' اور عذیق الرحمٰن صارم کے دو شعری مجموعوں 'زیرعتاب' اور 'ٹھکرائے ہوئے' کی باضابطہ رونمائی انجام دی گئی۔ ادبی حلقوں نے ان تینوں کتابوں کو اردو ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دیتے ہوئے مصنّفین کو مبارکباد پیش کی۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ شاعری صرف الفاظ کی ترتیب کا نام نہیں بلکہ انسانی احساسات، مشاہدات اور تجربات کی ترجمان ہوتی ہے جب کہ ایک معیاری شعری مجموعہ اپنے عہد کی تہذیبی اور فکری تاریخ بھی محفوظ کرتا ہے۔ رونمائی کے بعد منعقدہ تبصرہ نشست میں انعام الحق مدنی، ڈاکٹر رحمت اللہ سلفی اور شیخ مشتاق احمد ندوی نے تینوں شعری مجموعوں کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ پیش کیا۔ مقررین نے مصنفین کی فکری پختگی، شعری اسلوب اور ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی کاوشوں کو قابل قدر قرار دیا۔ مختصر وقفۂ چائے کے بعد محفل مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں تقریباً 20 ممتاز شعراء کرام نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 جولائی 2026

ضعیفی کی آزمائشیں

نئی دھلی: ڈاکٹر گوپا جوشی اور ڈاکٹر اومکار متل کی تصنیف 'ضعیفی کی آزمائشیں' کی رسم اجرا اور کتاب کے مندرجات پر ایک مذاکرے کا اہتمام انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) میں کیا گیا۔ مذاکرے کی صدارت سول سوسائٹی نیٹ ورک کے بانی وروح رواں ڈاکٹر طارق اشرف نے کی جب کہ تقریب کی نظامت آئی او ایس سینٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر کے کنوینر انجم نعیم نے انجام دی۔ معاصر معاشرے میں بزرگ افراد کو درپیش مسائل کا جائزہ لینے اور ان کے حل کی طرف رہنمائی فراہم کرنے والی اس کتاب کا اردو ترجمہ سہارنپور کے معروف سماجی کارکن ارشد قریشی نے کیا ہے۔ اس ترجمے کا مقصد مصنّفین کے تجربات اور مشاہدات کو اردو قارئین کے وسیع حلقے تک پہنچانا ہے۔ مذاکرے کا اہتمام آئی او ایس سینٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر نے سول سوسائٹی نیٹ ورک کے اشتراک سے کیا تھا۔ اس موقعے پر مقررین نے بڑھاپے سے متعلق بڑھتے ہوئے مسائل پر روشنی ڈالی۔ بالخصوص سماجی تنہائی، صحت کی دیکھ بھال کی ضرورت، معاشی عدم تحفظ، جذباتی معاونت اور خاندانی معاونتی نظام کی بدلتی ہوئی صورت حال گفتگو کے اہم موضوعات رہے۔ انجم نعیم نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ یہ کتاب بزرگ شہریوں کو درپیش مسائل کے بارے میں قیمتی بصیرت فراہم کرتی ہے اور بزرگوں کی دیکھ بھال اور سماجی ذمہ داری کے موضوع پر ایک بامعنی اضافہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اردو کے مفید لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مذاکرے کی نظامت صحافی وشاعر ارشد ندیم نے کی، جب کہ مقررین میں صحافی شعیب رضا فاطمی، اسلم احمد ایڈوکیٹ اور معروف سماجی کارکن انیتا بھارتی شامل تھیں۔ مقررین نے کتاب کے مواد، اسلوب اور زبان کو سراہتے ہوئے ضعیف افراد کو درپیش مسائل کے حوالے سے عوامی بیداری پیدا کرنے اور بہتر پالیسی سازی کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کتاب محققین، سماجی کارکنوں، پالیسی سازوں اور بڑھاپے کے مسائل کو سمجھنے میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے ایک اہم حوالہ ثابت ہوگی۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر طارق اشرف نے اس اہم سماجی موضوع کی جانب توجہ مبذول کرانے پر مصنّفین اور مترجم کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ کتاب کے مترجم ارشد قریشی نے عصری سماجی مسائل پر مفید ادب کی تخلیق اور تحقیقی اشاعتوں کی اہمیت پر زور دیا۔ شرکائے مذاکرہ میں عظیم اختر، معین الدین جینبی، ارشد کریم، صفی اختر، عبدالمنان (ایڈیٹر آجکل)، راکھی گپتا اور بزرگ شہریوں کی بڑی تعداد شامل تھی۔ تقریب کا اختتام حاضرین کے ساتھ ایک انٹرایکٹو سیشن اور کنوینر کے کلمات تشکر پر ہوا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جون 2026

درپن

سنت کبیر نگر: منہداول کے شاعر اور مصنف بی این پانڈے 'مدھو' کی تحریر کردہ 'درپن' کا اجرا 14 جون کو ڈی اے وی انٹر کالج کے دیانند سرسوتی ہال میں عمل میں آیا۔ کتاب کا جائزہ لینے والے دنیش گورکھپوری کہتے ہیں ''یہ کتاب منہداول کے ادبی کام کا ثبوت ہے'' یہ سفر میں ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔'' گورکھپور اور بستی کے مصنّفین کے درمیان ایک کامیاب کتاب کی رونمائی تقریب منعقد ہوئی، بشمول منہداول، بی این پانڈے کو اتر پردیش ساہتیہ گورو سمان 2026 اور اتر پردیش ہندی ساہتیہ سنستھان کی طرف سے نقد انعام سے نوازا گیا۔ ان کی تخلیقات متعدد رسالوں، اخبارات، مشترکہ مجموعوں اور یادگاروں میں شائع ہوچکی ہیں۔ اس تقریب میں درجنوں سامعین نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت گری راج سنگھ نے کی اور نظامت شیام کارتیکیہ نے کی۔ پروگرام کے آخر میں بی این پانڈے نے تشریف لائے تمام سامعین اور ادیبوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 15 جون 2026

لیڈیز پرس

لکھنؤ: ادبی تخلیقات وفن پارے لوگوں کو نہ صرف محظوظ کرتے ہیں بلکہ ان کی ادبی تسکین کا وسیلہ بھی بنتے ہیں۔ نظم ونثر دونوں اپنی تاثیر رکھتے ہیں۔ اسی ضمن میں انشائیہ کی بھی اپنی اہمیت وحیثیت ہے۔ انشائیہ میں طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کا عنصر، دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے توسط سے بہت سنجیدہ بات بھی مزاحیہ پیراہن میں کی جاسکتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے ڈاکٹر شاہدہ صدیقی سحر برنی کے تازہ مجموعہ انشائیہ (لیڈیز پرس) کی رونمائی کے موقعے پر کیا۔ رونمائی کی یہ تقریب مدرسہ حیات العلوم فرنگی محل میں احمد ابراہیم علوی کی صدارت میں ہوئی جس میں سبکدوش آئی اے ایس ڈاکٹر انیس انصاری نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ تقریب میں ڈاکٹر اسرارالحق قریشی نے انشائیہ نگاری ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہدہ صدیقی کی انشائیہ نگاری پر روشنی ڈالی۔ گورنر اتر پردیش واتراکھنڈ کے سابق انفارمیشن افسر، معمر قلمکار ڈاکٹر سلمان علی خان کا مقالہ شکیل گیاوی

نے پیش کیا۔ خلیل احسن نے شاہدہ صدیقی اور ان کے اجداد خصر برنی کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر منصور حسن خان اور ساجدہ صبا نے اپنا کلام پیش کیا۔ ڈاکٹر شاہدہ صدیقی نے اپنے ادبی ذوق اور اس کی تسکین کے حوالے سے پنے قلمی خدمات کے آغاز پر روشنی ڈالی۔ احمد ابراہیم علوی نے ادب اور انشائیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یونیورسٹیوں اور اکادمیوں میں تحقیقی کاموں کی زبوں حالی پر تشویش کا ظہار کیا۔ تقریب کی نظامت محمد غفران نسیم نے کی اور شکریہ بزم خواتین کی صدر بیگم شہناز سدرت نے ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 جولائی 2026

وفیات

مولانا سید سلمان حسینی ندوی

لکھنؤ: بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم دین، سابق رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، دارالعلوم ندوۃ العلما کے سابق استاذ اور اردو، عربی و فارسی زبانوں میں درجنوں کتابوں کے مصنف مولانا سید سلمان الحسینی الندوی کا طویل علالت کے بعد 29 جون 2026 بروز پیر فجر کی نماز سے قبل انتقال ہوگیا۔ انھوں نے لکھنؤ میں آخری سانس لی۔ ان کی عمر تقریباً 74 برس تھی۔ اطلاعات کے مطابق ان کی نمازِ جنازہ جامعہ سید احمد شہید کٹولی ملیح آباد میں 29 جون 2026 کو بعد نماز عصر ادا کی گئی۔ جامعہ میں ہی سپرد خاک کیا گیا۔ مولانا سید سلمان حسینی ندوی 1952 میں ایک علمی و دینی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ انھیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسینی ندوی کی خصوصی تربیت اور سرپرستی حاصل رہی۔ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے حاصل کرنے کے بعد انھوں نے حدیث، دعوت اور اسلامی علوم میں تخصص کیا۔ بعدازاں امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی، ریاض سے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور علم حدیث میں تحقیقی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے کئی دہائیوں تک دارالعلوم ندوۃ العلما میں تدریسی خدمات انجام دیں، جہاں وہ استاذ، حدیث اور بعد میں فیکلٹی آف دعوت کے ڈین بھی رہے۔ اس دوران ہزاروں طلبہ نے ان سے حدیث، فقہ، دعوت اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم اور دعوت کے فروغ کے لیے مولانا نے جامعہ سید احمد شہید کٹولی کی بنیاد رکھی، جہاں دینی اور عصری تعلیم کے امتزاج کو فروغ دیا گیا۔ اس کے علاوہ وہ متعدد تعلیمی، سماجی اور رفاہی اداروں کی سرپرستی اور قیادت سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے بچیوں اور بچوں کی تعلیم کے لیے مختلف مدارس قائم کیے، جب کہ یونانی میڈیکل کالج سمیت دیگر تعلیمی منصوبوں کی بھی سرپرستی کی۔ مدرسے کے ایسے طلبہ جو ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے، ان کے لیے خصوصی کوچنگ کا بھی انتظام کیا گیا، جہاں شاہین گروپ کے تعاون سے سیکڑوں طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔

مولانا عربی، اردو اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے سیرت، حدیث، فقہ اور معاصر مسائل پر درجنوں کتابیں اور تحقیقی مقالات تصنیف کیے، جن سے ملک و بیرون ملک کے علمی حلقوں نے استفادہ کیا۔ مولانا کی مشہور کتابوں میں مذکراتی (خودنوشت)، خطبات بنگلور، خطبات سیرت، سفرنامہ ایک طالب علم کا، ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مولانا سید سلمان حسینی ندوی کے انتقال پر مختلف علمی، دینی اور ادبی حلقے بالخصوص ندوۃ العلما کے اساتذہ، طلبہ اور ان کے چاہنے والوں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 30 جون 2026

پروفیسر ظہیر حسن جعفری

دہلی: ممتاز مورخ پروفیسر ظہیر حسین جعفری کا 14 جولائی 2026 کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً دو برس سے بستر علالت پر تھے۔ پروفیسر جعفری دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سابق استاذ تھے اور ان کا شمار نہایت لائق اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ان کے بڑے بھائی پروفیسر نقی حسین جعفری مرحوم کا تعلق بھی اسی شعبے سے تھا اور وہ اساتذہ کی کل ہند تنظیم کے عہدے دار تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیض یافتہ پروفیسر جعفری ایک ممتاز محقق، نہایت شائستہ و باوقار شخصیت اور علم و فضل کے پیکر تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا اور ان کی تدفین ان کے آبائی شہر سلون، ضلع رائے بریلی (یوپی) میں ہوئی۔ وہ سلون کی معروف خانقاہ سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی علمی خدمات، انکساری اور خوش اخلاقی کے باعث ہر خاص و عام میں عزت، احترام اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا انتقال علمی دنیا بالخصوص علیگ برادری کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ وہ ہمیشہ محبت و احترام کے ساتھ یاد کیے جائیں گے اور ان کی کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔

بہ شکریہ: معصوم مرادآبادی، دہلی، 14 جولائی 2026

مہ جبیں اختر

دہلی: ترقی اردو بیورو (موجودہ قومی اردو کونسل) کی رکن مہ جبیں اختر کا 15 جون 2026 کو دہلی میں 72 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین دہلی گیٹ کے قبرستان میں ہوئی۔ وہ سنجیون اسپتال میں زیرعلاج تھیں۔ ان کی پیدائش 14 اکتوبر 1953 کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام جناب مولانا رونق علی صدیقی تھا۔ مہ جبیں نے ایم اے (اردو) اور بی لب دہلی یونیورسٹی سے کیا۔ انھوں نے نومبر 1978 سے مارچ 1998 تک ترقی اردو بیورو میں بحیثیت ریسرچ اسسٹنٹ کام کیا۔ اس کے بعد وہ نیشنل گیلری آف موڈرن آرٹ چلی گئیں اور وہاں اپریل 1998 سے اکتوبر 2013 تک بحیثیت اسسٹنٹ لائبریری اینڈ انفارمیشن آفیسر (ALIO) کام کیا اور وہیں سے ریٹائر ہوئیں۔ انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے کیے جیسے 'عہدۂ ناظم کتب خانہ داری: ایک تعارف' و 'ذرائع نقل و حمل کی ابتدا' اور 'تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)'، تینوں کتابیں ترقی اردو بیورو سے ہی شائع ہوئی ہیں۔ انھوں نے اردو انگریزی میں کئی مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ مہ جبیں اختر نے قومی اردو کونسل کے ذریعے شائع کردہ 'جامع انگلش- اردو

ڈکشنری' کی مشترکہ تدوین بھی کی ہے۔ انھیں ان کی خدمات کے عوض اترپردیش اردو اکیڈمی نے اردو ترجمے کے ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔

بدست: عدنان، دہلی، 2 جولائی 2026

ڈاکٹر مشتاق انصاری

نئی دہلی: سینئر صحافی، ممتاز سماجی کارکن اور فیس گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر مشتاق انصاری کا انتقال ہوگیا۔ وہ دو ماہ سے گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً 55 برس تھی۔ ڈاکٹر مشتاق انصاری نے صحافت اور سماجی خدمت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ فلاحی سرگرمیوں، عوامی مسائل کے حل اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ہمیشہ متحرک رہے۔ ان کی وفات کو صحافتی اور سماجی دنیا کا ایک بڑا نقصان قرار دیا جارہا ہے۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز عصر آرام پارک کی نوراللہ مسجد میں ادا کی گئی، جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ بعد ازاں انھیں کھوریجی قبرستان میں سپردِ خاک کردیا گیا، جہاں سیکڑوں سوگواروں نے آخری دیدار اور تدفین میں شرکت کی۔ ڈاکٹر مشتاق انصاری نے اپنے پسماندگان میں والدین اہلیہ، ایک بیٹا بلال انصاری اور دو بیٹیوں کو سوگوار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 جون 2026

خراج عقیدت

اب ایسے لوگ نہیں ملنے والے

کلکتہ: مسلم انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شام کمپیوٹر روم میں جیلانی بانو (پ: 14 جولائی 1936، و: کیم مارچ 2026)، شہیرہ مسرور (پ: کیم جنوری 1958، و: 15 مارچ 2026)، حشمت کمال پاشا (پ: 2 نومبر 1945، وفات: 22 اپریل 2026)، نیر اعظمی (پ: کیم نومبر 1954، و: 25 مئی 2026) اور بشیر بدر (پ: 15 فروری 1935، و: 28 مئی 2026) کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ادارے کے سکریٹری نعیم انیس نے کہا کہ کیم مارچ سے 28 مئی 2026 کے درمیان ہمارے درمیان سے 5 فنکار رخصت ہوگئے۔ اس لیے انھیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ دکن کے پس منظر میں جیلانی بانو نے اہم ناول لکھے، انھوں نے عورتوں کی آواز کو بلند کیا اور مظلوم خواتین کا ساتھ دیا۔ ان کے ناول میں دکن کا ماحول، تہذیب اور خامیاں نمایاں ہیں۔ شہیرہ مسرور کلکتہ کی باصلاحیت افسانہ نگار تھیں۔ حشمت کمال پاشا کا نام بچوں کے ادب کے حوالے سے گرانقدر اضافہ ہے۔ نیر اعظمی اکثر مسلم انسٹی ٹیوٹ کی ادبی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ بشیر بدر مسلم انسٹی ٹیوٹ کے مشاعروں میں آتے تھے۔ ان کی موجودگی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ ان میں حد درجہ خاکساری اور انکساری تھی۔ ارشاد آرزو نے کہا کہ بنگال والے بہت بے حس ہیں۔ وہ صرف اپنی ذات کے لیے ہی وقت نکالتے ہیں۔ یہاں کے فنکار بنگال کی سرحد سے دور ہوتے تو انھیں پلکوں پر بٹھایا جاتا۔ ایسے لوگ جو رخصت ہوئے ہیں وہ اب نہیں ملیں گے۔ اکثر شعرا وفات کے بعد پہچانے گئے لیکن جنھیں زندگی میں ہی پہچانا گیا ان کا نام بشیر بدر ہے۔ ادب کے ان کوہ نور کو یاد کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ادب زندہ ہے۔ رات کتنی ہی اندھیری کیوں نا ہو، جگنو کے چمکنے سے راستے کا پتہ چل جاتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد اقبال نے حشمت کمال پاشا کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے ادب اطفال کے حوالے سے خود کو وقف کردیا تھا۔ شہیرہ مسرور کے حوالے سے اشرف احمد جعفری نے کہا کہ ان کے گھر والوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اس لیے وہ ہیسٹنگز چھوڑ کر مہیش تلہ میں جابسی تھیں تاکہ وہ ادبی کام بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ نجیب کمال پاشا نے حشمت کمال پاشا پر ایک مضمون پڑھا۔ اقبال نے نیر اعظمی کے حوالے سے اپنی باتیں رکھیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتا، 18 جون 2026

نارنگ ساقی

نئی دہلی: غالب اکیڈمی میں معروف شاعر، ادیب اور محقق کے ایل نارنگ ساقی کی یاد میں ماہانہ شعری نشست منعقد ہوئی۔

نشست کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے۔ انھوں نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ نارنگ ساقی کی رحلت اردو ادب کا بڑا نقصان ہے۔ انھوں نے کہا کہ چند برس قبل نارنگ ساقی کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا جس کے بعد وہ تنہائی کا شکار ہوگئے، تاہم انھوں نے خود کو تصنیف و تالیف اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے ادبی سرمایے کی اشاعت کے کام میں مصروف رکھا۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ جس طرح مولانا الطاف حسین حالی نے غالب کو زندہ رکھا، اسی طرح نارنگ ساقی نے کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور فن کو نئی نسلوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

انھوں نے کہا کہ ہمیں نارنگ ساقی کی شخصیت کا جشن منانا چاہیے۔ جب جب اردو کا ذکر ہوگا نارنگ ساقی کا ذکر ہوتا رہے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے اور نارنگ ساقی نے پنجابی اور انگریزی کی بجائے اردو کو اپنی شناخت بنایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر جی آر کنول، ظفر مرادآبادی، متین امروہوی، سیفی وغیرہ نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جون 2026

گوپال داس نیرج، بیکل اتساہی، بشیر بدر

نئی دہلی/ دہرہ دون: قلم سادھنا فاؤنڈیشن کی جانب سے 'انترا' (میکس) کے تعاون سے معروف شاعر پدم وبھوشن گوپال داس نیرج، پدم شری بیکل

اتساہی اور پدم شری ڈاکٹر بشیر بدر کی یاد میں انترا آڈیٹوریم میں ایک کوی سمیلن و مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

تقریب میں اتراکھنڈ کے اکاؤنٹنٹ جنرل محمد پرویز عالم (آئی اے ایس) نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اپنی تقریر میں محمد پرویز عالم نے کہا کہ ادبی تقریبات سماج کو نئی سمت دینے اور نئی نسل کو اپنی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری ملی جلی گنگا جمنی تہذیب پوری دنیا میں منفرد حیثیت رکھتی ہے، اسی لیے دنیا بھر کے لوگ ہندوستانی ثقافت، ادب اور موسیقی سے متاثر ہوتے ہیں۔ پرویز عالم نے معروف شاعر گوپال داس نیرج، بیکل اتساہی اور ڈاکٹر بشیر بدر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ تینوں شخصیات ہندوستانی ادب کا فخر اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ تقریب کی صدارت ادیب بدھی ناتھ مشرا نے کی، جب کہ اتر پردیش کی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج اور شاعرہ مینا خان مہمان خصوصی تھیں۔ مینا خان نے اپنی تقریر میں کہا کہ شاعری دلوں کو جوڑنے کا ایک موثر ذریعہ ہے اور یہ احساسات و جذبات کی ایسی دنیا ہے جہاں ذات، مذہب، طبقے اور عہدے کی تفریق ختم ہوجاتی ہے اور صرف انسانیت ہی سب سے بلند مقام پر ہوتی ہے۔ پروگرام کی نظامت اتراکھنڈ گوروسمان یافتہ، سابق ریاستی وزیر اور شاعر افضل منگلوری نے انجام دی۔ اس موقعے پر میکوے انڈیا اور نیوٹیک دبئی کے چیئرمین مشرف علی خان اور انترا کے ڈائرکٹر وبھو دوبے نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کوی سمیلن و مشاعرے میں مینا خان (دہلی)، میکش اعظمی (اعظم گڑھ)، ڈاکٹر دیپتی دوبے (کانپور)، ڈاکٹر منوج آریہ (کاشی پور)، شلیش گوتم (الہ آباد)، اسلم کھتولوی، مہیش شریواستو (بستی)، جادے کمار مصور، جگدیش پرکاش، ششانک پربھاکر، شریف، مونیکا اروڑا منتظمہ، سنور علی خان اور مکیش اروڑا نے اپنا کلام پیش کیا اور سامعین سے داد حاصل کی۔ پروگرام کے اختتام پر وکاس وششٹ نے تمام مہمانوں، شعرا، ادبا، اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جون 2026

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................... بتاریخ.. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

سکینۃ الاولیا

تالیف: محمد داراشکوہ

مترجم: علیم اشرف خاں

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 255، قیمت: 185 روپے

بحریات

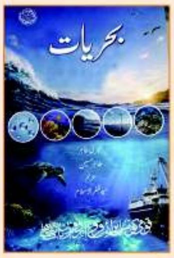

مصنّفین: میری طاہر، طاہر حسین

مترجم: سید ظفر الاسلام

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 486 قیمت: 315 روپے

امیر خسرو: ایک ہمہ جہت شخصیت

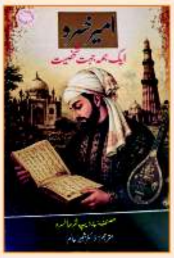

مصنف: پردیپ شرما خسرو

مترجم: ڈاکٹر شبیر عالم

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 344، قیمت: 235 روپے

عملی روحانیت

مصنف: سوامی اگنی ویش

مترجم: نریش ندیم

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 88، قیمت: 100 روپے

آؤ جانوروں سے ملیں

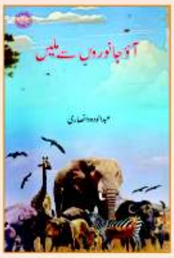

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 131

قیمت: 190 روپے

عصری لغت

روپ نرائن باتھم

مترجم: محمد سجاد عثمانی

صفحات: 606، قیمت: 685 روپے

پہلی اشاعت: 2026

کلیاتِ سودا (جلد اوّل)

مصنف: محمد حسن

تیسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 564

قیمت: 360 روپے

اردو تدریسی قواعد

مصنف: علی رفاد فتیحی

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 484

قیمت: 305 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अगस्त–2026,वर्ष:28, अंक:08
URDU DUNIYA Monthly, August-2026, Vol.28, Issue:08
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/07/2026
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025